[illegible] [illegible] یاسین

سی پارۂ دل

یعنی

مجموعۂ مضامین حضرت خواجہ حسن نظامی

جولائی سنہ ۱۹۲۹ء میں پانچویں بار

کارکن حلقہ مشائخ بک ڈپو دہلی

نے

صرف ٹائیٹل

دلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

حضرت خواجہ حسن نظامی کی کتابوں کی فہرست

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
میلاد نامہ	عہ	اعمال حزب البحر	۱۰ر	غزنوی جہاد	۸ر
محرم نامہ	عہ	لاہور کی آپ بیتی	۲ر	مسلمان بچوں کے دس سبق	۳ر
یزید نامہ	۸ر	خدائی انکم ٹیکس	۱۰ر	ہندو مذہب کی معلومات	۸ر
طمانچہ بر رخسار یزید	عہ	شیطان کا طوطا	۴ر	حلال خور	[illegible]
دکن کی اسلامی تاریخ	۸ر	قبروں کے غیبی فرشتے	۴ر	داعی اسلام	۳ر
کرشن بیتی	عہ	کرموت	عہ	اسلامی توحید	۴ر
بیگمات کے آنسو	۱۲ر	مرگ نامہ	۶ر	اسلامی رسول	۳ر
انگریزوں کی بپتا	۸ر	اسلام کا انجام	۶ر	جان باز مسلم	۳ر
محاصرہ دہلی کے خطوط	۴ر	سی پارۂ دل	۵ر	تاکید نماز	۲ر
بہادر شاہ کا مقدمہ	۴ر	سفرنامہ مصر و فلسطین و شام	۴ر	اسلام کیونکر پھیلا	۳ر
گرفتار شدہ خطوط	عہ	سفرنامہ ہندوستان	۱۲ر	ہندو کی نعت	۴ر
غدر دہلی کے اخبار	۴ر	لڑائی کا گھر	۶ر	حلوائی کی تعلیم	۸ر
غالب کا روزنامچہ غدر	۱۲ر	تسکین احساس	۶ر	پنواڑی کی دوکان	۳ر
دہلی کی جانکنی	۴ر	فلسفۂ شہادت	۱ر	تعلیم خدمتگاری	۴ر
دہلی کا آخری سانس	۱۲ر	فرام قبلہ و شملہ	۲ر	محمدؐ کی سرکار	۴ر
غدر دہلی کی صبح شام	۱۲ر	مفلسی کا مجرب علاج	۴ر	اولاد کے کان میں بجنے کی باتیں	۸ر
بیوی کی تعلیم	۱۲ر	سیر دہلی کی معلومات	۱۲ر	شاہی جہاد	۱۲ر
بیوی کی تربیت	عہ	حق پرستوں پر ستم	۲ر	اورنگزیب کی حکومت کی اصلی تصویر	۱۲ر
اولاد کی شادی	عہ	دل کی عیدیاں	۵ر	نادان وہابی	۱ر
بچوں کی کہانیاں باتصویر	۱۰ر	روپیہ عالم سکرات میں	۱ر	تبلیغی مرثیے	۱ر
جگ بیتی کہانیاں	۸ر	چکنی اور دست پناہ	۱ر	تذکرہ جناب بابا نانک صاحب	۱۲ر
اتالیق خطوط نویسی	۱۲ر	حجاج کو نامہ	۳ر	شراب خوری اور جوئے بازی کی مخالفت	۴ر
رسول کی عیدی	۳ر	پڑوس کے ستر پاجی	۴ر	رنڈی اور گداگری اور طلاق مخرجات	۴ر
آسان قاعدہ	۸ر	اردو سکھانے کے مضامین	۶ر	نمازوں کا بیان	۳ر
تعلیم القرآن	۸ر	نئے دور کا اسلام	۱ر	معجزات قرآنی	۶ر
اردو سبق	۸ر	تین شہید	۳ر	قرآن مجید کے پارہ موتی	۸ر
[illegible] بیتی حسن نظامی	عہ	چہار درویشوں کا تذکرہ	۳ر	قرآن مجید کے روحانی فوائد	۴ر

حلقہ مشائخ بک ڈپو دہلی

پہلی منزل

عبد و معبود کے راز و نیاز

مستِ الست کی دُعا

(از رسالہ نظام المشائخ دہلی جولائی ۱۹۰۹ء)

بجلی میں چمکنے والے۔ چاند میں جھلکنے والے۔ رات کے اندھیرے۔ سورج کی روشنی۔ آسمان کی بلندی۔ دریا کی روانی۔ جنگل کی سنسانی۔ دستگیری و دلداری کے مالک! عرش اقامت میں جُدا۔ دل کے گھرانے میں خُدا۔ ہم تیرے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ اگر تو عرش پر ہے ہم کو سر بلند کر۔ فرش میں ہے تو وسعت و ثابت قدمی عنایت فرما۔ دل میں ٹھکانا ہو تو اسکو اپنے رہنے کے قابل بنادے۔ رگِ جان میں ہو تو خون میں اپنی شان اور آن بان کا جوش پیدا کر۔ اگر تو ہر جگہ ہے تو ہم کو بھی ہر جگہ پہونچا۔

تو عالم ہے۔ اپنے علم کا حصہ ہم کو بھی دے۔ رزاق ہے۔ ہمارے ہاتھوں سے رزق بانٹ۔ رحمٰن ہے۔ رحمت نازل فرما۔ قہر و جبر کی تلوار ہمارے دشمنوں کے ہاتھ میں نہ دے۔ خیر کو وسعت دیکر شر سے بچا۔ ہماری آنکھ بن۔ تجھ سے دیکھیں۔ کان بن تجھ سے سُنیں۔ زبان میں تو ہی بول۔ ہاتھ سے تو ہی کام کر۔ تو بعید ہے تو قریب آجا۔ قریب ہے تو اقرب ہوجا۔ اقرب ہے تو "نَحْنُ اَقْرَبُ" کا حجاب بھی اُٹھادے۔ پھر ہم اور تو کا لفظ بھی

فنا ہو جائے۔ اور فنا کو بھی ایسی فنا ہو کہ ازل سے ابد۔ عدم سے نمود۔ نمود سے عدم۔ جہاں تلاش کریں اُس کا وجود بصارت و بصیرت کو نظر آئے اے حمد و ستائش کے قابل خدا۔ تو خود آ۔ تاکہ ہم تیری تعریف کریں۔ تیری تعریف اور تیرے رنگ برنگ کے ناموں کی تعریف۔ تیرے اچھے برے کاموں کی تعریف۔ اوگاڈ! یورپ کے منکروں کا انکار اقرار سے بدل دے۔ ان کے پیاسے دل کو روحانی تسلی کی ایک تاگر وہ بھی تبسر نلنٌ عنایت فرما ۔

ہے پربھو پرشوتم پرم آتما! اگر تو نرگن ہے ہم کو سگن بنادے۔ نراکار ہے تو ہماری سو ہرم شکلیں بھی مٹا دے سگن بن جا۔ ساکار ہو جا اور اپنی پریم شکتی کو دنیا میں پرگھٹ کر۔ ہم کس سے فریاد کریں۔ تیرے سوا کس کو دیکھیں۔ اے مکہ کے سیاہ پوش مکان پر نظر خاص رکھنے والے اے صلیب کی صورت کو عزت دینے والے۔ اے ہر دوار کے دوارے رہنے والے۔ تجھ کو ہم یقین دلاتے ہیں کہ تو ہی ہے اور کوئی نہیں تو نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اور جو کچھ ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ تو ہی تو ہے اور بس۔ تو دیکھتا ہے مگر ہم بھی دکھانا چاہتے ہیں۔ تو سنتا ہے مگر ہم بھی سنانا چاہتے ہیں۔ سن اور دیکھ امیدیں ڈوب رہی ہیں۔ ارمان جل رہے ہیں۔ ماتم برپا ہے۔ فوجوں کا شور مچ رہا ہے ۔

یہ ملک ہندوستان۔ اس کو تیری امان۔ فساد و خونریزی۔ قحط و بیماری۔ کاہلی و بیکاری۔ سب آفتوں سے جو زمین کی ہوں یا آسمان کی۔ مشرق کی ہوں یا مغرب کی دین کی ہوں یا دنیا کی۔ حفاظت دے۔ حفاظت دے ۔

مسلمان بے یار و مددگار مسلمان۔ غریب و لاچار مسلمان۔ کسی زمانہ کے تاجدار مسلمان تو جاگ کے سوتے ہیں۔ بھور کے بیدار ہوتے ہیں۔ وہ جو ٹھکرائے جاتے ہیں۔ جن پر رونے والے بھی ہنستے ہیں۔ خدا ہی تیرے پیارے محمد صلعم (ہم اس نام پر فدا ہو جائیں) کے پیارے مسلمان آج زمین و آسمان میں ان کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ نرم قالینوں کے بدلے خاک کے

بچھونے پر پڑے ہیں۔ مگر اب بھی گردش کو چین نہیں۔ وہ اس سے بھی گئے گزرے ذلت کے گڑھے میں ڈالنا چاہتی ہے۔ تو ان کی حمایت کر۔ صدقہ مدینے کی گلیوں کا صدقہ اُس خاک کے ذروں کا جو تیرے رسول م کے قدموں سے پامال ہوئی ۔

اے مشکلوں کے حل کرنے والے۔ اپنے دیوانے مستانے صوفیوں کو اپنے اشارۂ چشم سے آمادہ کر کہ وہ اپنے بیکس و بے بس مسلمانوں کی دستگیری کو کھڑے ہو جائیں۔ پہلے ان کے سلسلوں کو اکٹھا کر تا کہ ان کی قوت مجتمع ہو۔ اور وہ ظاہری مرحلے بھی اسی اجتماع سے طے کریں۔ جس طرح باطن کے مقامات اجتماع حواس خیالات سے ہوتے ہیں ۔

الٰہی حلقہ نظام المشائخ اور رسالہ نظام المشائخ کو گروہ مشائخ کا سچا پکا مخلص خادم بنا۔ اور اس کے فرائض کو بچنگی سے پورا کرنے کی توفیق عنایت فرما۔ آج جس میدان میں یہ قدم ہم نے رکھا ہے اس کو ایسا بنا دے کہ ہم اور قدم بھی وہاں اٹھا سکیں اور منزل پر پہنچ جائیں۔ آمین۔ ثم آمین۔ اور پھر آمین ۔

آہ! یہ خط

مدت کے بعد خط آیا۔ تسلی بھی۔ تسکین بھی خشم و عتاب بھی۔ زخموں پر مرہم رکھ دیا۔ اور وہاں نمک پاشی بھی کی ۔

خط! اچھے اچھے حرفوں والے۔ پیارے پیارے مطلب والے۔ آ۔ بہت دن دکھائی تجھ کو پہلے آنکھوں سے لگاؤں۔ کلیجے پر رکھوں۔ اور دل پر بھی۔ جو پھڑکتا ہے اور تجھ کو مانگتا ہے۔ تو کس کا نامہ ہے تجھ میں کیا لکھا ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۔

قاصد پر نثار۔ کیا ہی اچھا پیام لایا۔ ہاں تو یہ تاکید کردی ہے کہ میرے مکتوب کا ادب کیا جائے۔ ناپاک ہاتھ نہ لگیں۔ دل و جان سے منظور۔ پیارے پیارے کا خط ہے بھلا اس کی بے ادبی ہو سکتی ہے ۔

لکھا ہے یہ خط ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ ہاں ہاں کچھ شک نہیں۔ بلاشبہ یہ آپکا نامہ ہے۔ آپ بھی سچے اور آپ کا مکتوب بھی۔ اور وہ قاصد بھی جو پیام لایا +

آپ کی یاد میں آپ کے انتظار میں۔ از خود رفتہ دیکھ کر اکثر لوگوں نے فرضی خطوط بنائے۔ اور کہا یہ ان کا ہے جنھیں تم یاد کرتے ہو۔ مگر تسلی نہ ہوتی تھی۔ یقین نہ آتا تھا شاید آپ کو بھی اغیار کی کارستانیوں کی خبر پہونچ گئی۔ جو لکھا کہ اس خط میں شک نہ کرنا۔ نہیں جناب یہ تاثیر یہ بجلی یہ کشش۔ اوروں میں کہاں تھی۔ دل یقین کے ساتھ بڑھوں گا آنکھیں ترس گئی ہیں۔ پتلیاں سیر نہیں ہوتیں۔ اور کہتی ہیں خط! ہم تیری یاد میں روتے تھے پلکیں آنسوؤں سے بھگوتے تھے۔ تو اب آیا۔ بتا دے کیا لایا؟ تو ہمارے پیارے کا پیارا خط ہے۔ قاصد نے تیرا نام **قرآن** بتایا ہے۔ دل یہ کہتا ہے کہ تو قرة العین ہے۔ اب تیرے بھیجنے والے سے مخاطب ہوتا ہوں۔ بندہ نواز! آپنے جو یہ تحریر فرمایا کہ ہم اپنی امانت آسمان۔ زمین اور پہاڑوں کے پاس رکھنی چاہی تھی۔ مگر سب نے انکار کیا۔ اور اس بھاری بوجھ کی ذمہ داری سے ڈر گئے۔ اور تو نے اس بار کو اٹھا لیا۔ میں اس لکھنے سے بہت شکر گزار ہوا۔ اس تحریر سے آپ نے میری قدر بڑھائی۔ اور ہمجنسوں میں ممتاز کیا لیکن یہ محض ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس نازک امتحان میں پورا اُترتا +

یہ چھیڑ خوانی کا فقرہ خوب فرمایا کہ تو بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے۔ ہاں جناب جو مرضی میں آئے ارشاد کیجئے۔ آپ کے دلدادہ ہیں۔ سب کچھ سُننا پڑے گا +

نوکدار نشتروں کی امانت بھی دل و جگر میں رکھیں۔ اور پھر آپ کی نرم گرم باتیں بھی سُنیں ہم جاہل سہی۔ ظالم سہی۔ ناعاقبت اندیش سہی۔ پر یہ تو دیکھئے کہ جان پر کھیل گئے اور آپ کی فرمائش کو نہ ٹالا۔ اتنے بڑے ڈیل ڈول کے آسمان۔ ایسی چوڑی چکلی زمین اور بھاری بھرکم پہاڑوں نے جس بات سے مُنہ چھپایا۔ اور حیلہ حوالہ کرنے لگے۔ اس کا برداشت کرنا۔ ایک مشت خاک سے کیونکر ممکن تھا۔ مگر محض آپ کی رضامندی کی خاطر۔ اس ہولناک

منزل میں قدم رکھ دیا۔ آپ کو خبر بھی ہے؟ آپ کی امانت کے سبب ہم پر کیا گزرتی ہے آپ کی چاہت کا دم بھرنے والے میاں شیطان رات دن چوری کی فکر میں ہیں ہر وقت وہ اور ان کے یار غار خانۂ دل کے گرد منڈلایا کرتے ہیں کہ موقع بنے تو وار کر جائیں۔ اور ہم کو آپ کے سامنے خائن ثابت کرکے شرمندہ کریں +

اس بیرونی طوفان کی حفاظت کے علاوہ ذرا اندرونی مشکلات کا حال بھی سنیئے آپ کی امانت ہے تو بالکل سربستہ اور سربمہر۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے؟ اور اس میں کیا ہے۔ لیکن عجب طلسماتی پڑیہ ہے۔ جہاں رکھی جائے۔ وہیں ایک طرح کا سوز بے کلی اور اضطراب پیدا کر دیتی ہے۔ انجمن ہوتی ہے شہر میں جی گھبراتا ہے جنگل ویرانے میں نکل جانے کو طبیعت چاہتی ہے۔ دنیا کی شان و شوکت زیب و زینت۔ عیش و راحت سب ہیچ نظر آتے ہیں۔ آنکھیں سونا کم کر دیتی ہیں۔ زبان اپنا مزا بھول جاتی ہے۔ بات چیت میں بھی زیادہ چلنا پسند نہیں کرتی۔ پیٹ من بھاتی غذائیں نہیں مانگتا جو دے وہ لے لیتا ہے اور وہ بھی بار بار نہیں کئی کئی وقت کے بعد اپنے بیگانے۔ غیر اور بیگانے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود اپنا تن و من بے حقیقت و بے کار نظر آنے لگتا ہے۔ تو جناب امانت کیا ہے۔ ایک بلائے بے درماں ہے۔ تاہم ع ہر چہ از دوست می رسد نیکوست +

سبحان اللہ۔ آپ کی تحریر کے آن بان کے قربان۔ نوازش کا اظہار ہوتا ہے قہر و غضب کی شان کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے۔ وعدۂ وصل سے ڈھارس بندھائی جاتی ہے۔ تو فرقت و جدائی کی دھمکی بھی ساتھ ملتی ہے۔ جناب! کون کہتا ہے کہ آپ رحیم نہیں۔ کریم نہیں۔ دلنوازی نہیں کرتے۔ چارہ سازی نہیں فرماتے۔ آپ کی ذات سے اس سے بڑھ بڑھ کر امیدیں ہیں۔ لیکن ان دھمکیوں سے کیا حاصل۔ ہم پہلے ہی ڈرتے ہیں اور حضرت کی بے نیازی اور کبریائی سے خوف کھاتے ہیں +

اس خط میں سرکار نے سب کچھ تو لکھا ہے مگر یہ نہ بتلایا کہ اب آپ کا دیدار کس دن

میسر آئے گا۔ اس وعدے سے اطمینان نہیں ہوتا کہ عنقریب ہم تم سے ملیں گے۔ وقت بتائیے۔ منٹ اور ساعت مقرر کیجئے۔ اور ملاقات کے پروگرام سے آگاہی بخشئے۔ ایسی گول مول بات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رہا سہا اطمینان بھی جاتا رہے گا۔ اور ہر وقت انتظار کا سامنا ہوگا جو موت سے زیادہ سخت چیز ہے۔ ؎

برافگن پردہ از رُخ بے محابا   بکے کن وعدہ امروز فردا

آ

(از نظام المشائخ۔ اکتوبر ۱۹۱۰ء)

خوشی بنکر آ غم میں سماکر آ مگر آ عید کے چاند میں آ محرم کے ہلال میں نظر آ چمک میں جھلک تاریکی میں لہریں لے۔ کڑک سے دل ہلا۔ لیکن اے آنے کے قابل آ۔

رمضان کے سناٹے میں آیا۔ تراویح کے قرآن کی خوش لحنی میں جلوہ دکھایا۔ افطاری کے وقت تیری مزیدار آہٹ سنائی دی اب بھی آ جس طرح چاہے آ۔ لیکن آ۔

کہتے ہیں تو ہر چیز میں آسکتا ہے۔ ہر حال میں تیری آمد کا امکان ہے۔ تیرے آنے میں دیر نہیں لگتی۔ تجھ کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ آکے بغیر جو آجائے۔ بلاحرکت متحرک ہو۔ وہ تو ہے۔ تو بس اسی طلسماتی۔ غیر مفہوم چال سے آجا۔ دیکھ آجا۔ سن آجا۔ سمجھ آجا۔

ہم کو وہ دیدار دے جو دیدۂ دیدار طلب کے شایان ہو۔ موسیٰ کو بے ہوش کرنے والا۔ طور کو خاک سیاہ بنانے والا نہیں۔

ہلالِ عید

آسمان کے کونے میں منہ نکالے ہم کو دیکھ رہا ہے۔ ہم اسکو دیکھ رہے ہیں۔ یہ وہی پارۂ نور ہے جو ہر ماہ کے ختم پر چھپکر نکلتا ہے۔ مگر کبھی آج کی سی خوشی۔ امنگ کیفیت پیدا

نہیں ہوئی۔ یہ کیوں ہے؟ کیا تو اس کے پردہ میں اپنی ابرو دکھا رہا ہے۔ ہاں تو ہی ہوگا نہیں۔ تو ہی ہے۔

ایسے عالم بے شمار ہیں۔ ایسے فلک لاتعداد ہیں۔ چاند بھی بہت سے ہوں گے اور دیکھنے والے بھی۔ پھر تو کہاں کہاں چشم نوازیاں کرنے جائے گا آ تجھے اپنی آنکھ میں چرا کر۔ چھپا کر رکھ لیں۔ اپنے لئے اور اپنے بے قرار دل کے لئے بڑی سیر ہوگی تو ذرا ہم میں چھپ کے تو دیکھ۔ لوگ تجھے ڈھونڈھتے پھریں گے۔ عرش و کرسی پریشان ہوں گے۔ فرشتوں کو تلاش ہوگی۔ دوسری دنیا کے باشندے عید کی بہار چھوڑ کر تیری جستجو کی سرگردانی میں پھنس جائیں گے۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہماری آنکھ کا خانہ چھوٹا ہے۔ اس میں تیری گنجائش نہ نکلے گی۔ نہیں دریا حباب میں آسکتا ہے۔ انجن کی وہ بھاپ جو ریل کی لمبی قطار کو کھینچ کرلے جاتی ہے اور خود انجن کی حرکت اس کے دم سے ہے۔ کہاں رہتی ہے؟ انجن کے ایک چھوٹے سے ظرف میں۔

اچھا یوں نہیں تو پھول کی خوشبو کی طرح دل کے گل میں سما جا۔ یہ دل مطالبہ قبول کر۔

چاندرات

چاند تو چھپ گیا مگر چاندرات موجود ہے۔ ہر طرف اندھیرا۔ اور وہی رات جو روز آیا کرتی ہے۔ پھر یہ چہل پہل۔ گہما گہمی کیسی؟ ہو نہو یہاں بھی تیرے گیسوؤں کی شرکت ہے۔ بیشک۔ یہی بات ہے۔ قسم لے۔ وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ۔

صبحِ عید

آنکھ کھلنے سے پہلے۔ سورج نکلنے کے اول افکار کو شکست ہوئی اسرار نے سرور کے کپڑے پہن لیے۔ اور شتابی کا جشن تیار ہوگیا۔ عید گاہ میں چھوٹے بڑے اچھے

ہوئے۔ سب تیرے لئے جمع ہوئے ہیں۔ کھڑے ہو کر انتظار کرتے ہیں۔ جھک کر دیکھتے ہیں۔ اور عاجز ہو کر سر خاک پر رکھ دیتے ہیں۔ اب تو آ جا اور گلے مل جا ۔

سنا تھا کہ تو دلوں میں رہتا ہے۔ اس لئے ہر شخص سینے سے سینہ ملا کر معانقہ کرتا ہے کہ شاید کسی دل میں تو مل جائے۔ مگر تو کیوں حجاب کرتا ہے اور ملنے سے گریز کرتا ہے آج کے دن بھی نہ ملا تو کب ملیگا ۔

دیکھ آ۔ اب صبر نہیں ہو سکتا۔ دامن قرار ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ تو نے کہا تھا اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ مجھ سے مانگو۔ قبول کروں گا۔ سو تجھ ہی سے مانگتے ہیں اور تجھ ہی کو مانگتے ہیں ۔

وعدہ پورا کر اور آ۔ یہ عید ہے۔ وعید کا خیال چھوڑ دے۔ اگر آج تو من جائے تو ہماری عید ہی من جائے گی ۔

دعائے بیقراری

اور

دل آشفتہ کی بکا وزاری

رمضان المبارک سنہ ۱۳۳۰ ہجری کی اکیسویں تاریخ کو منزل گاہ حلقۂ المشائخ میں امیر المؤمنین مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ کا سالانہ عرس تھا۔ یہ دعا چند گرم فقرول کے اضافہ کے ساتھ اسی موقع پر خواجہ صاحب مدظلہ نے پڑھی تھی :۔

الٰہی تجھ سے کیونکر مانگیں۔ دل کو قرار نہیں۔ طبیعت کو یکسوئی نہیں۔ زبان میں گویائی نہیں۔ پہلے قرار دے۔ اطمینان عطا فرما۔ بولنے اور مانگنے کی طاقت مرحمت کر تاکہ سینہ سانس کی خیر

آس کی خیر۔ اور اُس کی خیر جس کی دم شماری کا وقت آ گیا۔ دل کی حرکت بند ہو جائے تو انسانی مشین رُک جائے۔ مگر ایسی حرکت سے بچا جو درجۂ اختلاج کو پہونچ گئی ہے۔ جب دل ذرا صحت پر آئیگا تو پکاریں گے اَللّٰھُمَّ یَا رَبَّنَا۔ اے پروردگار۔ اِدھر جگہ حاضر ہوا آج کی رات کا صدقہ۔ ہماری دعا کو سُن۔ یہ وہ شب ہے جس میں تیرے شیر۔ تیری تیغ۔ اور تیرے کلمہ۔ علی مرتضیٰؑ کی یادگاری کا سالانہ جلسہ منانے کے لئے ہم لوگ جمع ہوئے ہیں۔

برادر رسولؐ۔ زوج بتولؑ۔ پدر فرزندانِ ملول۔ رموز و اسرار کے خزانہ پوش عیب کاروں کے پردہ دار۔ حیدر کرار۔ شہسوار کارزار۔ اَنَا و اَنْتَ مِنْ ... تجھ پر سلام۔ اور اس برکت والی روح پر سلام جس کے وسیلے سے دنیا کی اس شب تار میں خدائے برتر سے دل و جان کا اُجالا مانگا جاتا ہے ۔

اللہ میاں! تم دیکھتے ہو۔ بجلیوں کی روشنیوں سے آنکھوں پر۔ انجن کی چیخوں اور توپ کی گرجوں سے کانوں پر۔ الحادی فلسفہ کی دلیلوں سے عقل و حواس پر حملے ہوئے ہیں نورِ علوی کو ظاہر کر۔ تاکہ برقی رو ماندہ ہو۔ حیدری نعرے کو بلندی دے جس سے عارضی آوازیں پست ہوں۔ علوم ربانی کے باب کھول۔ جو عقل و حواس اپنی ہستی کو بچائیں آمین اے رب العلمین آمین۔ اے قبول کر سکنے والے! یہ کون ہے جو پوچھتا ہے کہ علی مرتضیٰ کی روح یہاں کہاں؟ جس پر سلام بھیجتے ہو۔ بے تار کے برقی اشارات کی طاقت کو نہیں دیکھا۔ اس آلہ سے بڑھ کر ہم کو ہنر یاد ہے۔ ہم جو چاہیں کہیں اور اُن کو سنائیں۔

اے بیکسوں اور لاچاروں کی پناہ! ہماری مرادوں کو پورا کرنے والے ہم کو اپنے در کے سوا اور کسی کے آگے نہ جھکا۔ معاش کی طلب میں در در کی ٹھوکریں نہ کھانے دے اپنے غیب کے خزانے سے رزق عنایت کر۔ بے اولادوں کو ایسے فرزند مرحمت فرما جو دین اسلام کے سپوت ہوں۔

خداوندا! اہل دہلی۔ حاضرین مجلس۔ اور حلقۂ نظام المشائخ کے تمام ممبران کی دلی

ہوئے۔ سب تیرے لیئے جمع ہوئے ہیں۔ کھڑے ہوکر انتظار کرتے ہیں۔ جھک کر دیکھتے ہیں۔ اور عاجز ہوکر سر خاک پر رکھ دیتے ہیں۔ اب تو آجا اور گلے مل جا۔

سنا تھا کہ تو دلوں میں رہتا ہے۔ اس لیئے ہر شخص سینے سے سینہ ملاکر معانقہ کرتا ہے کہ شاید کسی دل میں تو مل جائے۔ مگر تو کیوں حجاب کرتا ہے اور ملنے سے گریز کرتا ہے آج کے دن بھی نہ ملا تو کب ملیگا۔

دیکھ آ۔ اب صبر نہیں ہوسکتا۔ دامن قرار ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ تو نے کہا تھا اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ مجھ سے مانگو۔ قبول کروں گا۔ سو تجھ ہی سے مانگتے ہیں اور تجھ ہی کو مانگتے ہیں۔

وعدہ پورا کر اور آ۔ یہ عید ہے۔ وعید کا خیال چھوڑ دے۔ اگر آج تو من جائے تو ہماری عید ہی من جائے گی۔

دعائے بیقراری

اور

دل آشفتہ کی بکا وزاری

رمضان المبارک سنہ ۱۳۳۳ ہجری کی اکیسویں تاریخ کو منزل گاہ حلقۂ المشائخ میں امیر المؤمنین مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ کا سالانہ عرس تھا۔ یہ دعا چند گرم فقروں کے اضافہ کے ساتھ اسی موقع پر خواجہ صاحب مدظلہ نے پڑھی تھی۔

الٰہی تجھ سے کیونکر مانگیں۔ دل کو قرار نہیں۔ طبیعت کو یکسوئی نہیں۔ زبان میں گویائی نہیں۔ پہلے قرار دے۔ اطمینان عطا فرما۔ بولنے اور مانگنے کی طاقت مرحمت کر تاکہ ہر سانس کی خبر

اُس کی خبر۔ اور اُس کی خبر جس کی دم شماری کا وقت آگیا۔ دل کی حرکت بند ہوجائے تو انسانی مشین رک جائے۔ مگر ایسی حرکت سے بچا جو درجۂ اختلاج کو پہونچ گئی ہے۔ جب دل ذرا صحت پر آئیگا تو پکاریں گے اَللّٰھُمَّ یَا رَبَّنَا۔ اے پروردگار۔ اور ہر جگہ حاضر! آج کی رات کا صدقہ۔ ہماری دعا کو سن۔ یہ وہ شب ہے جس میں تیرے شیر۔ تیری تیغ۔ اور تیرے کلمہ۔ علی مرتضیٰؑ کی یادگاری کا سالانہ جلسہ منانے کے لئے ہم لوگ جمع ہوئے ہیں۔

برادر رسولؐ۔ زوج بتولؑ۔ پدر فرزندان طول۔ رموز و اسرار کے خزنہ پوش عیب کاروں کے پردہ دار۔ حیدر کرار۔ شہسوار کارزار۔ اَن داتا۔ من داتا۔ تجھ پر سلام۔ اور اس برکت والی روح پر سلام جس کے وسیلے سے دنیا کی اس شب تار میں خدائے برتر سے دل و جان کا اُجالا مانگا جاتا ہے۔

اللہ میاں! تم دیکھتے ہو۔ بجلیوں کی روشنیوں سے آنکھوں پر۔ انجن کی چیخوں اور توپ کی گرجوں سے کانوں پر۔ الحادی فلسفہ کی دلیلوں سے عقل و حواس پر حملے ہوئے ہیں۔ نور علوی کو ظاہر کر۔ تاکہ برقی رو ماند ہو۔ حیدری نعرے کو بلندی دے۔ جس سے عارضی آوازیں پست ہوں۔ علوم ربانی کے باب کھول۔ جو عقل و حواس اپنی ہستی کو بچائیں۔ آمین اے رب العلمین آمین۔ اے قبول کرسکنے والے! یہ کون ہے جو پوچھتا ہے کہ علی مرتضیٰ کی روح یہاں کہاں؟ جس پر سلام بھیجتے ہو۔ بے تار کے برقی اشارات کی طاقت کو نہیں دیکھا۔ اس آلہ سے بڑھ کر ہم کو ہنر یاد ہے۔ ہم جو چاہیں کہیں اور اُن کو سنائیں۔

اے بیکسوں اور لاچاروں کی پناہ! ہماری مرادوں کو پورا کرنے والے ہم کو اپنے در کے سوا اور کسی کے آگے نہ جھکا۔ معاش کی طلب میں در در کی ٹھوکریں نہ کھانے دے اپنے غیب کے خزانے سے رزق عنایت کر۔ بے اولادوں کو ایسے فرزند مرحمت فرما جو دین اسلام کے سپوت ہوں۔

خداوندا! اہل دہلی۔ حاضرین مجلس۔ اور حلقۂ نظام المشائخ کے تمام ممبران کی دلی

مرادیں پوری کر۔ خاصکر ان کے مقاصد بر لا جنہوں نے حلقہ کے دعاخانہ میں اپنی مختلف ضروریات کے لئے دُعا کی خواستگاریاں بھیجی ہیں۔ الٰہی ان سب کے ارمان بر آئیں۔ جو اس حلقے اور دعاخانے اور اس قسم کی مجالس کے معین و مددگار ہیں۔

اور مجھ موجود بے وجود کو بھی توفیق دے کہ زمانہ کے فیشن اور نمائشی نفاق آمیز اعمال سے محفوظ رہوں۔ جو کچھ کہوں وہی کروں اور تیری رضا کی حد سے آگے نہ بڑھوں۔

بھگت کے بس میں آ بھگوان

(از اخبار توحید میرٹھ مورخہ ۱۶ اپریل سنہ ۱۹۱۳ء)

یا رحمٰن یا سبحٰن

تیری سمرن جپوں۔ آگے سیس دھروں۔ کیسے بھگتی کروں

اے بھگوان اے سبحٰن اے رحمٰن

موئے کے زمانہ کا چرواہا ہوتا۔ تجھ کو اپنے گھر بلاتا۔ پاؤں دباتا۔ سر سہلاتا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا دودھ پلاتا۔ تو سوتا تو پنکھا جھلتا۔ تو سنتا تو گانا گاتا۔ روتا۔ رلاتا۔ جاتا تو روکتا۔ پیروں پڑتا۔ ہاتھ جوڑتا۔

داتا تو کہاں ہے۔ میرے من کی بپتا کے دیکھن ہار۔ مولیٰ۔ مولیٰ۔ سُن۔ الجھنوں میں ہوں۔ گردشوں میں ہوں۔ بیقراری دیکھ۔ آہ و زاری دیکھ۔ اشکباری بھی۔ آنسو دے۔ اُن میں نہاؤں۔ سوزش دے۔ تڑپوں۔ لوٹوں۔ تجھ کو پاؤں۔ بلال رضی اللہ عنہ کا دل دیدے۔ در آستان پر سر ٹکراؤں۔ عزت تجھ سے ہے۔ ذلت تجھ سے ہے۔ میرے پربھو بھگوان۔ اپنے بھگت کے بس میں آجا۔ دے جا۔ دلا جا۔

یہ رات کیونکر کٹے۔ تو یاد آتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اپنے داس کو درشن دے روپ دکھا۔ جلوہ افروز ہو۔ آنکھ بیہوش۔ اور من منتوش ہو۔ کس کا بلقان۔ کیسا ایران تیری رحمت کا چشمہ اور اس میں اشنان۔ اسی میں ہیں دونوں جہان۔ رین اندھیری بدلی کالی۔ رستہ بھاری۔ دشمن سر پر غفلت دل میں۔ ہاتھ پکڑ کر بھگوان۔ میں قربان تجھ کو دیکھوں۔ اور نہ دیکھوں کوئی۔ سب ہوں گم۔ تو بے گر قم۔

شوکت والے۔ طاقت والے۔ توپوں اور سنگینوں والے۔ زخموں اور مرہم والے دکھ کے کرتا۔ سکھ سروپ۔ تیرے بھوکے۔ تیرے پیاسے۔ یہ ہے اچھا۔ تو ہو پاس۔ پھول بھی تو، خار بھی تیرا۔ نور بھی تو، نار بھی تیری۔ آنکھیں میری۔ سب کچھ تیرا اور زمین کے اندر ڈیرا تیرا۔ بس میں آ بھگوان۔

سر ہے حاضر۔ کھینچ کٹاری۔ عشق کی اگنی چتا ہماری۔ ست پکاریں۔ ست بجائیں۔ جزکو تیاگیں۔ کل ہو جائیں۔ یثرب پہونچیں۔ مکہ دیکھیں۔ بیچ سمندر جھنڈا گاڑیں۔ بہدی بادل گرجیں گرجیں۔ اُن کے آگے چل کر لڑیں۔ تیر چلیں سب سینوں پر۔ دشمن چھدے سنگینوں پر۔

تو ہو لیں میں۔ سب ہوں بس میں۔ حسن نظامی کس کا بندہ؟ وقت کٹھن ہے۔ انکا چھندا بھگتی اپنی من کو دے۔ بھارت سیوا سب کو دے۔ بس میں آ بھگوان۔

تیرے نام کو پرنام یا ذی العزۃ والجبروت والاکرام

تو اگر عہد وفا باندھ کے میرا ہو جائے گورے ملکوں کے اُجالوں میں اندھیرا ہو جائے

حروف کی دعا

(اخبار توحید مورخہ ۲۳ اپریل سنہ ۱۹۱۳ء)

الف تو آگے بڑھ اور بخشن کہنے والے داتا کے سامنے ہمارا وکیل بن۔ کیونکہ تو بھی

بھی ایک دیکھتا ہے۔ نقطہ دوئی سے پاک ہے۔ اور ہمارا مخاطب خدا بھی وحدہٗ لاشریک
اور غیریت سے پاکیزہ ہے۔

مولیٰ ہم حروف ہیں۔ تیرے معانی کی امانت سینوں میں رکھتے ہیں۔ تو نے ہم کو
ازل کے مخفی قلم سے پیدا کیا ہے۔ اور ہمارے اجسام کو وہ روح دی ہے کہ ظاہر میں
بے حس و حرکت و بے جان نظر آتے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ زندہ ہیں۔ اور جو ہم کو غور
سے دیکھے تو اس کو بھی زندہ کر دیتے ہیں۔

تو نے ہم کو وہ زبان دی ہے جو خاص تیری بول چال میں کام آتی ہے۔ یعنی یہ
کہ بغیر بولے اور بغیر لب ہلائے بات ادا ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے اسکا مطلب سمجھ لیتے ہیں۔
انسان روزمرہ کتابوں، اخباروں اور خطوط میں ہماری باتیں سنتا ہے۔ مطلب
سمجھتا ہے۔ مگر یہ نہیں سوچتا کہ یہ کیا بھید ہے کہ حروف منہ سے کچھ نہیں کہتے۔ لیکن جہاں
آنکھ کے سامنے آئے اور خود بخود ان کا مطلب ذہن میں آنے لگا۔ کانوں کو ان کی آواز
سنائی نہیں دی۔ مگر دل و دماغ میں ان حروف کا مطلب چلا گیا۔

خدایا ایسے آدمی پیدا کر، جو ہمارے پُراسرار وجود کا اصلی مطالعہ کریں۔ اور
ہمارے ذریعہ **تو ان کو مل جائے** اور جب تیرا ان کا وصال ہو تو اس خوشی میں
ہماری مراد بھی پوری فرما اور وہ یہ ہے کہ ہم کو نا اہل لوگوں کے قلم سے بچا۔ اپنے نافرمانوں
کے قبضے میں نہ دے۔ جو ہم کو تیرے وجود واحد کے انکار میں استعمال کریں۔

پروردگارا، ہم عربی حروف ہوں یا سنسکرت۔ انگریزی ہوں یا فارسی، چینی
ہوں یا جاپانی۔ اس لئے ہیں کہ ہم سے تیری وحدت کے مضامین لکھے جائیں۔ نہ کہ تیری
دشمنی اور مخالفت کی تحریریں ہمارے پرزوں سے تیار ہوں۔

آؤ حروف! اخبار توحید کے **قرطاس ابدی** پر صف آرا ہوں۔ عین کی توپ سے غین
پر گولہ باری کریں۔ تاکہ غیر فنا ہو جائے اور وحدت کو مقام بقا حاصل ہو۔ آمین ربنا ثم آمین۔

موسمی دعائیں

(۱)

(از اخبار توحید مورخہ ۴ ماہ اپریل سنہ ۱۹۱۳ء)

تیرے نام سے شروع۔ اے رحمت شفقت والے۔ اے آدمیوں اور سب کے پالنے والے
اے سب کے بادشاہ۔ اے سب کے معبود پراگندہ دل کے وسوسوں اور شر خناس
کے پھندوں سے محفوظ رکھ۔ جو گمراہ کرنے کے لئے بہکاتے رہتے ہیں۔

جی بے کل ہے اس کو کل دے۔ آنکھیں خشک ہیں۔ ان کو اپنی محبت کے آنسو
مرحمت فرما۔ خوش قول بنا۔ خوش عمل بنا۔ خوش وقت بنا۔ دشمن زیر ہوں۔ حاسد
خوار ہوں۔ بدخواہوں کو رسوائی ہو۔ آزار دہندے زار و نزار ہوں۔ آمین ربنا آمین۔

پاک روزی عنایت کر۔ وہ مشکلیں دور ہوں جو کسب حلال میں حارج ہیں۔ غیب کے
خزانے کھول۔ جن کے ہاتھ سے دلوانا چاہتا ہے ان کو ہمارا بنا دے۔ آمین ربنا آمین۔

عزت و آبرو مرحمت کر۔ اپنے سوا کسی کے آگے جھکنے نہ دے۔ مذہب۔ ملک
قوم۔ خاندان۔ سب کی لاج رکھ۔ ذلت و رسوائی سے بچا۔ آمین ربنا آمین۔

بے گھروں کو گھر دے۔ بے زروں کو زر دے۔ شادیاں ہوں۔ خانہ آبادیاں
ہوں۔ میاں بیویوں میں میل جول ہو۔ امن ہو۔ سُکھ ہو چین ہو۔ سب گھر بہشت بن
جائیں۔ بے اولادوں کو اولاد دے۔ نہ بجھنے والا چراغ ملے۔ ماؤں کی گودیں بھریں۔
سنسان ویرانوں میں نیک بچوں کی رونقیں ہوں۔ آمین ربنا آمین۔

بیماروں کو صحت ہو۔ بلائیں دور ہوں۔ وبائیں دور ہوں۔ آہ کے بدلے
واہ ہو۔ غم کے بستر تہ ہو جائیں۔ درد و الم کافور ہوں۔ آمین ربنا آمین۔

مقدموں میں کامیابیاں ہوں۔ حق فتح پائے۔ بےگناہوں کو قید سے رہائی ہو۔

ٹل جائے اگر نا گہانی آئی ہو۔ آمین ربنا آمین۔

(۲)

(از اخبار توحید میرٹھ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۱۳ء)

ربنا ربنا ربنا

نازمان بندوں کے معبود بیکسوں کے سہارے۔ لاچاروں کے چارہ کار پروردگار یہ ہاتھ تیرے آگے پھیلے ہیں۔ یہ کچھ امید سے دراز ہوئے ہیں۔ ان کو تجھ پر ناز ہے۔ کیونکہ تو بندہ نواز ہے۔ ان ہاتھوں کی خطا بخشی جو تیرے سوا غیروں کے دروازے پر دستک دیتے رہے۔ قصور نفس کا تھا بھٹکا کر دربدر کی ٹھوکریں کھلاتا پھرا۔ اب تیرا دروازہ مل گیا ہے۔ آستانہ کی چوکھٹ پر جھکے ہوئے شرمندہ سر کی لاج رکھ لے۔ یہ پیشانی تیرے سرکش بندے کی ہے جو عاجزی سے خاک پر پڑی ہوئی ہے۔

رحم کرنے والے خطا پوش داتا۔ ہم تیرے ہیں تو ہمارا ہے۔ تجھ سے نہ کہیں تو کس سے کہیں۔

طاعون نے، قحط نے، مفلسی نے۔ خود غرضی اور ریاکاری نے جھوٹی عزتوں کی حرص و ہوس نے۔ تیرے بندوں کو کہیں کا نہ رکھا۔ اپنی رحمت کی کمند میں اسیر کر لے۔ اپنے کرم کے حصار میں بچا لے۔

صدقہ ان گیسوؤں والے حجازی کا جس کی یاد واللیل کے پیارے لفظ میں کی جاتی ہے۔ صدقہ اس نورانی مکھڑے کا جس کو والضحیٰ کا خطاب عطا ہوا۔ اس کا طفیل جو بیقرار سمندر کے کنارے مستغرق پہاڑوں کے بیچ میں۔ یثرب کی خوش نصیب زمین پر کملی اوڑھے تیرے نام کی منادی کرنے آیا تھا۔ اس پتھر کا صدقہ جو تیری محبت میں سات دن کے بھوکے پیارے پیٹ پر باندھا گیا۔ واسطہ ان چھالوں کا جو بنت رسولؐ کے ہاتھوں میں چکی پیسنے سے پڑے۔ وسیلہ اس پیارے حلقوم کا جو کربلا کی تپتی زمین پر ستم کی چھری سے کٹ گیا۔ اور ان تلواروں کا جو تیرا نام بلند کرنے کو اٹھائی گئیں۔ ان گھوڑوں کا جو تیرے دشمنوں کی صفوں میں ہنہناتے ہوئے۔ ٹاپیں مارتے ہوئے۔ کف برساتے ہوئے گھس گئے حرم حجاز کا صدقہ۔ مدینے کے در و دیوار کا صدقہ۔ سسکیاں بھرنے والے ستون کا صدقہ اور اس پیار کا صدقہ جس سے فراق زدہ لکڑی کو تسلی دی گئی۔ اس ممبر کا صدقہ جہاں تیرا منزل تھا۔ تیرا مدثر تھا۔ اس ہرے گنبد کا صدقہ جو تیری شمع سراج منیر کا فانوس ہے۔ اُن جالیوں کا صدقہ جن کے اندر کچھ ہے۔ آہ کچھ ہے۔

فریاد ہے مولیٰ۔ دوہائی ہے مولیٰ۔ دیدے مولیٰ۔ اپنا بنا لے۔ ایک کردے۔ اور نیک کردے۔ آمین۔ اللّٰھم آمین۔ ثم آمین۔ بیماروں کو شفا۔ بے اولادوں کو اولاد۔ بے روزگاروں کو روزگار۔ بے قراروں کو قرار۔ امتحان دینے والوں کو کامیابی بخشنے والوں کو فتحیابی۔ مقروضوں کی سبکدوشی۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

(۳)

(از اخبار توحید مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۱۳ء)

غریبوں کے درد مند خدا! ہم کو خس کی ٹٹی اور تہ خانہ کی ٹھنڈک درکار نہیں ہے اپنی رحمت کی خنکی مرحمت کر۔ اور گرمی کے موسم کی بلاؤں سے بچا۔ گرم زمین کی حرارت سے ہمارے دماغ کو محفوظ رکھ۔ جس پر ہم تیری دی ہوئی روزی کمانے کے لئے اور بال بچوں کو پالنے کے واسطے دھوپ میں چلتے پھرتے ہیں۔ لُو سے۔ سرسام سے۔ اور گرمی کے کل آلام سے حفاظت دے۔

علی گڑھ کالج کی پیچیدگیاں دور ہوں۔ حاجی نواب سکرٹری دلیری و حقانیت سے کارگزاریاں دکھائے۔

ندوۃ العلماء کا انجام بخیر ہو۔ موجودہ خلفشار آسانی سے رفع ہو جائے علم دین کا بول بالا رہے۔

ہندو مسلمانوں کی تازہ کوشش اتحاد میں برکت ہو۔ دونوں کے دلوں کو خلوص عطا فرما۔ ذات کی رنجشیں اور خود غرضیاں بیچ میں نہ آنے دے۔ لارڈ ہارڈنگ کی سلامتی ہو۔ انکو توفیق دے کہ ہندوستان میں عدل و انصاف برقرار رکھیں۔ گوروں کالوں کو برابر سمجھیں اخبار ی دنیا میں اتفاق دے۔ ہر اک کو حوادث ناگہانی سے بچائے رکھ۔ اور اپنے فضل کا سایہ ڈال تاکہ وہ حقیقی صداقت سے تیرے بندوں کی خدمت کریں۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

آنسو بھری آنکھ کی التجا

(از اخبار توحید میرٹھ مورخہ ۱۰ جون ۱۹۱۳ء)

میرے مالک۔ پچھلی رات ہے۔ سب سوتے ہیں۔ تو جاگتا ہے۔ میں جاگتی ہوں۔ تو سامنے کے آسمان میں ہے۔ یا خود میرے اندر کے مکان میں ہے۔ جہاں ہے میری التجا کو سن۔ صبح کا نور چمکنے سے پہلے۔ تاروں کی روشنی چھپنے سے پیشتر۔ پرندوں کی نغمہ خوانی سے قبل میری مراد مجھ کو دے۔

یہ سامنے تیرے اجمیری پیارے کا سفید گنبد ہے اس کے کلس پر اپنا دیدار دکھلا اس کو طور بنا۔ مجھ کو موسوی بصیرت دے۔ اور تو جلوہ افروز ہو۔ آنسو کا پردہ تیار ہے اور کوئی نہ دیکھنے پائے گا۔ چپکے سے اس کے اندر آجا۔ تاکہ تجھ کو اپنی بپتا سناؤں۔ کلیجے کے زخم کھول کر دکھاؤں۔

دن بھر ان بے قراروں کی دید میں گزر گیا۔ جو اجمیری وسیلہ گاہ میں تجھکو ڈھونڈھتے پھرتے تھے۔ ایک کہتا تھا۔ الہٰی قرض کے بوجھ نے پیس ڈالا ہے۔ اپنے خواجہ کے صدقے میرے بار ہلکے کر۔ دوسرے کی فریاد تھی مولیٰ ناگہانی بلا نے گھیر لیا۔ خواجہ کے

ہاتھ سے اس آفت کو دور فرما۔ تیسرے کی فریاد تھی۔ گود خالی ہے۔ گھر بے چراغ ہے۔ اولاد کے لئے جی ترستا ہے۔ ارمان کا باغ اجاڑ ہوا جاتا ہے۔ خواجہ کے وسیلے میرا دامن بھر دے۔ چوتھا مرض جسمانی میں مبتلا تھا۔ روضۂ خواجہ سے سر ٹکراتا تھا۔ اس کی بھی تجھے آس تھی۔ اور خواجہ کے در کی ڈھارس پاس تھی۔ پانچواں رزق کا بھوکا۔ ہاتھ خالی۔ پیٹ خالی۔ خواجہ کے دروازہ پر تجھ کو پکارتا تھا۔ اور روٹی کا ٹکڑا مانگتا تھا چھٹا آتش عشق میں جلتا۔ آہ شرربار کھینچتا۔ غلاف خواجہ پر باؤ سانہ ہاتھ مارتا تھا۔ کیونکہ اس کو یہی یقین تھا کہ غلاف کے اندر تیرے پاس جانے کا راستہ ہے۔ اور تیرے پاس جاکر شربت وصل کا جام میسر آسکتا ہے۔

ساتواں کچھ اور کہتا تھا۔ دیوانہ تھا۔ مستانہ تھا۔ کائنات اور ہستی موجودات کے معمہ کو اور اس کے گورکھ دھندے کو نادانی کی انگلیوں سے سلجھا کر الجھا رہا تھا۔ اور خبر نہیں کیا بڑبڑا رہا تھا۔

اتنے نظاروں سے تھکی ماندی۔ اپنی عاجز بندی چشم اشکبار کی التجا پر رحم کر دے اور ان سب کی مرادوں کیساتھ جن کا ذکر اوپر آیا۔ میری درخواست بھی پوری فرمادے۔

جھولی والے فقیر کی بھیک

(از نظام المشائخ اگست ۱۹۱۳ء)

تو ہی جانتا ہے۔ رمضان میں کون سی رات ہزار راتوں کی برابر ہے۔ کس کو تو نے خطاب قدر عطا فرمایا ہے۔ مجھکو۔ ہزار۔ لاکھ۔ یا سو پچاس سے غرض نہیں۔ میں اس کی بھی پرواہ نہیں کرتا کہ وہ رات خطاب یافتہ ہے یا نہیں ہے۔ اس کا شوق بھی نہیں کہ نزول ملائکہ اور روحوں کی ملاقات والی شب میسر آئے۔

میں تو اے بڑی اور اونچی چوکھٹ والے بادشاہ تجھ کو مانگتا ہوں۔ تیری آرزو میں ہر شام سے نہیں سویا۔ چاہے تو رمضان میں مل یا شوال میں۔ رمضان کے عشرۂ آخرہ میں جلوہ افروز ہو۔ یا پنچ کی اور کسی رات میں۔ مجھے اس سے کچھ بحث نہیں۔ میں ہر حال میں راضی برضا ہوں۔

قربان اس دروازے کے جس پر چشم لاہوت کو ہاہوتی نوشتہ نظر آتا ہے۔ دل کہتا ہے میں جبروتی ہوں۔ روح کہتی ہے کہ میں ملکوتی ہوں۔ ہاتھوں کا اصرار ہے کہ ہم ناسوتی ہیں۔ تو کیوں نہ اس دروازے کے راز کو عالم ناسوت میں فاش کر دیں۔ کب تک اقلیم ہاہوت پردۂ خفا میں رہے گی۔

مگر نہیں میرے باپ۔ میرے امام میرے مرشد اول سیدنا علی۔ سلام علیہ نے تو وعدہ کر لیا تھا کہ راز کو مخفی رکھوں گا تو مجھ کو بھی یہ رمز ظاہر نہ کرنی چاہیئے۔ اچھا تو اے وہ جس کے پاس جانے کیلئے ہاہوت جیسے گم اور گم کرنے والے دروازہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ دُور سے میری آواز سُن۔ میں ناسوت کے عالم خواہشات میں ہوں۔ وہیں سے پکارتا ہوں۔ پانچ پردوں کی دوری ہے۔ مگر جانتا ہوں کہ تو وہاں بھی سُن لیتا ہے۔ ناسوت میں ہوں۔ اس کے بعد ملکوت ہے پھر جبروت ہے۔ پھر لاہوت ہے۔ پھر ہاہوت کا دروازہ ہے۔ مگر تو سب میں ہے۔ اول بھی آخر بھی۔ لاہوت میں بھی ناسوت میں بھی۔ بس تو میری سُن میں اپنے سر کو تیری چوکھٹ پر جھکاتا ہوں میں تیرا بندہ ہوں۔ یہ میرے دونوں ہاتھ کنڈی کھٹکھٹاتے ہیں۔ تو بخشش و کشائش کے دروازے کو کھول۔ جب تو دیتا ہے اور دیکھتا ہے تو مجھکو دے۔ جب تیرے ہاں کسی بات کی کمی نہیں تو میرے لئے دیر کیوں ہے۔ دست رحمت بلند کر۔ اور بندہ فقیر کی جھولی میں کچھ ڈال دے۔ یہ جھولی والا فقیر گھر بہ گھر نہیں جاتا۔ اسی دروازہ پر آتا ہے۔ اسی پر آیا ہے۔ اسی پر آتا رہیگا۔ کسی نے کہا وہ ڈالدینے کے بہانے سے اپنے مشتاقوں

کو دیدار دکھا دیتا ہے۔ اور یہ شعر پڑھا ہے

آمد بروں ز خانہ چو آواز ما شنید بخشیدنِ نوالِ گدا را۔ بہانہ ساخت

تو یہ بھکاری بندہ بھی صدا لگاتا ہے۔ بھیک کا ٹکڑا مانگتا ہے۔ دروازے کے فقیر کو مایوس نہ کر۔ واما السائل فلا تنھر کا خیال رکھ۔ اور میری جھولی میں خیرات ڈالنے کیلئے دروازہ پر آجا۔ تاکہ میں رمضان کے روزے۔ تراویح۔ نوافل۔ شب بیداریاں غرض تمام نیکیاں جو میں نے اور تیرے سب بندوں نے کی ہیں تجھ پر قربان کر کے پھینکدوں اور پھر تیرے قدموں کو پکڑ لوں۔ اگر وہ نہ ہوں۔ اور یقیناً نہیں ہیں۔ کیونکہ تو اعضائے جسمانی سے پاک ہے۔ تو اپنے خیال و تصور سے تیرے مثالی پاؤں بناؤں۔ انکو چوموں۔ ان پر سر لگاؤں۔ آنکھیں ملوں۔ اور جبتک تو میری جھولی نہ بھر دے۔ اُن قدموں کو نہ چھوڑوں۔ رمضان کے روزہ دار فقیر کی آواز سُن جو کہتا ہے۔

میری جھولی بھر دے میرا آنچل بھر دے
تیری جنت کی خیر اس کی نزہت کی خیر شاخِ طوبےٰ کی خیر حورِ حمرا کی خیر
ٹھنڈی نہروں کی خیر اُجلی لہروں کی خیر تیرے جلوے کی خیر دید میلے کی خیر
میری جھولی بھر دے میرا آنچل بھر دے
تیری دوزخ آباد اس کا برزخ آباد طوقِ بھاری آباد شعلے ناری آباد
قہرِ خشکی آباد طیش و ترشی آباد گرز و ہنٹر آباد دُکھ کے سنٹر آباد
میری جھولی بھر دے میرا آنچل بھر دے
تیری کرسی رہے اس کی بستی رہے عرشِ اعظم رہے علمِ محکم رہے
لوحِ مخفی رہے نقشِ ہستی رہے زیب و زینت رہے شانِ اخضر رہے
میری جھولی بھر دے میرا آنچل بھر دے
تیرے دریا بہیں موجیں ہر جا اُٹھیں کوہ و جنگل رہیں چپ کے دنگل رہیں

مرنے والے مریں　　جینے والے جئیں　　عقل والے رہیں　　بھولے بھالے رہیں

میری جھولی بھر دے　　میرا چنچل بھر دے

سنا! تیرا فقیر بندہ تیری ہر چیز کی سلامتی چاہتا ہے۔ خیر و شر۔ نور و ظلمت قہر و رحم کا یکساں خیر طلب ہے تو تو بھی اس پر مہربان ہو۔ اور اسکی خالی جھولی میں ایک غیبی ٹکڑا ڈالدے

فلک پر

(از رسالہ صوفی اگست ۱۹۱۳ء)

جس کو حد نظر کہتے ہیں۔ میں نے ایک مست کی متوالی آنکھ دیکھی۔ ستارے اس کو ستا رہے تھے۔ مگر وہ بے پروائی۔ مدہوشی۔ خود فراموشی کے عالم میں آسمان کے دروازے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نہیں کہہ سکتا۔ اس آنکھ کو کس کی تلاش تھی۔ مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ ایسی خمار و مستی تھی یا کچھ اور تھا۔

فلک کی کھڑکی کھلی ایک فرشتہ نے گردن نکالی۔ اور آنکھ سے کہا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ کا حکم نہیں سنا۔ نشہ باز کا یہاں کام نہیں۔ زمین کے میخانے میں جا۔ اور جام کی لال روح کو دیکھ۔ چشم دیدار طلب نے ملکوتی ہستی کے فرمان کی پروانہ کی۔ اور لڑکھڑاتی ہوئی آسمان کے اندر گھس گئی۔

فرشتے اس بے ادب گستاخ اور دیوانی آنکھ کے داخلہ سے گھبرا گئے۔ انہوں نے غل مچایا۔ اور کہا۔ تو اس مقدس اور پاکیزہ مقام پر بھی فتنہ فساد برپا کرنے آگئی۔ خدا سے ہم نے کہا تھا آدم کو خلیفہ نہ بنا۔ جو تیری با امن زمین پر خونریزی کریگا۔ مگر اس نے آدم کی علمیت سے ہم کو قائل کر دیا۔ وہ جو کچھ تھا زمین کے لئے تھا۔ اس کی خلافت تجھکو مبارک۔ مگر آسمان ہمارا ہے۔ ہم کو عبادت کرنے دے۔ اپنی آوارگی کو یہاں مت پھیلا۔

عین فرشتوں کی یورش میں ایک غیبی صدا پیدا ہوئی۔ جس نے کہا آنے دو مت روکو۔ یہ میری ہے۔ میں اس کا ہوں۔ اس کے بعد ایک تجلی نمودار ہوئی۔ فرشتے کانپ کر سجدے میں گر پڑے۔ مگر انہوں نے گرتے گرتے دیکھا وہ تجلی آنکھ کے پردے میں سما گئی۔ آنکھ نے اپنے دونوں غلافوں کو کھینچا۔ اور پردے بند کر لئے۔ پھر دیکھا تو نہ فلک تھا۔ نہ زمین۔ نہ فرشتے۔ نہ کچھ اور۔ آنکھ اور اس کے اندر چھپی ہوئی تجلی کے سوا سب نابود ہوگئے۔ میں نے کہا فنا و بقا اسی کا نام ہے۔

قدرت میرے ہاتھ میں

(از نظام المشائخ ستمبر ۱۹۱۳ء)

گنہگار خطاؤں کی پوٹ۔ ابن آدم۔ خاک کا پتلا۔ میں ایک بشر ہوں۔ تم بھی جانتے ہو۔ میں بھی جانتا ہوں کہ کس قدر قصور میری ہستی سے نمودار ہوئے۔ تم نے مجھ کو آزمایا میں نے تم کو دیکھا۔ ایک بار نہیں ہزار دفعہ محبت کے رشتہ کو کتنی مرتبہ خفقان کی چھری سے کاٹا۔ گو وہ نہ کٹ سکا۔ مگر زخمی ضرور ہوا۔

میرے خیالات۔ میرے حالات۔ میرا ظاہر۔ میرا باطن۔ تم سے پوشیدہ نہیں۔ جو عیاں تھا وہ بھی تم کو معلوم۔ جو مخفی تھا اس سے بھی تم خبردار۔ برسوں للچائی رہی۔ آنکھ کی۔ کان کی۔ ہاتھ کی۔ پاؤں کی۔ زبان اور ہونٹ کی۔ اور خبر نہیں کس کس کی۔

مگر تم نے دیکھ بھال کر قول دیا۔ جان بوجھ کر پیمانِ وفا باندھا۔ اور کہا۔ میں تیرا ہو کر رہوں گا۔ اور اپنا بنا کر رکھوں گا۔ یہ کہہ کر۔ طاقت اور قدرت کی کنجیاں میرے حوالے کر دیں۔ اپنا سب کچھ سونپ دیا۔

میں نے یہ دیکھکر گرد و پیش کے تعلقات توڑ ڈالے۔ تمہاری زنجیر سے ہاتھ پاؤں اور دل کے گلے کو باندھ لیا۔ تمہاری یاد کو بنائے زندگانی کا ذریعہ ٹھہرایا۔ تمہاری طاعت

(۳)

مسلمان ہوں جس پر نعمتوں کو پورا کرنے کا وعدہ کر چکے ہو۔ حجازی ہوں جسکی دل جوئی کا قول ہار چکے ہو۔ مستِ الست ہوں جس کے جبلی کو قرآن میں شائع کر چکے ہو۔ وہ وجود ہوں جس کی پشت پر مہر اسرار کے نشان ہیں۔ منکر اور ناشناس دوزخیوں کو مجھ پر مسلط نہ کرو۔ اپنی فرقت کی آگ میں مت جلاؤ۔ رقابت کی آتش میں نہ ڈالو۔ کوئی قصور ہوا ہو تو چشم کرم کو پھیر لو۔ اس میں کام تمام ہو جائے گا۔ دوسروں کے سامنے ذلیل و رسوا نہ کرو۔ مانتا ہوں کہ یہ سب کچھ نگاہ و قہر کی کارسازیاں ہیں۔ مگر قہر اپنی ذات تک محدود رکھو۔ تمہاری رحیم سرکار ہے۔ پھر ایک نہ ایک دن ملائمت کی توقع ہو سکتی ہے۔ ان خود غرض بندۂ حرص وہوس اجسام۔ ان منوئے اور فراموش کار افراد کے پالے نہ ڈالو جنہوں نے تمہارے دلدادہ کو جوتیوں میں ڈال رکھا ہے۔ اور اجازت دو کہ میں بھی انتظام کے لئے باہر آؤں۔ اور اس خس و خاشاک کو نابود و فنا کرکے دکھاؤں کہ یتی تمہاری دی ہوئی قدرت میرے ہاتھ میں۔

کعبہ والے خدا کو کیونکر پاؤں؟

(از رسالہ خدام کعبہ جون ۱۹۱۳ء)

میں اس کو چاہتا ہوں۔ میرا جی اس پر آگیا ہے۔ اُس کی یاد مجھ کو ستاتی ہے۔ دید مانگتا ہوں۔ ایک نظر ڈالنے کی ہوس ہے۔

وہ کہاں ہے۔ کس طرح دستیاب ہوتا ہے۔ ہر چیز کوشش سے ملجاتی ہے۔ ہر جوان نے پڑھتے پڑھتے بی اے پاس کر لیا۔ لال خاں کو مرغبازی کا ہنر آگیا۔ انجن دہلی سے دوڑتا کلکتہ پہنچ گیا۔ گنگا ہردوارے بہتی بہتے بہتے سمندر میں جا گری۔ سورج طلوع ہوا تو اس نے ہر سوتے کو جگا دیا۔ چاند غروب ہوا تو تارے چمک گئے۔

وفرمان پزیری کے آگے جھک گیا۔ جو کہا وہ کیا۔ جدھر بڑھے گئے اُسی سمت چلتا رہا۔

کچھ یاد ہے وہ اندھیری راتیں جن میں میں جاگتا تھا۔ اور تم کو جگاتا تھا۔ اور وہ گرمی کے دن جبکہ میں تمہاری خاطر اپنے جسم کو پسینہ میں ڈبوتا تھا۔ وہ سردی کے سناٹے جن میں تمہاری مدارات کی جاتی تھی۔

تم کہتے تھے آہا یہ کیسے اچھے دن ہیں۔ میں کہتا ہاں میاں یہ زمانہ ہر اک کو نصیب نہیں ہوتا۔ تم مجھ پر فدا تھے۔ میں تم پر نثار تھا۔ آسمانی آبادی رشک کرتی تھی۔ بازؤں کے فرشتے نیکی بدی کے علاوہ ایک تیسری چیز درج رجسٹر کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں جبکہ میں نے سمندر کی یورش سے نجات پائی۔ تم نے کہا آدمی میں تیری یاد میں بے چین تھا۔ تو کہاں تھا۔ تو آگیا؟

اب کیا ہوا جو تم مجھ سے بیزار ہو۔ اگر خطاداری اور غلط کاری باعثِ حجاب ہے تو یہ پہلے بھی تھی۔ کہہ چکا ہوں کہ تم نے آزما لیا تھا۔ اور خصلت و عادت کو پہچان گئے تھے۔

اب تم مجھ سے بچتے ہو۔ بہانہ کرکے ٹلتے ہو۔ ظاہرداری کی رسموں سے بہلاتے ہو حالانکہ جو تمہاری دی ہوئی قوت عرفان سے غیب کا مشاہدہ کرتا ہے۔ جو باوجود سیہ کاری و عصیاں آبی کے زبردست طاقت ہوش و دانش کی رکھتا ہے۔

آج اگر تم ناقص اور تمہاری شان کو نہ سمجھنے والی ہستی کو اپنا بناتے ہو اور تاج حکمرانی اس کے سر پر رکھتے ہو۔ آج اگر تم کو یہ خیال ہے کہ قدیمی رشتہ توڑنے سے منظر کائنات کی نمائش بڑھ جائے گی۔ تو میں ادب سے کہوں گا کہ انصاف کا خون ہو جائے گا۔ اور لطفِ رعنائی و کبریائی ہاتھ سے جاتا رہے گا۔

یاد تمہاری ہے اس کو سامنے لاکر سوچو۔ قدرت تم مجھکو دے چکے ہو۔ میں ہجوم اندوہ میں اپنے ہاتھ کی قدرت کو گردش دونگا۔ اور ناقص العقل ہستی کو خاک و خون میں ملا دونگا۔ پھر نہ کہنا کہ وفاداری و دلداری کے خلاف کیا۔ میرا دل پک گیا ہے۔ میرا جگر دکھ گیا ہے۔

میری بیٹی حور بانو نے پاؤ پارہ قرآن شریف کا صبح سے شام تک یاد کر لیا۔ پکانے
والی نے آٹا گوندھا تھا۔ اب روٹی پکا رہی ہے۔ مگر میں اُسکو کعبہ کی کالی چادر میں۔ مدینے
کے سبز غلاف میں۔ اجمیر کے صندل میں۔ دہلی کے نظام الدین میں۔ نماز کے سجدے میں
بیوہ کی آہ و سرد میں۔ یتیم کی چشم تر میں۔ مظلوم کی مایوسی میں۔ ظالم کی خود فروشی میں ڈھونڈھ
چکا۔ ہر دروازہ کی کنڈی بجا چکا۔ آنسو بھی بہائے۔ ہاتھ بھی پھیلائے۔ لیکن اس کا دامن
نصیب نہ ہوا۔ میں نیا گرفتار نہیں ہوں۔ میری اسیری پرانی ہے۔ مگر اب بھی مجھکو فریاد کرنی
نہیں آتی۔ اس کی ناز برداریاں نہیں جانتا۔ کوئی ہے جو مجھے بتائے کہ میں اُسے کیونکر پاؤں۔

ادھر جھک۔ سن۔ بتانے والا بتاتا ہے۔ زخم کھول۔ مرہم کا پھاہا خود سامنے آتا ہے۔

تیری تلاش ادھوری تھی۔ تیری جستجو کا رُخ بے رُخ تھا۔ وہ کعبہ کی چادر میں منہ چھپائے
موجود تھا۔ وہ مدینے کے سبز غلاف پر صاف جھلک رہا تھا۔ اس نے تجھ کو اجمیری صندل
میں خوشبو بن کر۔ اور دہلی کے نظام الدین میں سلطان المشائخ ہو کر پکارا۔ مگر تیرے کان
میں سائنس و فلسفہ اور نئے زمانہ کے ہوا و ہوس نے پردے ڈال رکھے تھے۔ تو اس کی
آواز بے صوت کو کیوں کر سنتا۔

اور سُن۔ علی مرتضیٰؓ نے کیا آواز دی کہ ارادہ کی شکست میں اس کی شکل نظر آتی ہے۔
ہربرٹ سپنسر نے کتاب لکھی۔ اور ہر چیز کا فلسفہ بتا دیا۔ مگر چھپنے کا وقت آیا تو ناگہانی
افتاد سے مسودہ غائب ہو گیا۔ اُس وقت اُس نے کہا کہ یہ کون تھا جس نے میرے
ارادے اور یقینی کوشش کو جلدی پورا ہونے سے روک دیا۔ کیا یہ امر اتفاقی تھا؟
اگر اتفاقی بات تھی تو مسودہ پریس میں دستیاب ہونے کے بعد پھر کیوں گم ہو گیا۔ کیا
اتفاقات کو میرے ساتھ ضد ہے۔ شاید اس میں کوئی بھید ہے۔ ممکن ہے اس کا اختیار
کسی مخفی طاقت کے ہاتھ میں ہو۔ وہ کون ہے؟ کیا خلقت اسی کو خدا کہتی ہے۔
اگر یہ سچ ہے تو میں اُسے کیونکر پاؤں۔ البیلی طوائف کو دیکھ۔ عمر بھی چھوٹی۔ صورت

بھی انوکھی۔ لباس بھی طرحدار۔ آواز بھی قیامت۔ گانے کا ڈھنگ بھی بے نظیر۔ مگر اس کو
کوئی بھی نہیں پوچھتا۔ مجرے کے لئے کوئی نہیں بلاتا۔ ذیلی جان طوائف۔ کالی بھونڈی
چالیس برس کی عمر۔ پھٹی ہوئی آواز۔ ناچنا آئے نہ گانا۔ لیکن ہر شخص کی زبان پر اس کا
چرچا ہے۔ یہ اثر اور بے اثری کس نے پیدا کی۔ کیا اس نے جس کو خدا کہتے ہیں۔ اگر
بات یوں ہی ہے۔ تو سمجھ کہ خدا ان ہی موقعوں پر پہچانا جاتا ہے۔

استاد شبو کا قصہ بھول گیا۔ خون کے مقدمے میں گرفتار تھے۔ ثبوت پورا
تھا۔ قانون پھانسی پر لٹکانے کے لئے آستین چڑھا چکا تھا۔ ہزاروں روپیہ روز لینے والا
وکیل قلم ہاتھ سے رکھ کر چپ چاپ کھڑا تھا۔ استاد کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں
کہ جج صاحب نے حکم دیا۔ شبو خاں تم بری کئے جاتے ہو۔

ختم خواجگان چشت پڑھوایا تھا۔ ان کا زیادہ بھروسہ اسی پر تھا۔ گو وکیلوں کے
محنتانہ میں دس ہزار خرچ ہوا۔ لیکن ان کا دل یہ کہتا تھا کہ یہ ایکسو ایک روپیہ جو ختم
خواجگان چشت میں خرچ ہوا۔ بس یہی اصل اور مفید خرچ ہے۔

اگر یہ بات درست ہے تو خدا اسی توکل اور بھروسہ کے اندر تھا۔ اور سب ظاہری
اسباب کو شکست دے کر ختم خواجگان میں نمودار ہونے والا وہی تھا۔ تو چاہتا ہے تو
اس طرح اس کو تلاش کر۔

چودھری سنگھ کا دس لاکھ روپیہ کیوں تباہ ہو رہا تھا۔ قانون کے ہاتھوں دستاویز
کی تحریر کی بدولت وہ کس طرح مایوس ہو گئے تھے۔ رشوت خوار حاکم کو ۵۰ ہزار روپیہ
دینے کو تیار تھے۔ مگر آیت کریمہ کے ایک عمل نے جس میں صرف ۴۱ روپے صرف ہوئے اُنکی
جائداد کو بچا لیا۔ ان کو حیرت تھی کہ غیبی ہاتھ کہاں سے نمودار ہو گیا۔ اس کا تو انہیں گمان
بھی نہ تھا۔ لیکن قرآن نے اُن کی حیرت کو یہ سنا کر دور کر دیا کہ من یتوکل علی اللہ فہو حسبہ
جو خدا پر بھروسہ کر لیتا ہے تو وہ اس کا حامی بن جاتا ہے۔ اور ایسی صورتوں سے مشکلیں آسان کر

طائر سبز فام کا پیام

از رسالہ اسوۂ حسنہ میرٹھ بابتہ اگست ۱۹۱۴ء

ذکر اسی شب برات کا ہے۔ جبکہ پہلے آسمان پر وہ جلوہ افروز تھا جس کو خدا کہتے ہیں۔ آسمان پر پہرے لگے ہوئے تھے۔ فرشتے اپنی ذکریوں پر سربسجود اور بالقیام حاضر تھے۔ چاندی کی شمع جل رہی تھی۔ تاروں کے فانوس جگمگا رہے تھے۔ زہرہ گنگناتی تھی اور نغمہ بجاتی تھی۔ مشتری وجد کرتا تھا عطارد سال بھر کی تقدیروں کے نوشتے پیش کر رہا تھا۔ مریخ تلوار کھینچے کھڑا تھا۔

تختِ رب العالمین ظہور ذات سبحانی کی مستی میں جھوم رہا تھا۔ میں نے دیکھا ایک سبز پرندہ دستِ قدرت پر بیٹھا ہے۔ اور مخلوق پناہ رب سے کچھ کہہ رہا ہے قدرت کا دوسرا ہاتھ اس کے سر پر شفقت سے پھیر رہا ہے۔ اور بار بار اس پرند کی منقار سرخ کو بوسے دیے جاتے ہیں۔

اتنے میں ایک زمردیں قفس لایا گیا جس کے اندر موتیوں کا جھولا پڑا ہوا تھا۔ جانور پھدک کر اس پنجرے کے اندر چلا گیا۔ اور قفس کی تیلیوں میں سے چونچ نکالکر مستانی صدا میں کچھ اور گانے لگا۔ غیب کے ہونٹ پھڑ پھڑے۔ اور فریادی پرندہ کی چونچ کو چوم کر اس کا پنجرہ ایک موجود وجود کے حوالے کر دیا گیا۔

یہ موجود وجود پنجرا ہاتھ میں لئے ہوئے۔ ہوا میں تیرتا۔ فرّاٹے بھرتا دم کے دم میں زمین پر آگیا۔

یہ بستی میں داؤد یہودی کا گھر تھا۔ جہاں حسن نظامی کا خاکستانی پیکر جلوؤں کی دید کے لئے آنکھیں مانگ رہا تھا۔ آج شب برات ہے۔ میں بصیرت مانگتا ہوں۔ یہ لال

ہے جس کا اس کو وہم و گمان بھی نہ ہو۔ بس تو بھی ان ہی کرشموں میں اس کو ڈھونڈا کر۔

ارمان والی اصغری دولت والی اصغری اولاد کے لئے پھڑکتی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر اور حکیموں کے علاج میں پورا اکیس ہزار روپے پانی کی طرح بہا چکی تھی۔ مگر کیا ہاتھ آیا۔ حسرت و مایوسی۔

اور سورۂ مزمل کے وظیفہ میں کیا خرچ ہوا۔ صرف اکیس روپے۔ اور نتیجہ کیا پیدا ہوا۔ چاند سی صورت کا بیٹا۔

ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میرا اس پر ایمان ہے۔ اس گوشۂ تنہائی میں جہاں زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں۔ یہی شغل رہتا ہے۔ مگر یہ سب میرے درد کی دوا نہیں ہیں۔ خون کے مقدمہ سے رہائی۔ دولت کی کمائی اور بچے کی ہوائی نہیں چاہتا۔

میرے دل میں ایک اور درد ہے۔ میری آنکھ کچھ اور دیکھنا چاہتی ہے۔ میں اسکی ملنے کا خواستگار ہوں۔ اور علانیہ دید کا طلبگار ہوں جس کو خدا کہتے ہیں۔ جو رب کعبہ کہلاتا ہے۔ ابابیلوں سے ہوائی جہازوں اور کنکروں سے توپ کے گولوں کا کام لیتا ہے۔ جو اپنے نام کے گھر بنواتا ہے۔ انکی عزت و حرمت کراتا ہے مگر سکونت مکانی سے انکار ہے۔

وہ جس نے کشمیر کے گلزار پہاڑوں، شملہ کے خنک آبشاروں، سوئزرلینڈ کے سہانے نظاروں کو چھوڑ کر حجاز کے سوکھے جلتے بلتے کوہستان کو اپنی پسندیدگی کا نشیمن بنایا۔ اور پروانہ بھجوایا۔ قرآنی گزٹ میں چھپوایا کہ ساری خدائی میں ایک دفعہ میرے ہر ہمت و طاقت والے شیفتہ پر اس مقام کی دید فرض ہے۔ میں اسکو مانگتا ہوں جو عرب کی کھجوروں کانٹے دار بیریوں۔ اونٹوں کے کجاوں کو آم کی ٹہنیوں گلاب کی شاخوں اور موٹروں پر ترجیح دیتا ہے جس نے اپنے نام کی قسموں کو رب کعبہ کے لفظ سے نامزد کیا ہے جس کا اشارہ ہے کہ سب خدا کا رکعبہ کے رُخ مجھ کو دیکھیں اور سر جھکائیں۔

بس میں اُسی کو۔ بالکل ٹھیک اسی کو پوچھتا ہوں کہ وہ کیونکر ملے۔

پدڑی کا پنجرا نہیں مانگتا۔ آپ کی ہی عجیب دین ہے۔ بھوکے کو کپڑا دیتے ہو۔ اور ننگے کو روٹی۔ اندھے کو کان دیتے ہو اور بہرے کو آنکھیں۔

صاحب نشیلی آنکھ کا طلب گار ہوں۔ اور البیلے یار کا خواستگار ہوں۔ یہ جانور کسی بچے کو بخشئے۔ یا کھلونا کسی ناداں کے حوالے فرمایئے۔

چینی کی رکابی میں بنے ہوئے پھولوں کو کیا کروں۔ رنگ روپ بھی ہے دوام قرار بھی ہے۔ مگر نیچرل ادائیں نہیں۔ نہ وہ گل اندامی کی مہک ہے۔ طلائی نقرائی گلدانوں کے گلدستے مجھ کو منظور نہیں۔ پابگل پودا درکار ہے۔ جو اپنے بھروسہ اور اپنے پاؤں کا سروا ہے کھجور کے درخت میں آم نہ لگا۔ انگور کی شاخ میں کریلے نہ پھیلا۔

وجود موجود! قرن ہست کے نمرود۔ تو کیا جانے عبد و معبود کے کلمہ کلام کو۔ نابود ہو جا۔ اور اس جوہر ستائی پنجرے کے سامنے سے ہٹ جا۔

وجود موجود نے ایک ہلکی سی جنبش کی۔ اور اپنی نامفہوم صدا میں کہا۔

معدوم ہستی نما آدم! آج کی رات یعنی دین اور جزا و سزا کی رات ہے۔ اجسام و ارواح الفاظ و معانی۔ بندہ خدا کی یکجائی کی رات ہے۔ ہر طلب کی حقیقت مجاز کا لباس پہنتی ہے۔ آج دربار سے جس کو جو کچھ ملتا ہے اس کی خواہشوں کا مجسمہ ہے۔ تو جو اکڑتا ہے الٹی سیدھی باتیں بنا کر اپنا کوئی ممتاز مطالبہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ غور کر کہ یہ جانور اور یہ پنجرا تیری ہی خواہشوں کا برزخ ہے۔ تیرے ہی مطالبات کا ہیولیٰ ہے۔ بصیرت کیوں مانگتا ہے؟ کس کی دید کا طلبگار ہے۔ دیکھ کہ اس قفس میں سب کچھ نو دار ہے۔ یہ طائر سبز فام طریق حیات کا خضر ہے۔ اور عطائے ربانی کا مجازی برزخ ہے۔ جس طرح تیری دعا اس زبان سے تھی جو اصلی حسن نظامی کی نہیں۔ تیری طلب اس دل سے تھی جو حقیقی حسن نظامی سے خارج ہے۔ تیرے ارادے اس دماغ سے تھے۔ جو واقعی حسن نظامی سے تعلق نہیں رکھتا۔ لہٰذا اسکا جواب۔ اسکا عوض۔ اسکا تبادلہ

بھی اس صورت میں ہوا۔ جو تیری آنکھوں کو اجنبی اور غیر نظر آتا ہے۔

وجود موجود کی گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ طائر سبز فام نے اپنی شیریں زبانی کو اردو زبان میں آمیز کر کے یوں در افشانی شروع کی۔

پہلے ثابت کر کہ تو ہی حسن نظامی ہے۔ پھر دیکھ کہ میں ٹھیک تیرا ہی مطالبہ ہوں۔ یا کچھ اور۔ ارے نادان یہ سارا جہان وہ نہیں ہے جو تو دیکھتا ہے۔ وہ نہیں ہے جس کا تصور تیرے غلماتی ذہن میں آتا ہے۔ یہ شکلیں حیوان و انسان کی۔ یہ صورتیں شجر و حجر کی دیکھنے میں کچھ اور ہیں۔ اور حقیقت میں کچھ اور ہیں۔ ایسے ہی ان اجسام کی ارواح کے جذبات و خیالات اپنے اندر باہر کی جو شکلیں بناتے ہیں وہ سب بے معنی اور مہمل ہوتی ہیں۔

اول تو مسلمانوں کی قوم کو دیکھ۔ پھر دوسری قوموں پر نظر ڈال۔ بلندی پستی عروج و زوال۔ شہ زوری و بیچارگی۔ سرکشی و بے بسی کے دو کارخانے دکھائی دیں گے۔ جو ایک دوسرے کے بالکل برخلاف کام کر رہے ہیں۔ جب ایک فریق بلند ہوتا ہے تو جان لے کہ اس نے خود اپنی بلندی کو بلند نہیں پایا۔ دوسرے اس کو بلند سمجھتے ہیں۔ اسکو رات دن اپنی پستی کا تصور رہتا ہے۔ جو عروج میں ہیں ان کو اپنی حالت زوال پر نظر آتی ہے۔ شہ زور کو ہمیشہ اپنی کمزوری کا احساس ہوتا ہے۔ سرکش دوسروں کو مرعوب کر لیتا ہے۔ تو خود اپنے نفس سے بھی مرعوب رہتا ہے۔ اور اپنی کم طاقتی کا صدمہ سہتا ہے۔

لیکن میں جس کے پاس آتا ہوں۔ اس کو چند روز میں منتہائے مقصود کی اصلیت بنا دیتا ہوں۔ سمجھا دیتا ہوں۔ بلکہ آنکھوں سے دکھا کر ذہن و دماغ پر نقش کر دیتا ہوں دیکھ میں مدینے کے گنبد خضرا یعنی سبز کا برزخ ناسوتی ہوں۔ میری منقار سرخ کے آگے گردن جھکا۔ جس کو پروردگار کے لب بے لب نے چوما۔ اور میرے ہر بول کی صدا اور میری ہر حرکت پر قدم اٹھائے چلا جا کہ یہی میرا اسوہ حسنہ ہے۔ اور اسی کے اندر تو اپنے سب مطالبات مشاہدہ کرے گا۔ اور پائے گا۔

تو ہی ہے اے خدا

(از اسوۂ حسنہ۔ اگست ۱۹۱۳ء)

لوہے کے قلم کو لال نیلے آنسو دینے والے۔ لوہے کی توپ کو آگ کی آہ بخشنے والے تو ہی ہے جس کے نام سے ہر چیز شروع ہوتی ہے جس کے پرتو سے بڑھتی بنتی ہے اور جس کے اشارہ سے نابود و فنا ہو جاتی ہے۔

ہر صورت دوسری شکل سے نرالی ہے یہ تیرے شجر قدرت کی ایک معمولی سی ڈالی ہے۔ آدمی آدمی سے جدا۔ جانور جانور سے جدا۔ درخت درخت سے علیحدہ۔ پہاڑ ہے تو ہر ایک اپنی صورت میں سب پہاڑوں سے الگ۔ دریا ہے تو وہ بھی اپنے رنگ اور وضع قطع میں دوسرے دریاؤں سے انوکھا۔ ذرہ ذرہ میں فرق و امتیاز ہے۔ واہ مولا تیرا کیا راز و نیاز ہے۔

بولیاں رنگ برنگ کی بنائی ہیں۔ اور ہر بولی میں اپنی شانیں چھپائی ہیں۔ حرفوں کو عجیب عجیب وضع کے کپڑے پہنائے ہیں۔ کسی سے کہا اوپر سے نیچے آؤ کسی کو حکم ملا دائیں سے بائیں کو چلو۔ کوئی بائیں سے دائیں کو ہانکا جاتا ہے۔ کسی کا نام عربی رکھا ہے۔ کسی کو چینی کہا ہے۔ کوئی ہندی ہے۔ کوئی انگریزی ہے۔ غرض عجب ہنگامہ رنگا رنگی اختلاف ہے۔ اور پھر ہر جگہ مطلب ایک صاف صاف ہے۔

آسٹریا کا بوڑھا بادشاہ معظم الملکوت بنکر لاکھوں کروڑوں انسانوں کی خونریزی کے لئے تلوار میان سے کھینچتا ہے تو پہلے تیرا نام لیتا ہے۔ دلی کا ناتواں گدا الفت آمیزی کے واسطے قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو پہلے تیرا نام لے کر زبان کھولتا ہے۔

میں کب تک کہوں تو ہی تو ہے۔ تو کب تک سنے تو ہی تو ہے۔ کہنے اور سننے سنانے کا

وقت ہو چکا۔ اب جل اور عمل میں جلوہ افروز ہو۔ اس پرانی لفظی حمد و ثنا کے عوض نئی معنوی تعریفیں حاصل کر۔

ذرا تو ہی دیکھ۔ کیسی چوڑی چکلی۔ صاف ستھری سڑکیں آدمیوں نے بنائی ہیں۔ جگہ جگہ سنگی پہرہ دار کھڑے کر دئے ہیں جو راستہ چلنے والے کو بتاتے ہیں کہ کتنا راستہ طے کیا۔ اور کتنا باقی ہے۔ کچی سڑکیں ہیں۔ لوہے تک کی سڑکیں بن گئی ہیں۔ مگر بتا کہ تجھ تک کونسی سڑک جاتی ہے۔ تیرا پتہ کس پتھر پر لکھا ہے۔

سمندر کہتے ہیں۔ ان کی موجوں اور کف آلود جوش و خروش میں تیرا نشان ہے کنارے آواز دیتے ہیں۔ ہماری بیچارگی و افتادگی میں تیری شان نہاں ہے۔ آہ سینہ سے نکلتی ہے تو کہتی ہوئی چلی جاتی ہے کہ اس خلجان کے اندر تو ہی ہے۔ واہ زبان پر آتی ہے تو تیرا نعرہ مستی سنی جاتی ہے۔

روئی دھنیے کے ہاں پاش پاش ہو جاتی ہے۔ اور تیرا گیت گاتی جاتی ہے۔ لوہا آگ میں تپتا ہتوڑوں سے کٹتا پٹتا ہے۔ مگر تیری سرمدی صورت و تیری ابدی صحت کو فراموش نہیں کرتا۔ اسی لیے خدایا تو نے رحمۃ للعلمین کا لقب کس بشر کو دیا ہے۔ وہ سورج ہے۔ چاند ہے تارا ہے۔ یا مٹی کا دیا ہے۔ سراج منیر کس کی شان میں فرمایا ہے۔ اس روشن چراغ تک خدا ہم کو بھی پہونچا دے۔ ہم بھی اپنے بجھتے ہوئے چراغوں کو اس سے روشن کر لیں۔ وہ چاند سورج تارا نہیں۔ مٹی کا چراغ ہے۔ مگر دوسروں میں اپنی روشنی ڈال سکتا ہے۔ اس لئے ان سب اعلیٰ و برتر ہے۔ ہم اس کو چاہتے ہیں جس کی زلفیں اندھیرے رات کی طرح کالی تھیں جس کا چہرہ صبح کی نورانی روشنی کی شکل منور تھا۔ وہ جو خلق عظیم کا درجہ لیکر اس دنیا میں آیا تھا جس نے عیش و راحت تیرے نام پر لٹایا تھا۔ وہ جو میدان میں تلوار کھینچکر نعرہ حق بلند کرتا تھا پر پھولوں کو بہادروں کے سینے پر مارتا تھا۔ تیروں کو چٹکی بجاتے دل و جگر میں اتار دیتا تھا۔ وہ جو خود بوریے پر بیٹھتا تھا اور دوسروں کو شاہانہ تخت دیتا تھا۔ وہ جو کمبل کا کرتہ پہنتا تھا اور اپنے غلاموں کو

سلطانی قبا میں بخشتا تھا۔ جو کانٹا کھاتا تھا۔ اور ہمارے لئے پلاؤ قورمے پکوا کر رکھتا جاتا تھا۔
وہ جو راتوں کو جاگا اور ہمارے لئے پاؤں پھیلا کر سونے کا سامان کر گیا۔ وہ جو تیرے آگے
آنسو بہاتا تھا کہ میری اُمت کو ہنستا رکھ۔ وہ جو بیماروں کی مزاج پرسی کو خود اُنکے گھر
جاتا۔ گھر والوں کیساتھ ہو کر گھر کا کام کرتا۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتا۔ یہاں تک کہ اپنی جوتی
خود ہی گانٹھ لیتا تھا۔ اپنے کپڑوں میں آپ ہی پیوند لگا لیتا تھا۔ اسکو تو نے ہمارا آقا مولیٰ بنایا
ہے۔ اسواسطے ہمارا جی اسپر آیا ہے ہم کو اجازت دے کہ اسکا ذکر ادب سے کریں۔ اور پھر کہیں
کہ وہ جو لڑکوں تک کو پہلے خود سلام کرتے تھے۔ غریبوں مسکینوں کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے۔
مفلس و بیمار کو حقیر نہ جانتے تھے۔ لاچار بیوہ عورتوں کے سودے بازار سے خرید کر اور اپنے کندھے
پر رکھکر لاتے تھے۔ جنھوں نے کام کے وقت کبھی اس کی پرواہ نہ کی کہ دور جانے کیلئے سواری
موجود ہے یا نہیں۔ اکثر پیدل پا برہنہ۔ سر برہنہ چلے جاتے تھے۔ دینی لڑائی کے سوا کسی پر
وار کرنے کی پہل نہ کرتے تھے۔ اپنے اصحاب میں اس طرح مل جل کر بیٹھتے تھے کہ اجنبی کو یہ
معلوم کرنا مشکل ہوتا تھا کہ حضورؐ کون سے ہیں۔ وہ جو لیٹنے کیلئے بچھونے کا انتظار نہ
کرتے تھے۔ اگر بچھونا نہ ہوتا تو بے تکلف زمین پر لیٹ رہتے تھے۔

تو ہی اے خدا اس حبیبؐ کا راستہ بتا۔ اس کا اسوۂ حسنہ دکھا۔ تاکہ ہم سب
تیری کھینچی ہوئی لکیر کے فقیر بنیں اور ہماری رفتار تیرے اور تیرے بھیجے ہوئے رسولؐ
کی رفتار گفتار و کردار پر ہو۔

دنیا جہان کے حالات معلوم کریں تو سیروا فی الارض کا ارشاد سامنے ہو۔ علمی چرچے
آئیں تو طلب العلم فریضۃ علےٰ کل مسلم و مسلمۃ کو سامنے لائیں صنعت و حرفت کا خیال
ہو تو الکاسب حبیب اللہ ذریعہ بنے۔ ریاست ہو تو وہ جو تیرے رسولؐ نے بتائی۔ معاشرت
ہو تو وہ جو تیرے فرستادہ نے بتائی۔ لکھنا۔ پڑھنا۔ بولنا۔ چالنا۔ کھانا۔ پینا۔ رہنا۔ سہنا۔ لڑنا
جھگڑنا۔ غرض ہر حصہ زندگانی میں حصہ لیں۔ مگر تیری اور تیرے رسولؐ کی پیروی سے ایک قدم باہر نہ جائیں

بندوں کی دُعا

(از اخبار خطیب دہلی ۔۔ ۳ر جنوری ۱۹۱۵ء)

کاغذ کے ناتوان ہاتھوں کو توانائی دے۔ بیجان حروف میں اثر زندگانی بخش۔
انمٹ تقدیروں کو نہ بدل۔ مگر صبر کی تدبیریں۔ تسلیم و رضا کی لکیریں۔ دل کی تسلی کے لئے
بھیج۔ تو نے حجاز کے جھلسے ہوئے بے رونق پہاڑوں میں وہ پھول نرگس کے پیدا کئے
اور ان پھولوں نے کائنات آخر کی بیمار آنکھوں کو صحت بخشی ہم اپنی شرمیلی جھکی ہوئی نظروں
کو تیرے سامنے شفیع بناتے ہیں۔ ہمارے دین و دُنیا کے پہاڑوں میں عیش و راحت
کے باغ لگا دے۔

اے خیالوں میں رہنے بسنے والے۔ مگر دانش و عرفان کی تمناؤں کو بیتاب
رکھنے والے اے ہر ذرہ میں موجود۔ مگر آفتاب تحقیق کی نظروں سے مخفی اے ٹوٹے
ہوئے دلوں کو نشیمن بنانے والے۔ ہمارے پاش پاش دلوں کو بھی نوازنے آجا۔ ہم
فطرت کی سختیوں سے جی ڈرتا ہے۔ اپنی بستی میں پناہ دیدے۔

تجھ کو داتا کہیں۔ تجھ کو مولیٰ کہیں۔ تجھ کو داد کہیں۔ تجھ کو کیا کچھ کہیں۔ تو ہرے
اور تو ہرے آزاد۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

طائر سیاہ فام

(از رسالہ العصر دہلی۔ جون ۱۹۱۵ء)

کل رجب ۱۳۳۳ھ کی ۲۰ تھی۔ معراج کی رات سوتے گزر گئی۔ اس لئے کل روز نامہ حصہ
میں آیا تھا۔ رین بسیرے کے وسیع صحن میں بہت سے انسان پچھلی رات کی خنک ہوا کا لطف

لے رہے تھے۔ اور بے خبر سوتے تھے۔ میری آنکھیں ان کی بے فکری اور بے خبری پر رشک کرتی تھیں۔ اور دل کی بھٹی آنسو گرم کرکے بھیج رہی تھی۔

میں نے تکیہ کے نیچے سے بجلی کا لیمپ نکالا۔ اس کا کھٹکا دبایا۔ روشنی تڑپ کر باہر نکل آئی۔ غسلخانے میں بجاکر اس کو رکھ دیا۔ وضو شروع کیا۔ جب زبان نے کہا:۔ اَللّٰھُمَّ نَوِّرْ وَجْھِیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ۔ خیال لرز گیا۔ میں نے یہ کیا مانگا کیا میرا چہرہ منور ہونے کے قابل ہے۔ برقی لیمپ نے اشارہ کیا کیوں خلجان میں پڑتا ہے۔ نور بھی کوئی چیز ہے۔ بارہ آنے کو نور کی بیٹری آتی ہے۔ خوانخواہ خدا کا احسان اٹھاتا ہے۔

باہر آیا۔ تاروں نے اذان دی۔ اُفق نے حیران ہوکر کہا۔ نماز کا وقت نہیں ہوا۔ یہ کیسی اذان؟ تخت کا مصلیٰ آہستہ سے بولا۔ وقت تہجد ہے۔ مگر کل کی رات کیسی غفلت میں کٹ گئی۔ خیر آج بھی کچھ نہیں گیا۔ چاہتا تھا کہ نیت باندھوں۔ اور دل کی گرہ کھولوں کہ پھر کلیجہ میں ایک تیر لگا۔ کوئی چیز سینہ کے اندر جوش مارتی منہ کی جانب ابلتی ہوئی آئی۔ میں نے آہ آہ کہہ کر اس بخار کو باہر پھینک دیا۔ اور کہا:۔

کم بخت۔ یہ کیا بلا ہے۔ میری ساری رات برباد کردی۔

میرے سب دشمن نے کچھ اثر نہ کیا۔ سارے جسم پر اس نامعلوم زہر نے قبضہ کرلیا میں بے قرار ہوگیا۔ میں نے نماز کے قانونی طریقے کو ترک کردیا۔ اور بغیر قیام و رکوع کے سجدے سے آگے سر جھکایا۔

پیشانی کے نیچے خاک نہ تھی تخت کی لکڑی تھی۔ اسپر سرد جانماز تھی میرا ماتھا اوسپر رکھا تھا۔ اور اس کی پڑوسن آنکھیں بے اختیار رو رہی تھیں۔

میں نے سبحان ربی الاعلیٰ نہیں کہا۔ میں نے ہندی میں اس کی تعریف کی۔ اسکی خوشامد کی۔ اس کی بڑائی کی۔ جوں جوں میں اس کو جگ داتا جگ داتا پکارتا تھا۔ ووں ووں دل کی آگ بھڑکتی تھی۔

اُس نے تو وعدہ کیا ہے۔ بندہ میری طرف ایک بالشت آتا ہے تو میں اسکی جانب ایک ہاتھ بڑھتا ہوں۔ آج وہ کہاں چلا گیا۔ مجھے کیوں رلاتا ہے۔ سامنے کیوں نہیں آتا ہے۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ شعلۂ غم کو زیادہ بھڑکا گیا میں نے سجدے کو چھوڑ دیا۔ گردن کو اوپر اٹھا لیا چشم تر کو آسمان سے لڑا دیا۔ جب بھی جی کو قرار نہ آیا۔ رین بسیرے کا دروازہ کھولا سب سونے والوں پر حسرت کی نگاہ ڈالی۔ قبرستان میں آیا۔ حور بانو کی والدہ خاکی چھپر کھٹ میں غریب گیاہ سبز کا چادرہ اوڑھے اپنے لاڈلے بچے حسن بصری کو آغوش میں لیے سوتی تھیں۔

حدیث یاد آئی۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ تم قبروں کے مردوں پر رشک کروگے کاش قبروں میں ہوتے۔ اور زندگی کی انجمن ہمکو نہ ستاتی۔ سچ فرمایا میرے رسول نے دیکھو میری بیوی جو دس برس شریک بزم حیات رہ کر جنت کو سدھاریں کیسی خوش نصیب ہیں اور آرام سے پڑی سوتی ہیں۔ اور آگے بڑھا۔ اب جنگل سامنے تھا۔ بڑے بڑے گنبد چپ چاپ کھڑے تھے درختوں پر اندھیرے نے سایہ ڈال رکھا تھا۔ دن کو جو سایہ مجھے نیچے نظر آتا تھا اسوقت ان کے اوپر سوار تھا۔

سگنل کی لال آنکھ

جی۔ آئی۔ پی۔ ریلوے کی لائن آئی۔ سگنل نے اپنی لال آنکھ دکھائی۔ اس کا پھیلا ہوا ہاتھ دیکھ کر مجھے وہ آیت یاد آئی کہ:۔

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ

میں اُس سے کیوں مانگوں کیا وہ حاضر و غائب کا عارف نہیں ہے۔ اتنے میں سگنل نے ہاتھ جھکایا۔ لال آنکھ بند کی۔ سبز کھولی کیا کوئی ریل آئی۔ آگے بڑھا سلطان سکندر لودھی

کا صبر و استقبال کو کھڑا تھا۔ ہاتھ ملایا۔ ملاقات ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک گیدڑ برابر سے نکل کر بھاگا اس کے فرار نے جسم میں گدگدی کی۔ بے اختیار ہنسی آئی۔ برقی لیمپ کی شعاع کو گیدڑ پر دوڑایا۔ غریب وحشی زیادہ گھبرایا۔ اور کہیں بھاگ کر غائب ہو گیا۔

اب خدا خدا کر کے جی ٹھیرا۔ اور اس کھنڈر میں ذرا چین آیا۔ چار رکعت نماز ادا کی ۱۲ بار ذکر جہر ادا کیا۔ اور ہر ہُو میں ایک مزا پایا۔

صبح صادق قریب تھی۔ چاہتا تھا کہ گھر چلوں کہ پیپل کے بے برگ درخت پر ایک شامہ نے نغمۂ حمد شروع کیا۔ بولی:۔

سانچے پیر

کہیں ایک دیوار پر اس کا جوڑا بیٹھا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ سب پیر سانچے سانچے بہت دیر تک ان کے سوال جواب ہوتے رہے۔ کیوں ری۔ کالی کلوٹی چڑیا۔ تو ہمارے پیروں کا مزاج بگاڑتی ہے۔ سانچا نام اللہ کا ہے۔ باقی سارا جہان جھوٹا ہے۔ شامہ بولی:۔

کیسے پیر۔ کچے پیر۔ کیسے

جوڑے نے جواب دیا:۔

سانچے رب۔ سانچے۔ سانچے

ہاں اب ٹھیک کہا۔ آخر تو کالے رنگ کی چڑیا ہے۔ سراپا ظلمت ہے مگر بات نورانی کہتی ہے۔ جتنے کالے بدشکل ہوتے ہیں ایسی ہی سفید بات کہا کرتے ہیں۔

طائر سیاہ فام کے ظاہری الفاظ میں تو یہ تھا جو سنایا۔ مگر اس طائری اہپر شو کا سمجھنا آسان نہیں۔ جس نے اس کو سمجھ لیا وہ رات کا سونا بھول جاتا ہے۔ اس کو رونے میں مزا آتا ہے اور رونا ہی اس کی دارین کی تسلی بن جاتا ہے جس کی ہر آدم زاد کو ضرورت ہے۔
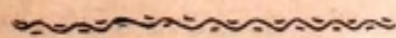
دوسری منزل

ذوق و شوق عشق و محبت سوز و گداز ارادت و عقیدت

حسن کا فرمان

(از رسالہ مخزن ۱۹۰۳ء)

(تھڑدلے۔ دودلے۔ نفسانی عاشقوں کے نام)

جان نثار قدیمی زلف کے مشرقی صوبے دار **ذوق** دہلوی کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ظلِ الٰہی کا حسب ذیل فرمان ان عاشقوں کو پہنچا دے۔ جن کی محبت ماجناب کی شان عالم آرائی میں بڑ لگاتی ہے۔

ان کو بتایا جائے کہ ماجناب عرصۂ دراز سے ایک ایسے ملک میں رہتے تھے جہاں ہم کو سوائے ہمارے کوئی نہ جانتا تھا۔ اس ملک میں ماجناب کی جیسی شان و جبروت تھی اس کا اظہار ہماری قدرت میں داخل ہے مگر تم کو اتنی طاقت نہیں دی گئی کہ کشف راز کی تاب لا سکو ایک ذرہ اگلی شان کا ظاہر ہو جائے تو تمہاری ہستی کا نشان باقی نہ رہے۔

ایک دن ماجناب نے اپنی آن بان کا تماشا دیکھنا چاہا۔ خیال آنا تھا کہ خود بخود تماشا گاہ کی صورت پیدا ہو گئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ پہاڑ ہیں۔ دریا ہیں۔ جنگل ہیں۔ گلستان ہیں اور ایک انسانی صورت ان کے بیچ میں بے حس و حرکت کھڑی ہے۔ یہ عالم ماجناب کو پسند آیا۔ شان

زیبائی کے تھوڑے تھوڑے جلوے چاروں طرف بکھیر دیئے۔ تصویر کی خاموشی ایسی بھائی کہ اسکو اپنے لئے اختیار کر لیا۔ اور اسکی آنکھوں میں تخت سلطانی بچھا دیا گیا +

یہیں سے ہماری حکومت کا زمانہ شروع ہوا۔ اور ماجناب کی کبریائی کونسل میں ابرو۔ رخسار، لب۔ دندان۔ ذقن۔ گردن داخل کے گئے۔ گیسو کی سرحد قائم ہوئی۔ آواز اور زبان کے وزیر احکام چلانے لگے۔ ماجناب کی رعایا ویسی ہی وفادار ہوئی۔ جیسا ظلِ الٰہی کا پہلے منشا، تھا۔ کونسل کے بعض ممبر یا یوں خیال کرنا چاہیئے کہ بعض صوبے دار نادانی و شرارت سے کسی پر ظلم کرتے وجفا کاری سے پیش آئے تو اطاعت شعار رعیت بڑی خوشی سے ان کی ستم آرائی برداشت کرتی۔ بارہا باڈی گارڈ کے سپاہی پلکیں نوکدار برچھیوں سے حضوری کی لوگوں کو ستاتے، مگر کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کسی نے اف کی ہو۔ ماجناب کے کان ان کی فریاد سے ہمیشہ نا آشنا رہے۔ اگرچہ ہم نے کبھی نہیں چاہا کہ بے زبان رعیت پر ظلم توڑے جائیں۔ مگر کیا کریں بعض دفعہ شوخی کے نشے میں ایسا ہو جاتا تھا، اور بارگاہ احدیت مآب کو اس سے افسوس ہوتا تھا۔ بعض دفعہ رعیت کے بعض افراد نافرمان ہو جاتے تو ماجناب ایک حسین ایلچی ان کی ہدایت کے لئے مقرر فرماتے چنانچہ یوسف موسیٰ۔ رام کرشن محمد جیسے خوبصورت لوگ وقتاً فوقتاً ہدایت کے لئے مقرر کیے گئے +

اب آجکل بھی ہم دیکھتے ہیں کہ رعایا میں ابتری پھیل گئی ہے۔ وہ دولے بھڑ دے اور نفس پرست لوگ ہماری حضوری کی طلب گاری کرنے لگے ہیں۔ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ ایک فرمان کے ذریعہ ان کو ہدایت کی جائے اگر انھوں نے اس فرمان کو قبول کیا۔ نزول رحمت کے مستحق ہونگے۔ ورنہ قہر کی بجلیاں گرینگی۔ اور ان کی ہستی کو نیست و نابود کر دیں گی +

ماجناب احدیت کے خیال مقدس میں تھڑ دلا شخص جو ذرا سی بدنامی و ملامت کے ڈر سے گھبرا جائے۔ یا ایسا دو دلا کہ گاہے چنیں اور گاہے چناں کی حالت میں گرفتار ہو۔ یا نفس پرستی اور جذبۂ شہوانی کی تکمیل کی غرض سے ہماری رعیت بننا چاہتا ہو ہرگز اس قابل

نہیں کہ ماجناب کی نورانی حکومت کو اپنی سیاہ کاریوں سے بدنام کرنیکے لئے باقی رکھا جائے

اگر لوگ ماجناب کی دل آرا حکومت میں باقی رہنا چاہتے ہو تو بدنامی کے فکر کو پس پشت ڈال دو۔ یکسوئی اور خلوص قلب سے اپنی پیشانیاں، ہمارے سامنے جھکا دو نیت اور ارادے کو نفسانی خواہشوں سے پاک رکھو۔ ہم تم میں وہ صفت دیکھنا چاہتے ہیں جو ہماری قدسی صفات سلطنت کی رعایا کے واسطے زیبا ہو +

نفسانی خواہش کی تکمیل ایک فوری لذت ہے جو دوسرے ملکوں میں بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ ہماری اقلیم کی جو بات ہے وہ دیرپا ابدی۔ اگر نفسانیت درمیان میں نہ لائی جائے تو عارضی سرور کے بدلے ابدی لطف کی کیفیت عطا کی جائے گی۔ پس تمام طلبگاروں کو آگاہی دی جائے کہ وہ اس فرمان کی تعمیل کے لیے تیار ہو جائیں +

منظرِ فراق

یعنی

وفات الرسولؐ

کا سین

(از نظام المشائخ۔ مارچ ۱۹۱۳ء)

آسمان چُپ۔ زمین دل تھامے ہوئے۔ ہوا چلتے چلتے رکتی ہے۔ اور خانۂ رسولؐ میں غم کی گھڑی کو چھا گئی ہے۔ پرندوں نے چہچہانا چھوڑ دیا۔ کبوتر معصوم عائشہؓ کی بے کسی کو بھولپن سے دیکھ رہا ہے +

آفتاب رسالت پر موت کا ابر چھا رہا ہے۔ نورانی کرنیں پردے میں چھپ رہی ہیں + امّت کا سرتاج دنیا سے سدھارتا ہے۔ باپ کی لاڈلی۔ فاطمہؓ کا سہارا بھی کھسر رہے

ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ عائشہ رضؓ کا دل دھڑکتا ہے کہ سہاگ کی منزل آخر ہوئی۔ حجرۂ رسولؐ کی رونق رخصت ہو رہی ہے۔ یاس و ہراس در و دیوار سے لگے کھڑے ہیں۔

یا رسول اللہ! ابھی نہ جائیے۔ حسنؓ حسینؓ سے جدا نہ ہو جیئے۔ ذرا دیکھئے یہ گیسو راز بکھرے جاتے ہیں۔ اب ان کو کون دوش پر بٹھائے گا۔ کس سے ان کے نازک دلوں کی دلداری ہوگی۔ انہیں کس پر چھوڑا۔ تلواریں ان کو گھور رہی ہیں اور ڈرا رہی ہیں۔ تیر ان کے بے کینہ سینوں سے اور خنجر ان کی صراحی دار گردنوں سے کچھ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر رہے ہیں۔ علیؓ کی کمر ٹوٹی جاتی ہے۔ عقدہ کشا کی زندگی میں حسرت و رنج و محن کی گرہ لگ رہی ہے سلجھے ہوئے ایام الجھ رہے ہیں۔ صدیق رضؓ کو بڑھاپے میں یارِ غار کا داغ رلائے دیتا ہے۔

اور ہاں۔ بچی کی ستی بی بی عائشہؓ کی افسردگی دیکھی نہیں جاتی۔ ست پتا کی جائی ست بچی کی من موہنی۔ برج کائنات کے سب سے بڑے شام سندر کی منظور نظر صدیقؓ کی گود میں پلنے والی۔ آغوش نبوت کے تخت کی ملکہ کیسی اداس۔ مایوس۔ نڈھال سر رسولؐ کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ آج اسکی راج دھانی ہاتھوں سے چھین رہی ہے۔ آج اس کا دھنی دنیا سے منہ موڑ رہا ہے۔

بچی کی ستی عائشہؓ! ہم تیرے ست کے قائل ہیں۔ تو سچی صدیقہ ہے۔ ایک دفعہ آگ میں جل کر مر جانا آسان ہے مگر سارے عمر پتی کے کام میں لگا رہنا اور اسکو انجام پر پہونچانا تیرا ہی حصہ تھا۔ رسولؐ کے خانگی حالات جن پر امت کے ہزاروں کاموں کا انحصار تھا تو نے ہی بتائے۔ اور پر بھو پرشوتم کے پیارے شوہر کے نام پر اپنی زندگی کا عیش و آرام نثار کر کے جلا ڈالا۔

عقل والے تدبیروں کے بادشاہ عمر رضؓ کو دیکھنا۔ سائیں کے فراق نے دیوانہ کر دیا ہے۔ ہوش و حواس قابو سے نکلے جاتے ہیں۔ عثمان رضؓ فدا کار سکوت میں ہیں۔ غم نے گم کر دیا ہے۔ سب سے زیادہ جس دل پر قیامت آئی۔ وہ فاطمہ زہراؓ کے سینے میں پھڑک رہا ہے

یہ ان کے باپ ہیں جو داغ جدائی دیکر جاتے ہیں۔ زہرا بی بی۔ رسولؐ بابا کو نظر بے بسی سے دیکھتی ہیں۔ اور دل ہی دل میں کہتی ہیں الٰہی! اب کیا ہوگا۔ کیا بابا جان مر جائینگے کیا میری تشفی دینے والے پردیس کو چلے، اچھی بابا! فاطمہ رضؓ کو بھی لے چلو۔ لڑائیوں میں اپنی لونڈی کو نہ بھولے۔ اکثر ساتھ رکھا۔ میدانِ موت میں بھی یہ کنیز ساتھ رہے گی۔ اے میرے فقر و فاقہ کے وقت اب کون دلاسا دینے آئے گا۔ بابا میں تمہاری بیٹی ہوں۔ بابا میں تمہاری فاطمہ ہوں۔ میں ضد کرتی ہوں کہ آپ نہ جائیے۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ مجھ کو یتیم نہ بنائیے اے خدا! تو ہی سُن۔ صدقہ اس کشش اُلفت کا جو اپنے حبیب کو دنیا سے کھینچ رہی ہے صدقہ اس قاب قوسین سے آگے والے مقام کا طفیل اس آنکھ کا جو اس بندہ کو خصوصیت سے پیار کرتی ہے واسطہ اس مشیت لامتناہی کا جو سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کر سکتی ہے۔ میرا باپ مجھ سے جدا نہ ہو۔ میرا ستید آنکھ بند نہ کرے پروردگار! میں تیرے رسولؐ کی لخت جگر ہوں۔ خداوندا میں اس آنکھ کی ٹھنڈک ہوں جسکو تو نے دُنیا کی ٹھنڈک کے لئے مقرر کیا تھا۔ الٰہی! میرا کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔

سرکار استغراق میں تھے۔ رخت سفر کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ عالم خاک سے آنکھ بند تھی۔ عالم پاک کی جانب کھلی ہوئی تھی۔ یکایک اہل بیت کی بیتابیاں۔ اُمت کی بیتی کو ساتھ لے کر قدموں کو چمٹ گئیں۔ آنکھوں کو تلووں سے ملا۔ اور حضور کو متوجہ کر لیا چشم گرامی وا ہوئی۔ بیقراروں کی غمناک صورتوں پر نگاہ ڈالی۔ اور رفیق اعلیٰ کے ان سب کو سپرد کیا گیا۔ رفیق اعلیٰ کو پکارا۔ رفیق اعلیٰ نے لبیک کہی۔ اور جھک کر اپنے کارگزار مقبول بندے کو اٹھا لیا قریب کے سب مقام ادب سے بُعد ہو گئے۔ عزرائیل کا اسم صفت۔ اسم ذات نے الگ کر دیا۔ رفیق اعلےٰ نے رفیق اعلیٰ کو خود منزل رفیق میں لیجا کر پہونچا دیا۔ جو کبھی نہیں ہنسا۔ جو کبھی نہیں ہنسیگا۔ جو ہنسی سے پاک ہے۔ اس نے مسکرا کر رسولؐ کے فرقت زدہ اصحاب کو۔ اہل بیت کو۔ غم و الم کی تصویروں کو دیکھا اور زبان بے زبانی

سے ارشاد فرمایا۔ کیا یہ میرا ہمیشہ تمہارے پاس رہتا۔ کیا تمہارا دل مجھ سے زیادہ اس کا مشتاق تھا۔ ہم کو اس کی خاطر نوازوں گا۔ اور نواز رہا ہوں۔ تم کو اس کی خاطر اُمتوں کا سرتاج بنایا اور بناؤں گا۔ عائشہؓ ہراساں ہو۔ میں تیرا محافظ ہوں۔ فاطمہؓ دلگیر نہ ہو۔ میں تجھکو دلاسا دونگا۔ اور جلدی اس سے ملاؤنگا۔ میرے بندے کے فدائیو! بےچین نہ ہو۔ قیامت تک میں تم کو ماتم پیشہ کرونگا۔ دل زخم خوردہ پر مرہم پاشی ہوتی رہے گی۔

لو صاحبو! آقا رخصت ہوئے۔ فاطمہؓ کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ عائشہؓ کے حجرے میں آفتاب چھپ گیا۔ جبرئیل جاتے ہیں۔ اب نہ آئیں گے دیکھو یہ تمہارے کملی والے شاہ لیٹے ہیں۔ اُمتی اُمتی پکارنے والے اور آخر وقت تک اُمت کے خیال میں سرشار متوالے کو جی بھر کر دیکھ لو۔ اب یہ شکل بھی مٹی میں مُنہ چھپانے والی ہے۔

منظر خیالی تیرہ سو تیس برس کے بعد دل کو نہ ستا۔ کون مرا۔ کون گیا۔ کس کی وفات وہ زندہ ہیں۔ زندہ خدا کا زندہ رسول۔ نہ مرے نہ مرنے دے۔ آؤ۔ اس کے دین کی آس میں سانس کو قربانی چڑھائیں اور اُس تک پہنچیں جس کی آرزو ان مناظر تخیلات میں لے آئی ہے۔ مرجاؤ اور اس کو پاؤ۔

اچھی بابُل کیا لاڈلی بیٹی کو بھول گئے

اُمت کی سُسرال سے مدنی میکہ کو ایک خط

(از توحید ۱۹ مئی ۱۹۱۳ء)

بال بدھوا۔ چودھویں سال میں بیوہ ہو جانے والی دکھیا۔ اُمتا کے چاہنے والے پیتا باوا جان۔ اُمت تم پر قربان۔ آپ کی بدنصیب رانڈ اُمتا۔ پردیس میں بیکس بےبس پڑی ہے کوئی پرسان حال نہیں۔ کیا آپ اپنی لاڈلی کو بھول گئے۔

ہائے بابل وہ دن یاد آتا ہے۔ جب میں آپ کی دل کی انگنائی میں کھیلتی پھرتی تھی اور آپ مجھ کو میٹھی میٹھی محبت بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ میں بگاڑتی تھی۔ آپ سنوارتے تھے۔ میں روتی تھی۔ آپ رومال سے آنسو پونچھتے تھے۔ میں ضد کرتی تھی آپ ناز برداری کرتے تھے میری فکر میں آپ نے راتوں کو سونا چھوڑ دیا تھا۔ سات سات دن کے فاقے جس کے لیے ہوتے تھے۔ وہ یہی پھوٹی قسمت کی کنیز ہے۔

وہ زمانہ بھی یاد ہے۔ جب آپکی لاڈلی کے بیاہ کی تیاریاں تھیں قیصر و کسریٰ کی بادشاہتوں کا سامان میرے جہیز کے لئے نکالا جا رہا تھا۔ اور ہاتھوں کو ایسی مہندی لگائی گئی تھی جس کے رچاؤ نے پردیس میں سُسرال جا کر بالم سیاں کو بے اختیار کر دیا۔ اور وہ اُن ہاتھوں پر قربان ہو ہو گئے۔

او اس گھڑی کو کیونکر بھولوں۔ جبکہ میکہ سے ڈولا چلا ہے۔ اور میں نے بچپن کے گھر بار کو چھوڑ کر پردیس کی راہ لی ہے۔ اپنے بیگانے روتے تھے۔ باوا جان آپ بھی غمگین و افسردہ تھے۔ مجھ کو کالے کالے پہاڑ۔ اونچی اونچی کھجوریں۔ جنگل کی بیریاں۔ اور ان پر کبوتروں کا غٹرغوں غٹرغوں کرنا اور مدینہ کی سہیلیوں کی جدائی۔ سب پر طرہ آپ جیسے پریمی پیتا کی چشم محبت کا فراق۔ غضب ڈھا رہا تھا۔ سُسرال میں اچھی گزری۔ لال جوڑے والی مہارانی کہلائی۔ شوہر دلداریاں کرتا تھا۔ آنکھ کے اشارہ کو دیکھتا رہتا تھا۔ چاندنی راتیں تھیں۔ سمندر کا کنارہ تھا۔ اور کان میں مرلی ہزارہ تھا۔ فوجیں تھیں۔ پہرے تھے۔ درو دیوار سُنہرے تھے۔ تاج تھا۔ تخت تھا۔ سہاگ تھا۔ بخت تھا۔

مگر ہائے بابل قسمت لوٹ گئی۔ عمر کا چودھواں سال۔ اُمنگوں اور ارمانوں کا شباب پورا نہ ہونے پایا تھا کہ شیام سُندر پیارے رن میں کام آئے۔ دشمن نے دھوکے کی کٹاری خبر نہیں کہاں ماری۔ کام تمام کر دیا۔ میرا سہاگ لٹ گیا۔ میری لاج و دھانی مٹ گئی۔ میں بے وارث رہ گئی۔ میری ہری ہری چوڑیاں اُتر گئیں۔ میں بیوہ اور دکھیارا رانڈ کہلانے لگی۔

اچھی بابل ذرا اپنی اُستا کو دیکھنے آؤ - اچھی میرے جانے والے بابو مجھ کو ساس نندوں کے طعنوں سے بچاؤ - وہ مجھ کو چھیڑتی ہیں - انہوں نے مجھ کو نکو بنا رکھا ہے - اب اس گھر میں میری مٹی خراب ہے ؞

بیٹی اپنے منہ سے کیونکر کہے - بڑے شرم کی بات ہے - لیکن پتا، تجھ سے کیا پردہ ہے اب مجھ سے رنڈاپے کے دن نہیں کاٹے جاتے راتیں مجھ کو ستاتی ہیں گھٹائیں جب آتی ہیں - بجلی چمکتی ہے - بادل کڑکتا ہے - مور جب بولتا ہے - پپیہا پی کہاں کی صدا لگاتا ہے - سہاگنوں کے جھولے جب دیکھتی ہوں - پھول پہننے والیاں جب جانے آتی ہیں - میری تمناؤں، میرے دلوں میں حشر برپا ہو جاتا ہے - کلیجے پر سانپ لوٹتا ہے ننگی کلائیوں پر نگاہ جاتی ہے تو بے اختیار ٹھنڈا سانس نکل جاتا ہے سنتی ہوں آپ بدھوا کی شادی کے حامی ہیں میرے لیے بھی کچھ فکر کیجئے، میری جوانی دیوانی کی خوشیوں کو بربادی سے بچائیے - پھر وہی پہلی سی مہندی منگائیے - سفید ہاتھوں کو لال لال بنائیے پھر دلہن بنوں - پھر جہیز کا انتظام ہو جیسی آپ کی لاڈلی بیٹی ہوں - ویسا ہی بیاہ رچائیے ارمان کہتے ہیں - ابھی تیری عمر چودہ برس کی بھی نہیں - باپ کی چہیتی ہے - جو ضد کرے تھوڑی ہے جو دان مانگے کم ہے ؞

اچھی بابل میرا بیاہ رچا دو ؞

اچھی بابل مجھے مہندی منگا دو ؞

اچھی بابل میرا سنڈھا چھوا دو ؞

سب برہتوں کے بانس کٹواؤ - سب باغوں کے پھول پتے منگواؤ - مجھے سہاگ کی چوڑیاں پہناؤ - اپنی لاڈلی کو بھول نہ جاؤ - وہ تم ہی پر آسرا رکھتی ہے ؞

کاگا! میرا یہ سندیسا مدینہ نگری پہنچا دے - بھونرے! کلیوں کے رس کو چھوڑ - اور ذرا میرے من کی بپتا بابا جان تک لیجا - نسیم سحری میرے نامراد گھر میں کیوں چلی آتی ہے -

یہاں سب پھول مرجھائے ہوئے ہیں - اُلٹے قدم جا - اور طائف کے چمن والوں کو یہاں کی خزاکاریاں سُنا دے ؞

بجلی کے تارو - اگر تم میرے ہوم جا سکو تو، مائی ڈیر فادر کو میری خبر دیدینا ؞

ہم ہیں بالک ایک پتا کے

(از توحید - ۲۴ مئی ۱۹۱۳ء)

ہمارا باپ فقط آسمانی نہیں - زمین پر بھی وہی ہے ماں بھی وہی ہے - آخر بھی وہی ہے - دکھ میں بھی ہمارا باپ ہے - اور سکھ میں بھی ہمارا پدر بزرگوار تیرہ سو اکتیس برس سے وہ ساری دنیا کا باپ اور دنیا والے اس کے بچے ہیں - اسی واسطے اسکو رحمۃ للعالمین کا لقب دیا گیا ہے ؞

گورے کالے - نیلے پیلے - بے ترنگے - چھوٹے بونے - بھورے - پیٹ بھرے خاک پر سونے والے اور مخملی بچھونوں پر پاؤں پھیلانیوالے سب حجازی باپ کے فرزند ہیں انجیل کا آسمانی باپ اس کے قول کے موافق اپنے اکلوتے بچے مسیح کو سولی پر چڑھتا دیکھتا ہے اسکی فریاد سنتا ہے - جبکہ اس نے ایلی ایلی کہہ کر باپ کو پکارا - اور کہا، کیا تو مجھ کو بھول گیا مگر اسکو اپنے لاڈلے پر ترس نہیں آتا - یہاں تک کہ اسکا نورچشم سولی پر تڑپ تڑپ کر جان دیدیتا ہے ؞

ہمارا باپ آسمانی در معنی خدا کا بھیجا ہوا رسول اور بندہ ہے - ہمارے باپ میں اس کے خدا کی صفت رحمت سر سے پاؤں تک جھلکتی نظر آتی ہے - ہمارا باپ اپنی امت کے پاؤں میں پھانس کی کھٹک کو بھی گوارا نہیں کر سکتا اور بے چین ہو جاتا ہے ؞

ہمارے باپ کو مدینہ کی گلیوں میں بچے روک لیتے تو وہ ٹھہر جاتا، اور جب تک ہاتھ نہ چھوڑتے ٹھیرا رہتا، ہمارا باپ دو جہاں کا شہنشاہ تھا مگر غریب لاوارث عورتوں کا

سودا بازار سے لاتا۔ ان کے بوجھ کندھے پر اٹھاتا۔ بیماروں کی خدمت میں رات رات بھر جاگتا۔ اور اپنے بچوں کی خبر گیری کے لیے آبادی میں رہتا تھا۔ جنگلوں۔ پہاڑوں میں خلقت سے منہ چھپائے نہ پھرتا تھا۔ ہمارے باپ پر اس کے بچے عاشق تھے جب کافر تیر چلاتے اور تاک تاک کر ہمارے باپ پر نشانے پھینکتے۔ تو اس کے بچے ستر ستر تیر ڈھال بنکر اپنے جسم پر کھاتے تھے۔ مسیح کے بچوں کی طرح نہ تھے جنہوں نے تیس روپے کر اپنے باپ کو قاتل دشمن کے حوالے کر دیا۔ ہمارا باپ آدمی تھا ہمارا باپ بچوں سے انکی سمجھ کے موافق باتیں کرتا تھا مسیح کی طرح نہیں جو مچھلی والوں کے سامنے فلسفہ اور الہیات کی مشکل مشکل مثالیں دیتا تھا۔

ہمارا باپ بڑا۔ ہمارا باپ سب سے اچھا۔ ہمارا باپ سب کا باپ اور ہم سب اسکے بالک۔ تو آؤ اپنے باپ کو پہچانیں۔ در در کی ٹھوکریں نہ کھائیں۔ اپنے باپ کے گھر پر چلیں۔ وہ ہم کو یاد کرتا ہے۔ ہم بھی اسکو یاد کریں۔ اسکی محبت گود پھیلائے۔ ہندو مسلمان عیسائی موسائی سب بچوں کو بلاتی ہے۔ چلو باوا جان کے سینے سے چمٹ جائیں۔ پاؤں چومیں آنکھوں سے لگائیں۔ باپو۔ پتا۔ بابا۔ فادر۔ ابت کہہ کر جنت کے میوے اور پھول مانگیں۔

باپ کے گھر کا راستہ کدھر ہے۔ دیکھو کسی یتیم بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرو۔ اُس کی خبر گیری کرو۔ باپ کا گھر مل جائے گا۔ جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔ باپکے پاس جا پہنچو گے۔ لڑائی جھگڑے سے باز آؤ۔ مدنی بابا کا دروازہ ہاتھ آجائے گا۔ کسی سے نہ ڈرو۔ خدا کا خوف اپنے دل میں ہر وقت رکھو۔ اس کو ایک مانو۔ کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ اور اسکو اور اپنے باپ کو ہر چیز سے اچھا اور بڑا سمجھ کر محبت کرو۔ باپ تم کو اپنے گھر میں بلائے گا۔

ہم ہیں بالک ایک پتا کے جس کا پیارا پیارا نام محمدؐ ہے۔ اور جو خدا کی طرف سے ہم دنیا والوں کے لیے رحمت کا پیام لے کر اور رسول بن کر آیا ہے۔

سلام ہمارے باپ پر۔ سلام ہمارے رسولؐ پر۔ سلام ہمارے پتا پر۔ سلام ہمارے فادر پر۔ اور اس کے اصحاب اور آل صفا پر۔ سلام اس پر جس کی نسبت قرآن میں ما کان

محمدٌ ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین ارشاد ہوا۔ اور ہدایت کی گئی تھی کہ اپنے محمدؐ کو زید بکر اور دنیا کے نسلی باپ کی طرح نہ سمجھو۔ بلکہ رسول اللہ اور پیغمبری ختم کرنے والا مانو۔ لہذا ہمارا اس کو باپ لکھنا اور اپنے تئیں بالک سمجھنا محبت کا لفظ ہے ورنہ وہ رسول ہم اُمتی۔ ہمارے ماں باپ اس پر قربان ہوں۔

مدنی شیام سندر کی مُرلی

(از توحید۔ یکم جون ۱۹۱۳ء)

شیام نے مُرلی بجائی کس طرح — پڑ گئی گھر گھر دھائی کس طرح
ہر کی مُرلی ہر کے اندر باجتی — ہر کی ہے ہر سے رسائی کس طرح

زلفوں والے۔ پریتم پیارے۔ یثرب باسی۔ موہن کنہیا کی بانسری کے بلہاری۔ حجازی پربت میں کھڑے ہو کر ایسی بجائی کہ جنم جنم کے دکھ کلیش دور ہو گئے۔ روح۔ آتما۔ جیو۔ جسم بشریہ سب کو سرشار و پرکیف بنا دیا۔

مگر اب زمانہ گزر گیا۔ راتیں بیت گئیں۔ شیام سندر کی مرلی کی آواز سنائی نہیں دیتی جنگل کے ہرن باغوں کے مور۔ آم کی ٹہنی کی کوئل۔ سب اس پیاری اور سریلی صدا کی راہ دیکھ رہے ہیں جس کی کوک کلیجہ میں ہوک پیدا کرتی ہے۔ برسات کا موسم قریب آیا۔ کالی گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آئیں گی۔ اور کرشن کنہیا کی بانسری کو ڈھونڈیں گی۔ کوئی چاتر سمجھدار سکھی سہیلی ایسی نہیں جو شیام سندر کو سندیسا پہونچائے۔ اس سہانے بن میں بلکر لائے۔ پریم روپ موتی کانوں میں سندرے ڈلے۔ بانسری سے کر پھونکے اور نفخت فیہ من روحی کا جلوہ ظاہر ہو۔ شیام کی مرلی سننے کو جی ترستا ہے۔ رن کے بگل نرم۔ ہمارے حجازی موہن کی بانسری کے آگے ہیچ ہیں۔ کاش وہ پھر بجے۔ پھر گھر گھر دہائی مچے۔

آہا! وہ دیکھو، شیام سندر مرلی لئے بن سے نکلے۔ وہ ہمارے سیتاپتی تیر کمان سنبھالے نمودار ہوئے۔ اب کوئی دم میں مرلیا باجے گی۔ اور مینہ کی بدلی برسے گی۔ ندی نالے سوکھے تھے۔ گنگا جمنا پیاسی تھیں۔ گھٹ کے تیرتھ سونے تھے بھگتی کا تھا کال پڑا۔ ست کے گلے جنجال پڑا۔ اب سرگ کی ترشنا دور ہوئی۔ اور چنتامن کا فور ہوئی۔ اب ہر مہری کی آمد آمد ہے۔ سنسار کا داتا آتا ہے۔ اور ہر ہر کا جھنڈا لاتا ہے۔ بانس کی مرلی جو ہے یہ۔ اوڑپنگ کا مسطور ہے یہ ✦

حلقہ بگوشِ کا قلمی نذرانہ

خواجہ کے دربار میں

(از توحید ۸ جون ۱۹۱۳ء)

شاہوں کے شاہ۔ عرش پایہ گاہ۔ سلطان الہند اجمیری خواجہ کے دربار میں حلقہ بگوشوں کی نذریں گزر رہی ہیں۔ فقیر بے نوا خالی ہاتھ۔ خانماں برباد۔ اس قابل کہاں ہے کہ جہاں پناہ کے حضور میں کچھ پیش کر سکے ✦

ہند لولی داتا جانتے ہیں۔ بندہ حسن گدڑی پوشوں میں پیدا ہوا۔ مسکینوں میں پلا۔ گورِ غریباں میں جا کر سو جائے گا۔ زر و جواہر طلا و نقرہ کی نہ کبھی اس نے اپنے وجود کے لئے خواہش کی نہ دوسروں کو ان کی حرص دلائی ✦

خواجہ بابا اس شکل موہوم معدوم۔ ہستی نما کو پہچانتے ہیں۔ پندرہ برس گزر گئے۔ اخباری میدان میں خواجہ کے نام بلند کرنے کے لئے جس خیال سے نکلا تھا اسکی تعمیل میں کوئی دن کوئی رات۔ کوئی گھنٹہ۔ کوئی ساعت۔ کوئی منٹ خالی نہیں جانے دیا۔ آج اگر وہ میدان میں یہ رجز پڑھے کہ خواجہ اپنے غلام کو دیکھئے جس نے قلم کی آگ سے لاکھوں انی دل موم کر دیئے

بے شمار انکار کرنے والی ہستیوں کو درِ آستان پر جھکا دیا۔ تو ذرہ نواز خواجہ اظہار قدر دانی فرمائیں گے ✦

اخبار توحید کا خواجہ نمبر بھی اسی دیرینہ جانفشانی و خدمت گزاری کا نمونہ ہے۔ دنیا والے جس قسم کا شوق رکھتے ہیں۔ اور جن طریقوں سے بات کو سننا چاہتے ہیں کلموا الناس علیٰ قدرِ عقولھم پر عمل کر کے اسی پیرایہ سے گفتگو کی جاتی ہے ✦

نمبر کا لفظ خواجہ کے بزرگ اور پاکیزہ نام نامی کے ساتھ بھدا اور بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ یہ بھی نئے زمانہ کی رسم ہو گئی ہے۔ عہد انگلش میں ہے۔ ہر چیز کے اندر نمبر

لہذا لفظوں سے چشم پوشی کر کے ان معانی کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ جن کی اشاعت اس دورِ جدید میں لازمی اور ضروری ہو گئی ہے۔ خواجہ نمبر اخبار توحید کی اور اس غلام بے زر خرید کی قلمی نذر ہے۔

بندہ حسن بصد زبان گفتہ کہ بندۂ توام　　　　تو بزبانِ خود بگو بندہ نواز کیستی!

خواجہ اور ان کے درباریوں میں یہ نئی روشنی کا نذرانہ لیجاتے ہوئے حجاب آتا ہے مگر حقائق شناس بارگاہ۔ ضمائر آگاہ سرکار۔ اپنے حلقہ بگوشوں کی نیت سے خبردار ہے۔ لہذا کمال ادب و عقیدت کے ساتھ یہ قلمی گلدستہ پیشکش کیا جاتا ہے۔ پھول پراگندہ ہیں۔ افسردہ اور بے رنگ ہیں۔ لیکن خواجہ کے دربار میں اچھے برے سب کھپ جاتے ہیں۔ سب پر نظر الطاف رہتی ہے ✦

عالم پناہ سلطان۔ اس ناچیز نذر کو قبول فرمایئے۔ اور اس میں ایسی برکت و تاثیر عنایت کیجئے کہ جو کچھ سید حا سادا کی تجنہ میں پہنچ جائے۔ تا کہ خاکبوس آستانہ کی محنت ٹھکانے لگے۔ اور کسی وحدت کی ڈگر پا مل جائے۔ اور

قلزمِ مضمون ہے اخبار میں　　　　ناؤ کاغذ کی چلے منجدھار میں

اجمیری پہاڑ کا بولنا

از توحید ۸ جون ۱۹۱۳ء

اجمیر کے اونچے پہاڑ نے جو رات دن خواجہ کے روضہ کو دیکھتا رہتا ہے ہندوستان والوں کو خطاب کرکے زبان حال سے کہا :-

میں سنگدل پتھروں کا پہاڑ ہوں۔ مگر اے آدمی۔ میرا دل چشمے بہاتا ہے میں سختی میں ضرب المثل ہوں۔ لیکن اے نرم مزاج کے مدعی انسان! تجھ سے زیادہ دوسروں کے کام آتا ہوں۔ میں اجمیری ہوں، میری بات سُن۔ مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ۔

طُور میرا بھائی تھا جس پر خدا نے حضرت موسیٰ کو بلا کر پیغمبری دی۔ **جُودی** بھی میرا ہم جنس تھا۔ جہاں حضرت نوح کی کشتی نے قرار پکڑا۔ وہ میرے ہم قوم پہاڑ کا غار تھا۔ جہاں حضرت ابراہیمؑ نے چاند ستاروں اور سورج کو دیکھ کر خدا کا عرفان حاصل کیا۔ بیت المقدس کا نورانی پہاڑ بھی مجھ جیسا پتھریلا تھا۔ جہاں حضرت عیسیٰ نے کلمۂ الٰہی کا وعظ کہا۔

اس کے آگے کچھ اور کہوں تو سُن سکیگا۔ تجھ میں تاب اور برداشت ہے حضرت موسیٰ کی طرح بیہوش تو نہیں ہو جائے گا۔ اچھا تو آ۔ تجھ سے وہ بھی کہوں۔ حجاز کا نام سامنے لا۔ وہاں بھی میرا ہمشکل کالا کلوٹا۔ سوکھا پہاڑ ہے۔ جس کی آغوش میں ایک تروتازہ پھول کھلا جس کی وادی میں ایک گیسو دراز نے لکڑی کندھے پر رکھ کر بکریاں چرائیں جس کے اوپر چڑھ کر اس نے اپنی قوم کو پکارا۔ اور خدا کے غضب سے ڈرایا۔ یہ وہی پہاڑ ہے جس کے نیچے اس نے گھر چھوڑ کر راستہ چلا۔ اور ہجرت کرکے مدینے پہنچا۔ اسی پہاڑ کے دامن میں اس نے حق کا پیام ختم کرکے آرام فرمایا۔

ذرا آنکھ بند کر تاکہ دل کی آنکھ کھلے۔ اور دیکھ یہ سبز گنبد کس کا ہے۔ یہ اس کے چاروں طرف اونچی اونچی کالی دیواریں کس کی ہیں۔ یہ سب پہاڑ ہیں۔ مجھ جیسے پتھر ہیں جن کی چوٹیوں پر خدا کی تجلیاں نازل ہو رہی ہیں۔ اس پہاڑ کی یاد میں مسلمان فاتحوں نے زمین کے سب بلند مرتبہ والے پہاڑ فتح کر لیے۔ اور ہندوستان کا کوہ ہمالہ بھی ان کے آگے جھک گیا۔ بس یہی میں اجمیری پہاڑ ہوں۔ مدینہ میں حجازی پہاڑ سبز گنبد دیکھتا ہے۔ اجمیر میں مجھ کو سفید گنبد اسی وضع قطع کا نظر آتا ہے۔ مدینہ میں حجازی پہاڑ کو لاکھوں مشتاق پروانہ وار

فانوس سبز

کے گرد چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ اجمیر میں میری آنکھ بے شمار فدائیوں کو حجاب سفید کے آس پاس بے قرار مشاہدہ کرتی ہے۔ جو مدینے میں ہے۔ وہی یہاں ہے غفلت چھوڑ۔ آنکھیں مل۔ منہ دھو۔ اور ہوش ٹھکانے کرکے دیکھ۔ کیا جلوے ہیں۔ کیا شانیں ہیں۔

دیکھنے سے فارغ ہو تو **مدنی جبل** کی یاد میں تو بھی ہاتھ پاؤں ہلا۔ اور اپنے اجمیری پہاڑ کی عزت کو بلند کر۔ میرے تارگڈھ کو اُمید کا ستارا بنا۔ میرے چلّے کو کمان توڑ کر تیر اندازی کی کمان میں ڈال۔ اور نفس وخودی کے لشکروں پر تیر برسا۔ اِدھر آ۔ اُدھر جا۔ اس کو کھا۔ اس پر تیر چلا۔ کمان جس طرف چاہے کھینچ۔ مگر تیر کا نشانہ ایک ہی رکھ۔ تاکہ خود فراموش دشمن نفسانی چلا اٹھے۔ اور کہے ؎

کماں جانب دیگرے می کشد
ولے تیر بر جان ما می زند

آیار! چلکے دیکھیں برسات کا تماشا

(از توحید - یکم جولائی ۱۹۱۳ء)

والضحیٰ - واللیل - والرعد - والبرق - چمک - کڑک اور گھنگھور گھٹاؤں کی قسم - برسات کا موسم آگیا - جون کی گرمیاں گئیں - جولائی کی سیرابیاں نمودار ہوئیں - سمندری مانسون ہوائی جہاز پر اڑا چلا آتا ہے ۔

کیوں رے ابر تو آیا - میرے پیارے کو نہ لایا - تیری بوند بوند میں ایک روح ہے تیرے قطرے قطرے میں ایک جان ہے - اب مردہ مٹی زندہ ہوجائے گی - کروڑوں جانور حرکت کرنے لگیں گے - چراغوں اور برقی لیمپوں پر ان کی یورش ہوگی - چراغ کہے گا - پروانے! مجھ پر کیوں گرا پڑتا ہے؟ پروانہ جواب دے گا کل جہاں تھا وہ نورانی مقام تھا - آج دنیا میں آیا تو اس کو تاریک پایا - تجھ کو دیکھا تو سمجھا کہ تو میرے وطن روشن کا نشان ہے - اس لئے تجھ سے گلے ملتا ہوں - ملنے دے - ناراض نہ ہو - بادلو! ذرا ٹھہرنا - دیکھو ایشیا میں - اور مسلم کے دل تشنہ کام میں بھی تم جا سکتے ہو یا نہیں - اگر نہیں تو جاؤ میں تم کو نہیں مانگتا ۔

برسات وہ اچھی جس میں یار ساتھ ہو - ورنہ ہیچ - قسم ہے گھونگروالے بالوں کی بادلوں کے پیچ وخم مسلمانوں کے پیچیدہ احوال سے زیادہ نہیں ہیں - قسم ہے کوندنے والی بجلی کی - مسلمان کی بے قراری بہت بڑھ گئی ہے ۔

کوئی یار نہیں - کس کو برسات کا تماشا دکھائیں - کون سمجھے کہ جولائی کی برسات میں کیا بہار ہے - مور بولتے ہیں - کوئل کی آواز آرہی ہے - مینڈک تالابوں میں کچھ پکار رہے ہیں - میرا یار ہوتا تو وہ بھی ان کا مزا لیتا - نہیں بلکہ وہی اس کا لطف اٹھا سکتا تھا ۔

یہ سب تماشائی بندۂ حرص وہوس ہیں - اسیر مجاز ہیں - میں جس یار کو تماشا دکھانا چاہتا ہوں - وہ مجذوب ہے - دیوانہ ہے - سالک ہے - ہوشیار ہے - وہ دیکھتا ہے اور دکھاتا ہے - سنتا ہے اور سناتا ہے - آج وہ آجائے تو بادلوں سے پانی نہ برسے کچھ اور برسے کچھ اور بہار ہو - کسی دوسری چیز کی کیچڑ نظر آئے ۔

پیاسی زمین کی قسم - گرمی اور گھمس کی قسم - دھوپ اور لو کی قسم ۔

افق حجاز

ہر ایک بادل نظر آتا ہے - جو شاید گرج رہا ہے - اور ادھر کو بڑھ رہا ہے - میں اس میں حیات اور ممات کے کرشمے دیکھتا ہوں - مجھ کو اس کی آمد کا یقین ہے - وہ طوفانی رفتار سے سیلابی انداز سے - غیبی پردوں سے اڑتا ہوا نظر آتا ہے ۔

اگر یار سوتا ہے تو اس کو جگا دو - اس کا تماشا دیکھے یہ برسات بار بار نہیں آتی - اور کہو - آیار چلکے دیکھیں - برسات کا تماشا - دن رات کا تماشا - اسرار کا تماشا - اغیار کا تماشا - ایک وار اور سب مل کے ترک کردیں گھر بار کا تماشا ۔

ٹھنڈا سانس

کھجور کی ٹہنی کے نیچے

از توحید - ۸ جولائی ۱۹۱۳ء

میرٹھ میں شام تھی - ابر تھا - ہوا کا سکوت تھا - آسمان و زمین پر اداسی تھی جھینگروں کا شور تھا - مینڈک جگہ جگہ بول رہے تھے - میں نے کھجور کے نیچے کھڑے ہو کر قدرت کے اس نظارے کو دیکھا - اور میرے سینے نے ایک ٹھنڈا سانس باہر بھیجا ۔

زمین کہتی تھی۔ میں ٹھنڈی ہوں۔ بارش کے پانی نے مجھ کو سیراب کر دیا۔ دیکھو میرے جسم پر پانی بہنے کے نشان پڑے ہوئے ہیں جو بل کھاتا ہوا مجھ پر سے گزرا ہے۔

چھوٹی چھوٹی گھاس کے سبز تنکے خاک سے منہ نکالے مجھ کو دیکھ رہے تھے۔ ہرے درختوں کی شاخیں مستانہ شباب کے عالم میں مخموری کی شان سے سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھیں۔ کمپنی باغ کے تختۂ چمن میں لال۔ نیلے۔ سفید۔ رنگ برنگ کے پھول شام کے ڈراؤنے وقت سے سہمے جاتے تھے۔ اور پتوں میں منہ چھپا کر تاریکی کی چادر بدن پر کھینچے لیتے تھے۔ ان سب کو دیکھ کر میری آنکھ نے پھر کھجور کی ٹہنی کو دیکھا جو

بانکی تلوار

کی شکل اونچے درخت کے گلے میں لٹکی ہوئی تھی۔ سینے میں پھر ایک شورش ہوئی اور اس نے ایک ٹھنڈا سانس نکال کر مجھ کو دیا۔

ہاں۔ آج کے دن اس موسم میں۔ سب مخلوق شگفتہ اور خوش حال ہے۔ مگر ابن آدم اپنے دل کی گرمی میں بھنا جاتا ہے۔ اس کو باطنی سوز جلائے ڈالتا ہے۔

جھینگر اور مینڈک نغمہ سنجی میں مصروف ہیں۔ اپنی زندگی کے مزے لے رہے ہیں۔ آدم زاد کیا کرے۔ جس کو یہ زندگی وبال معلوم ہوتی ہے۔ وہ کیونکر واہ کہے۔ اس کو آہ کے مقام سے فرصت نہیں ملتی۔ میں نے کھجور کی ٹہنیوں کو نظر بھر کر دیکھا اور کہا تم اس اجنبی ملک میں کیوں؟ بہت دن نہیں گزرے مدینہ حجاز میں باب رحمت کے سامنے والے گھر میں تم کو عالم رویا میں دیکھا۔ تمہارے سایہ میں میرا سلطان جس کا سکہ دونوں جہان میں چلتا ہے کھڑا تھا۔ اس کے بدن پر افغانی لباس تھا۔ اس کے سامنے شکستہ دلوں کے ڈھیر تھے۔ وہ تمہارے پتے توڑ توڑ کر ان دلوں کو باندھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

میری امت کے دل ٹوٹ گئے ہیں۔ ان کو باندھتا ہوں۔ آ تو بھی باندھ۔

یاد تھا۔ وہاں تھا۔ یا یہ ادھر یہاں؟ گرم سانس والے اب یہاں نہیں رہے۔ کھجور کی ٹہنی! میرے ٹھنڈے سانس پر سایہ نہ ڈال۔ میں مسلم ہوں جس کا سینہ گرمایا ہوا ہے۔ مگر ٹھنڈا سانس نکلتا ہے۔ میرا دل بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ مگر اس کے زخم کی بندش حجازی کھجور کے پتے سے ہو سکتی ہے۔ تو میرے ٹھور میں ہے۔ کیونکہ تیرا پتا اس جراحت درونی کے کام آسکتا ہے؟

موسم برسات ہے۔ مخلوق خدا کے دل امنگوں کے سانس لے رہے ہیں۔ دیکھو مینڈک کیسی بے فکری سے گن گناتا ہے۔ جھینگر کس اطمینان میں گاتا ہے۔ مجھ کو قرار ہو تو میں بھی ایک نغمۂ مستانہ کی لے بلند کروں۔ مگر ٹھنڈے سانس کا کیا علاج۔ وہ بار بار آتا ہے اور کہتا ہے کہ تیرا دل بے چین ہے۔ تو برسات کی بہار نہ دیکھ۔ پہلے اس کو ہاتھ میں لے۔ اور حجازی شفاخانے میں لے جا کر جہاں افغانی لباس والا

ربانی سرجن

اس کی مرہم پٹی کرے گا۔ اس کے بعد تو بھی شام کی دلگیری میں برساتی ترانے کا مزا دیکھیو۔ اب تو فقط تو ہے اور ٹھنڈا سانس۔ امید ہے اور اس میں خوف و بیم کی پھانس۔

عید گاہِ ما غریباں کوئے تو

(از توحید۔ ۳۔ ستمبر ۱۹۱۳ء)

عید کے چاند نے کہا۔ مجھ کو دیکھو مدنی محبوب کے ابرو کا خم اسی شکل کا تھا آسمانی کنارے کی شفق بولی۔ اور رخسار کی رنگت دیکھنی ہو تو مجھ پر نظر ڈال لو۔ اس میں کچھ اسی قسم کا روپ تھا۔ سامنے سے تاریکی دوڑ کر آئی۔ اور شرما کر کہنے لگی۔ گیسو مجھ سے ملتے جلتے تھے شام کے منظر ابھی کہہ چکے تو صبح کا نور بھی چمکا۔ اور زبان شعاعی میں گویا ہوا۔

اپنی تجلی کی قسم روئے محمدؐ کا میں آئینہ ہوں۔ اس کی زبان درازی بجلی کی طرح گری۔ وجود عشق باز بیتاب ہوگیا۔ اور کلیجہ تھام کر عیدگاہ کی جانب چلنے لگا۔ وہاں کچھ سائل تھے۔ کچھ مسئول تھے۔ کچھ اُجلے تھے۔ کچھ میلے تھے۔ آنکھ نے کہا۔ غریبوں کی یہ عیدگاہ نہیں ہے دل نے کہا نماز کا مقام قریب ہی ہے۔ تو اگر نیاز کی عیدگاہ تلاش کرتی ہے تو حجاز میں جا۔ یثرب کو دیکھ۔ چند پیچیدہ گلیاں نظر آئیں گی۔ ان کی دیواروں پر راندۂ نیاز کے سائن بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہو جائے گا کہ مقصود کہاں دستیاب ہوتا ہے ۔

غریبوں کی عیدگاہ مہربان ہوئی۔ اور اس کے امام نے جھک کر گلے لگانا چاہا۔ مگر مشتاق سینے نے کہا۔ نیاز مندی کا ناز قدموں سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ مجال نہیں کہ سرکار کے سینہ تک بڑھنے کی جرأت کر سکے۔ یہ ادب پسند کیا گیا اور ارشاد ہوا۔ دیوانو یہ قدم ہمیشہ تمہارے رہیں گے، تمکو عید مبارک بے قراروں نے جواب دیا۔ ؎

عیدگاہ ما غریباں کوئے تو   انبساط عید دیدن روئے تو

پیا اجمیری

ہستی کے مست

(از نظام المشائخ۔ جون ۱۹۱۴ء)

فطرت جسکو آجکل نیچر کہتے ہیں۔ قدرت جس کا نام اس زمانہ میں عادت طبعی ہوگیا ہے۔ اجمیری پہاڑوں میں ہست تھی۔ مگر مست نہ تھی ۔

نیچر کی مستی پہاڑوں کی ہستی میں سکوت ہے۔ سمندر اور دریاؤں میں شور و روانی ہے۔ جمادات میں پابندی ہے۔ نباتات میں شگفتگی اور سرسبزی ہے۔ حیوانوں میں

حرکت خود اختیاری ہے۔ اور انسانوں میں ہوشیاری و دلفگاری۔ دلداری و جفا شعاری ہے۔

اجمیر کے جمادات۔ نباتات۔ حیوان۔ انسان۔ سات سو برس پہلے ہست تھے شکلیں رکھتے تھے۔ لیکن روز الست کے مست خواجہ پیا کے قدم آنے سے مستی میں آگئے۔

مستی کے دم سے بنی ہے چشتی خواجہ کا اس سنسان خاکستان میں پاؤں رکھنا تھا۔ کہ کوہستان کے ہر ننھے سے پھول میں دنیا جہان کی آبادیاں نظر آنے لگیں۔ جو کلی کھلی کھلکھلا کر ہنسی۔ اور اپنے اندر کی بستیاں نازک پتیوں پر دکھانے لگی۔

چنبیلی کے پھول پر شبنم

خواجہ پیا۔ موہن سیاں۔ کالی کملیا کاندھے پر ڈالے۔ وحدت کی بانسری ہاتھ میں لئے جب اس بیابان میں جلوہ افروز ہوئے تو ایک چنبیلی کے پھول نے اپنی ہری بھری ٹہنی میں جھوم کر خواجہ پیا کے چرنوں پر سر جھکایا اور اپنے سینہ و گردن کے موتیوں کے شبنمی ہار کو ادب سے نذر چڑھایا۔ اور کہا۔ پالاگن مہاراج۔ ایک رات کی عمر والی ہستی آپ پر قربان۔ میری بپتا سنتے جائیے۔

میں ذرات خاک کا مجموعہ ہوں۔ فطرت و نیچر نے ہست ہونا چاہا تو مٹی سے سر نکالا۔ شاخیں بڑھائیں۔ پتے پھیلائے۔ کانٹے چنے۔ اور پھر ایک دن شام کو سبز فام ننھی کلی کی صورت نمودار کی۔ وہ رات ارمانوں کی رات تھی۔ اندھیرا بڑھتا جاتا تھا تو کلی سبزی سے سفیدی کی جانب بڑھتی تھی۔ بند پتیوں میں سرگوشیاں ہوتی تھیں۔ ہر پتی دوسری پتی کے سینے سے لگتی اور کہتی ؎

غنیمت جان اس مل بیٹھنے کو   جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

اُس شب ہر ذرہ گل میں خمار تھا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ہر پتی میں کس کثرت سے ذرّے

تھے۔ اور ان سب کی مخموری سے میرے سرور کا کیا عالم ہوگا۔

میں نے سمجھا کہ زندگی بڑے مزے کی چیز ہے۔ کھلنے کا وقت آرہا ہے۔ اور شباب اپنا گھر بنا رہا ہے۔ ابھی وجودِ کل کی پیکر پوری تیار بھی نہیں ہوئی ہے۔ اور جذبات کی رنگا رنگیاں لذتوں کا مینہ برسانے لگیں۔ جب سب کچھ تیار ہو جائے گا تو خدا جانے کیا مزا آئے گا۔

اسی اثنار میں مرغ نے صدا بلند کی۔ مندر کا گھنٹہ بجا۔ نسیمِ سحر آنکھیں ملتی اور مستی میں لڑکھڑاتی نمودار ہوئی۔ اور ہمارے درخت کے بدن میں گدگدیاں کرکے آگے بڑھنے لگی مجھ کو بے اختیار ہنسی آئی۔ مگر ہنسنے کی دیر تھی۔ ایک ہی جنبش میں پتیاں کلی کی ہم آغوشی سے جدا ہو کر تھرتھرانے لگیں۔ اور صبح صادق کے افق کو سامنے دیکھ کر شرمانے لگیں۔

اب کیا تھا آسمانی نور نے زندگی کا دوسرا دور دکھانا شروع کیا۔ آس پاس کی جھاڑیوں سے چھیڑ چھاڑ ہونے لگی۔ ہوا نے ہمارے شباب کی مستی کو اپنے دامنوں میں بھر کر چپ چاپ جنگل میں بکھیرنا شروع کیا۔

یہ زمانہ ختم نہ ہوا تھا کہ آسمان کی آنکھ کا آنسو قطرۂ شبنم کی شکل میں مجھ تک آیا۔ اور کہا۔ پھول! مجھ کو جگہ دے کہ فلک نے نظروں سے گرا دیا۔ میں نے ہاتھوں ہاتھ اس کو لیا۔ مگر میرے ذرات نے اس کو جذب کرنے سے انکار کیا۔ بیچارے کو اُدھر ہی کے کنارے ٹھہرائے رکھا۔

اتنے میں سورج نکل آیا۔ کرنوں نے شبنم کو چھیڑنا شروع کیا۔ اور بیچاری بوند کا گھڑی بھر ٹکنا دو بھر کر دیا۔ آخر وہ گھبرا کر موت موت پکارنے لگی۔ اور میرا دل موت کا نام سن کر سہم گیا۔ میں نے خیال کیا۔ تو کیا مجھکو بھی موت آئے گی۔ اور ان ولولہ خیز خوشیوں کو خاک میں ملائے گی۔

یکایک آپ کے جمالِ باکمال پر نظر پڑی۔ شبنم کا قطرہ جلدی سے آپ پر تصدق ہو گیا۔ مجھے بتائیے کہ میں کیونکر قربان ہوں کہ اس موت کے کھٹکے سے نجات پاؤں۔

خواجہ پیانے گلابی، مستانی آنکھ سے اس فریادی پھول کو دیکھا۔ اور رخ پھیر لیا نظروں ہی نظروں میں کیا کہہ دیا۔ کہ پھول مستی میں آگیا۔ اور بولا پالیا۔ مل گیا۔ یہ زندگی کیا چیز ہے۔ اس نگاہ پر سب کچھ نثار۔ میرے پیا۔ میرے پیا۔ تو ملا تو سب کچھ ملا۔

پیکرِ امکان کیوں دلگیر ہے؟

(از نظام المشائخ۔ دسمبر ۱۹۱۴ء)

لامکان نہیں مکان۔ مکان نہیں مکین۔ مکین نہیں کُن کا ہدف جسکو کون دیکھو کہتے ہیں۔ جس نے اپنا گلا قوتِ ایجاد کی چھری سے کٹوایا۔ اور پھر مخلوق کے آگے بڑھ کر آزمانا کہلایا۔ یہی پیکرِ امکان کا کائناتِ شادماں و فرحاں میں اسیرِ پنجۂ دلگیری ہے۔ اسی کو وحدت نے فرقت کی شکل بنکر ستایا ہے۔ یہی کہتا ہے آہی ہجر میں کلیجہ منہ کو آیا ہے۔

چیونٹی رفیقِ زندگی کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ کبھی اپنے جوڑے کے ہمراہ اُڑتی پھرتی ہے۔ بگلا دریا کے کنارے دوئی کی بہار سے سفید ہے۔ کوا گھر کی دیوار پر اپنے مونس کو لئے بیٹھا ہے۔ اور کالی رنگت پر فخر یہ چہچہاتا ہے۔ ریل کے پہیے آہنی ہم جنس سے گلے مل کر چلتے ہیں۔ پھول ایک دوسرے کو دیکھ کر کھلتے ہیں۔ پانی کے قطرے کیسے ملے ہوئے ہیں۔ ہوا کے ذرے کس طرح آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ پہاڑوں کی بلندی سنگی ذرات کی باہمی ہمنشینی سے ہے۔ دریاؤں کی روانی پانی کے میل جول سے ہے۔ چاند تاروں کو لیکر چمکنے آتا ہے۔ سورج شعاعوں کے حلقہ میں موج اُڑاتا ہے۔ خود اُسکو دیکھو جو خدا ہے۔ ہر ہے۔ ہر میں ہے۔ اور پھر کہنے کو سب سے جدا ہے جبکی

وحدت و یکتائی کی گہر گہر دھوم ہے۔ جو نہ مانے اس کے لئے خطاب احمق و شوم ہے۔ وہ بھی اکیلے پن سے اُکتاتا تھا۔ دیکھنے دکھانے کی ہوس میں خاک کے پتلے بناتا تھا۔

آدمؑ کو خلیفہ کہا۔ دیکھا دکھایا۔ نوحؑ کو۔ ابراہیمؑ کو۔ موسیٰؑ کو۔ عیسیٰؑ کو۔ اُن کے زمانے میں محرم راز بنایا۔ ابراہیمؑ سے کہا میرا خلیل ہے۔ موسیٰؑ کو آگ کے بہانے پاس بلایا اور کہا تو کلیم ہے۔ کچھ اور ترنگ آئی۔ دل لگی کی ٹھہرائی۔ بولا۔ جوتیاں اُتار دے اور سانپ سے کھیل۔ جی بہلا۔ اور فرعون سے لڑ۔ مٹی کی مورت اپنے بنانے والے کی مہربانیاں دیکھ کر اترائی۔ اور صورت دیکھنے کی صدا لگائی۔ کہا کہ تو دیکھ نہیں سکتا۔ اور پھر جلدی سے ناسوتی آنکھ کے سامنے لاہوتی جلوہ نمودار کر دیا۔ تاب کہاں سے آتی۔ پتلا سینہ تھام کر رہ گیا۔

عیسیٰؑ کو اپنی روح کہہ کر پکارا۔ عالم تعین میں پھنسا کر مُردے جلائے۔ پھر کہا کہ تیرے بعد اس کی باری ہے۔ جو محبوب جناب کردگاری ہے۔ محمدؐ نام۔ محمدؐ کام محمود سر انجام۔ رفیق اعلیٰ۔ رفیق ظاہر۔ رفیق باطن۔ معراج میں بلایا۔ دو کمانوں یا اس سے بھی تنگ فاصلہ پر ٹھہرایا۔ کچھ کہا۔ کچھ دیکھا۔ کچھ دکھایا۔ اب تیرہ سو برس سے خبر نہیں کیا کرتا ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ کس شغل میں مشغول ہے۔ مسرور ہے۔ یا ملول ہے۔

مگر مجھے اس سے کیا۔ وہ خوش ہو یا ناخوش۔ وہ تو عین ذات میں سرشار ہے۔ مشکل میں میرا آزار ہے کہ عالم امکان و تعین کی تصویر ہوں۔ وحدت کے ہاتھوں ہجر و فراق میں اسیر ہوں۔ جب اس نے اپنی واحد خوشی کو اکیلا نہ رہنے دیا۔ اور صفاتی شکلیں جی بہلانے کو بنائیں جب اُس نے ہر موجود کو اس کا ہم جنس وجود دیا جبکہ اس کی نیچر اس بات کی رفاقت میں دی گئی۔ جبکہ اس کی قدرت حیلہ و وسیلہ کی دست نگر ہی تو میں کیوں اکیلا ہوں۔ میری دلگیری ختم کیوں نہیں ہوتی مجھکو میرا دلدار کیوں نہیں ملتا۔ حجاز کتنی دور ہے۔ کھجوروں کے باغ کتنے فاصلے پر ہیں۔ وہ مقام کہاں ہے۔

جہاں سرور عالمؐ شکستہ دلوں کو کھجوروں کے پتوں سے باندھتے تھے۔ میرے پاش پاش دل کا مرہم انہیں کے پاس ہے۔ یہ زخم انہی کے نشتر سے چیرا گیا۔ وہی پٹی باندھیں گے۔ کوئی چارہ ساز ہو یا نہ ہو۔ کوئی دلنواز ہو یا نہ ہو۔ مدنی شیام سُندر کی یاد کافی ہے۔ جبکہ اُس کی آس ہے تو پھر کیا ہراس ہے۔ میری آنکھوں کے خالی کٹورے آنسوؤں کی لبریزی مانگتے ہیں۔ میرے سینے کے خالی پھوڑے محمدیؐ آرام جان چاہتے ہیں۔

میں نہیں۔ ایک اسیر دست بیداد فریاد کرنے کھڑا ہوا ہے۔ سب سہاروں کو قطع کر کے ایک سبز گنبد کے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے۔ دیکھئے۔ دل کی گرہ کون کھولنے آتا ہے۔ درد بھی اُس حکیم کے گھر جانے کے وقت ملا تھا۔ علاج بھی وہیں ہو گا۔ فرقت بھی اس کوچے کی گردش میں پالے پڑے تھی۔ وصال بھی اس گلی کی ٹھوکریں کھانے سے میسر آئے گا۔ اسیر ہوں۔ دلگیر ہوں۔ اُفتادہ پامالی رہ گیر ہوں۔ حیات کا مجاز ہوں۔ ممات کی حقیقت ہوں۔ حرکات کا عکس ہوں۔ بے اختیاری کا سایہ ہوں۔ محمدؐ محمدؐ تیرے دروازہ پر آیا ہوں۔ یا اُس کو ملا۔ یا تو مل جا۔

پردیسی یتیم دیکھی تمہاری پریت

(از نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۵ء)

اُس کے لئے میں۔ میرے واسطے وہ۔ دونوں اجنبی اور پردیسی تھے۔ فاصلہ کچھ بڑا نہ تھا۔ بس اتنا تھا کہ تین بار پلک جھپکے۔ میں اس کا وہ میرا۔ یتیم کہلایا اس نے مجھے میں نے اس کو اپنا بنایا۔ اِن دنوں سورج مشرق ہی سے نکلتا تھا۔ اور دریاؤں میں خاک کی جگہ پانی ہی بہتا تھا۔ جب تک سمندر میں آتشی طوفان کا ذکر سننے میں نہ آیا تھا۔ ہر چیز اپنی تھی۔ کوئی بھی پرایا نہ تھا۔

ایک رات کھجور کی ٹہنیوں میں ہوا جھولا ڈالنے آئی۔ اور بیری کی شاخوں میں کبھی جھنجھنائی۔ دل سرشار تھا۔ تخیل مستغرق۔ بحر ناپیدا کنار تھا۔ ہوا کو مدہوشی اور بکھی کے سامنے مستی نہ رکھی۔ اس بات سے خدا ناراض ہو گیا۔ اور اس نے اپنے جہان کا رُخ میری طرف سے بے رُخ کر دیا۔

میں نے کہا۔ دنیا بے رُخ ہو جائے۔ میرا پردیسی پیتم رُخ نہ پھیرے۔ پیارے پیتم نے میرے قول کو چوم لیا۔ اور قول کے جسم کو سینے سے لگا لیا۔ خدا کو ہم دونوں کی محبت پسند آئی۔ اور اس نے توبہ کے دروازے کھول دئے۔ سورج نے کہا۔ میں مغرب سے نکل آؤں گا۔ اس وقت یہ در بند کرنا پڑے گا۔ پردیسی پیتم نے اپنے رخسار کو سورج کی جانب موڑا کہ کچھ کہے۔ سورج بن کہے شرما کر پیچھے کو ہٹ گیا۔ میں نے کہا پیارے تمہارا سنہ ہے یا شمس الضحیٰ۔ اس نے جواب دیا برزخ کبریا۔ میں نے کہا تو لاؤ تم کو سجدہ کروں۔ بولا خبردار انا بشر مثلکم میں نے کہا اور وحیٰ یوحیٰ ہنسکر خاموش ہو گیا۔ شرما کر نظریں جھکا لیں۔

کیا لطف کی راتیں تھیں۔ کیا مستی و سرور کی گھاتیں تھیں۔ کیا باہیں تھیں۔ کیا گردنیں تھیں۔ جو ہم آغوش ہوتی تھیں۔ کیا لمبے بال تھے۔ جو اُلجھتے تھے۔

مگر دیکھو تو۔ وہ پردیسی روٹھ گیا۔ میں تو لڑا نہ تھا۔ وہ کیوں خفا ہو گیا۔ اونٹوں کے قافلے میں کہیں چھپا ہے۔ چاند مُسکراتا ہے۔ کیا اسی کے اندر گیا ہے۔ تارے کھلکھلا کر ہنس رہے ہیں۔ اور ان میں ہو بہو اُس کی ضیا ہے۔ ہاں یہیں ہو گا۔ اُن کو توڑ لو آسمان سے جدا کر دو۔ زمین پر رکھ کر ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھو۔

نہیں سنو۔ یورپ کے میدانوں میں گرج کی آواز آتی ہے۔ اُس کو جنگ کی زمین بہت بھاتی ہے۔ شاید وہاں جا نکلا ہو۔

ادب سے پکارنا۔ وہ فیلڈ مارشلوں کو نقشے بتاتا ہو گا۔ خندقیں کھدواتا ہو گا

زخموں کی مرہم پٹی کرتا ہو گا۔ لاشوں کو دفنانے کی فکر میں مصروفیت ہو گی۔

کیوں پردیسی تم یہاں ہو۔ اور ہو تو کس کیمپ میں۔ اتحادیوں میں یا بیداویل میں۔ جرمن میں یا انگریزی خرمن میں پرو۔ من جاؤ بس ناراضی ہو چکی۔ میں نے مانا کہ اُمت کی لاشوں کو یورپ میں دیکھنے گئے ہو۔ مگر اپنے اُس کو بھی ساتھ لیا ہوتا جو ایک دم کو جدا نہ کیا جاتا تھا۔ نہ بولو گے تو ہم بھی بولنا چھوڑ دیں گے۔ نہ آؤ گے تو ہمارا بھی آنا جانا بند ہو جائے گا۔

پیتم پیتم۔ پیارے۔ راج دلارے۔ میاں کہاں ہو۔ ذرا تو ترس کھاؤ اور جواب دو۔ آسمان چہارم کے عیسیٰ تک تمہاری خاموشی سے بے قرار ہیں۔ فرشتے اُن کی آہ و زاری سے بیزار ہیں۔ مگر مجھے ان سے زیادہ اپنی فکر ہے۔ وہ تو اُمت کی سفارش کے لئے تم کو ڈھونڈتے ہیں۔ اور میں فقط تمہاری دید چاہتا ہوں۔

نہیں بولتے۔ دروازہ نہیں کھولتے۔ کیسے دلدار ہو۔ کیونکر کہوں کہ جفا شعار ہو تم نے کبھی جفا نہ کی تھی۔ آج کیا ہو گیا۔

اُفوہ۔ میری بے صبری۔ میری بچپنی۔ کیا یہی اقرار تھا۔ کیا اسی سلوک کے قابل یہ گنہگار تھا۔ اگر سزا لائق دار تھا۔ تو یہاں کسے انکار تھا۔ مگر جدائی کی سزا خلاف تہذیب قانون بین الاقوام عشق ہے۔ یہ بڑی وحشیانہ پاداش ہے۔ ہائے اب بھی رحم نہ آیا۔ نہ خود بولے نہ کسی قاصد نامہ بر کو بھجوایا۔ واہ بس۔ پردیسی پیتم دیکھی تمہاری پریت۔

رس کے بھرے تورے نین

(از نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۵ء)

خونخوار آنکھیں۔ اشکبار آنکھیں۔ دلدار آنکھیں۔ دلفگار آنکھیں۔ میں کیا کہوں

کہ وہ ہیں زہرو اسا آنکھیں۔

آنکھ تھی یا نرگس کا پھول۔ پھول تھا۔ یا دل میں چبھنے والا کانٹا۔ نہیں کانٹا نہیں یہ پھول ہے۔ وہ شاہین وحدت کا لبریز گلاس تھا۔ شاید اب بھی نشہ میں غلط کہا۔ وہ نشتروں کا پیکٹ نہ ہو۔ چھری کی دھار نہ ہو۔ تیر کی نوک نہ ہو۔ مگر دل تو کہتا ہے وہ آنکھ رسیلی بکیلی نشیلی تھی۔ اُس میں سے نور برستا تھا۔ سرور ابلتا تھا۔ اس نے اپنا رس دو پیالوں میں مجھکو بھی دیا تھا۔ دل کی گواہی معتبر نہیں۔ اس کو جنون ہے۔ وہ وارفتہ مزاج ہے۔

دماغ سے پوچھو کہ چشم زیر بحث کی نسبت بیان دے۔ حق کو جان کر سچی زبان دے۔

جناب عالی! وہ بجانگی بنی ہوئی دو نالی بندوق تھی۔ ایک سکنڈ میں دس کروڑ فیر کرتی تھی۔ یا وہ بے تار کا تار دار اشارہ تھا۔ یا کھاری سمندر کا کنارہ تھا۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ وہ رُلا رہی تھی۔ اور ہنسا رہی تھی۔ اور آزاد ہستیوں کو جال میں پھنسا رہی تھی۔

دماغ میں بھی خلل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے اندر بھی کسی سودے کا دخل ہے۔ ارے کوئی تو کہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک کیا تھا۔ آنکھ تھی یا طلسم ہوش ربا تھا۔

جی ہاں۔ چھ معتبر اشخاص اس گھر میں ہیں۔ چار مرد۔ دو عورتیں۔ ان سے دریافت ہو تاکہ تحقیقات خلجان بے خودی سے واگزاشت ہو۔

آپ کون۔ اسم شریف؟ ابوبکر بن ابی قحافہؓ۔ کچھ ان آنکھوں کے بارے میں واقفیت ہے؟ کیوں نہیں۔ میرے یار۔ میرے خلیل۔ محبوب خدائے جلیل کی آنکھیں ہیں۔ انہیں کو دیکھ کر میں بوڑھا جوان ہو گیا۔ انہیں آنکھوں نے مجھکو چشم بصیرت عنایت فرمائی۔

دوسرے صاحب تشریف لائیں۔ آپ کا اسم گرامی؟ عمر ابن الخطابؓ۔ ان آنکھوں کی نسبت کیا رائے ہے؟ میری رائے ان آنکھوں ہی نے چھین لی۔ اور خود میری رائے بن گئیں۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ کیا ہیں۔ اتنا کہہ سکتا ہوں۔ فاتح ہیں۔ ملک گیر ہیں۔ قاتل ہیں۔ اور سب مقتول انہیں کے اسیر ہیں۔

تیسرے بزرگ کہاں ہیں۔ آپ کا اسم مبارک؟ عثمان ابن عفان رضہ۔ ان آنکھوں کے متعلق کیا خیال ہے؟ کن آنکھوں کے متعلق؟ یہ جو سامنے ہیں۔ میری زبان تھراتی ہے مجھے کچھ یاد آتا ہے۔ اور عقل چکراتی ہے چوتھے صاحب کو بلایئے۔ اور مجھ سے کچھ نہ کہلوایئے۔

ان حضرت کو تکلیف دی جائے۔ صورت سے ذکی اور ذہین نظر آتے ہیں۔ دیکھئے یہ کیا فرماتے ہیں۔ آپ کا اسم عالی۔ مجھ کو علی ابن ابی طالب رضہ کہتے ہیں۔ مگر میں ابھی کچھ نہ کہوں گا پہلے ان دو عورتوں کا بیان سن لیجئے۔

اچھا اول ان بی بی صاحبہ کو تکلیف دو۔ اور پردے میں یہ آنکھیں دکھاؤ۔ آپ کا نامِ نامی ارشاد فرما سکتی ہیں؟ مجھ کو عائشہ صدیقہ کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ آنکھیں کیا ہیں؟

بعد مدت کے ہوئی دید تری آنکھوں کی۔ یہ میری گود میں بند ہوئی تھیں۔ یہ مجھ کو محبت سے دیکھتی تھیں۔ ان کو میں نے آسمانوں سے ٹکٹکی لگائے دیکھا۔ ان کو آنسوؤں میں غرقاب پائی تھی۔ انہی کو دیکھ دیکھ کر میری تن بدن میں جان آتی تھی۔

دوسری سیدہ کو بھی دکھاؤ۔ اور ان کے فرمان کو قلمبند کراؤ۔ حضرت کا نام مبارک؟ مظلوم فاطمہ۔ بنت صاحب العیون۔ یہ میرے باباجان کی آنکھیں ہیں جو مجھ سے خفا ہو کر کہیں چلی گئی تھیں۔ یہ میرے حسنؑ حسینؑ کو پیار کرنے والی انکھیاں ہیں۔ یہ میرے ہاتھوں کے چھالوں کو دیکھنے والی ہیں۔ مجھے دو کہ مدت کے بعد میں نے پائی ہیں میں ان کو آنکھوں پر رکھوں۔ دل میں چھپالوں۔ میں کچھ نہیں کہتی۔ انھیں سے پوچھو کہ یہ کیا ہیں۔

علیؑ نامدار۔ اب تو فرمایئے۔ انجمن کا خلفشار مٹا ہے۔

دیوانوں کو ہشیار کرنے والی ہیں۔ ایک طرف خونخوار ہیں۔ ظالموں کا قصہ پاک کرتی ہیں۔ ایک جانب اشکبار ہیں۔ خوف ذوالجلال سے تر رہتی ہیں۔ بے دلوں کی دلدار ہیں دلوں کو قرار دیتی ہیں۔ سنگدلوں کا نشتر ہیں۔ نگاران کا کار ہے۔ یہ رس کے بھرے دو نین

ہیں۔ انہی کی سہاس سے لب بند کر لیتے ہیں۔ خمار بخش ہیں خمار شکن ہیں۔ یہ چشم محبت میرے بھائی محمدؐ کی ہے۔ یہ چشم فسوں ساز میرے مولا سرورِ کائناتؐ کی ہے جس پر سحر کاری کا الزام لگایا گیا۔ یہ وہ ہیں۔ یہ وہ ہیں۔ یہ وہ ہیں۔ وہ یہ ...... آنکھ کھل گئی۔ منزل مل گئی۔

اجمیری چنبیلی کا پھول

(از خطیب ۲۲ر مئی ۱۹۱۵ء)

مت بھول۔ یہ اجمیری چنبیلی کا پھول ہے۔ اس کی دید میں ہزار مان حصول ہے ایک ہار خرید و گلے میں اٹکا کر سینے سے لگا لو۔

کیوں جناب داتا چنبیلی۔ آپ نے آنکھ کھولی۔ کلی سے پھول بنے ذرا ہماری کلی کے لئے بھی تھوڑی سی صبا منگوا دو۔ اس کی بند پتیوں کو کھلنے کی اور کھلنے کی اجازت دلوا دو۔ بھائی مقبول حبیب اللہ ہو۔ تم چاہو تو تمہارے خواجہ بھی مہربان ہو جائیں۔ خواجہ کی نظر مہر ہو۔ تو اللہ میاں کی عنایت میں کیا دیر ہے۔ اسی خود غرضی کیلئے آتا جاتا چکر لگاتا پھرتا ہے بندہ مشرک نہیں۔ تم کو اور تمہارے خواجہ کو خدا یا شریک خدا نہیں مانتا۔ مگر تمہارے وسیلے کے سوا کسی کو نہیں جانتا۔ پہچانتا۔ دل کے لگاؤ کے واسطے ایک رشتہ درکار ہے۔ رشتہ کہاں سے لاؤں۔ قطع برید کا زمانہ ہے۔ رگِ گل میں تمنا کو پرو کر تم سے کہتا ہوں۔ تمہارے خواجہ کے آگے روتا ہوں۔

کہنا چمنِ حیات سے یقین کی بہار خفا ہو کر چلی گئی۔ وہم۔ شک۔ گمان نے ہر غنچہ کو گھیرا ہے۔ بلبل نہیں۔ زاغ چونچیں مارتا ہے۔ اور کہتا ہے یہ میرا ہے۔ یہ میرا ہے۔ باغ اجڑ جائے گا۔ اس وقت آپ کو توجہ ہو گی۔ تو کیا ہاتھ آئے گا۔ اے اجمیری پھول اتنا کہہ دے گا تو بڑا اجر پائے گا۔

زُلف کا ماجرا

(از خطیب ۲۲ر مئی ۱۹۱۵ء)

اندھیری رات میں سوائے اس کے میں اور کیا بیان کر سکتا ہوں کہ وہ سیاہ بال تھے ان میں پیچ و خم تھے۔ کنگھی سے اُلجھتے تھے۔ مشکل سے سلجھتے تھے۔

شاعروں نے ان کو گیسوئے عنبرین کہا۔ زلف پیچاں نام دھرا۔ میں نے یہ ماجرا سنکر خلقت کی آہوں کو فراہم کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ سنتا تھا۔ آہ بھی کالی ہوتی ہے اس میں بھی پیچیدگی کا جنجال ہوتا ہے، لوگوں نے کہا دوسروں کی آہ مانگتے ہو۔ تم بھی تو سینہ سوزاں رکھتے ہو۔ ایک شرارہ آہ اپنا بھی دو۔

میں گل چمپا کی بوئے مست میں مشغول تھا۔ پبلک مطالبے سے چونکا۔ چاہا کہ ایک آہ تاریک کھینچوں۔ مگر دل نہ مانا۔ پھول کی بو نے پیچیدہ کو آگے بڑھا دیا۔ خوشبو بل کی لائی۔ غمزہ سے اترائی۔ اور بولی اکیلی نہ جاؤں گی۔ شمع کے دھوئیں کو ساتھ بھیجو۔ خوشبو کی یہ ادائے مجبرانہ دل کو بھائی۔ آہ کو بلایا۔ شمع کے دھوئیں کو بھگایا۔ اور تینوں پیچیدگیوں کو اللہ بیلی، اللہ نگہبان کہا۔

اَب زلف کا ماجرا شروع ہوا۔ سارے جہان کی آہیں۔ دنیا بھر کے پھولوں کی خوشبو کل بزم کائنات کی شمعوں کا دھواں مل جل کر گھر سے چلے۔ تو دیکھا عرب کے ایک شہر مدینہ میں ایک کاکل دراز کھڑے ہیں۔ اور سورۂ واللیل پڑھ رہے ہیں۔

اس مردِ عرب کے گیسو دیکھ کر پیچیدگی شرما گئی۔ اور بولی۔

آشفتہ می دارد مرا زلف سمن روئے شما

زلفوں والے منہ سے نہ بولے۔ ایک دوسرے کمبل والے کے سر پر ہاتھ رکھا۔

یہ بھی گیسو دراز تھے۔ اور فرمایا۔

جا! میرے حسن۔ ہندوستان سدھار و سلطان الہند لقب دیا۔ وہ ملک تاریکی شرک سے کالا ہے۔ وحدت کا نور لیجا۔ اُجالا بانٹ۔ میرے بنو۔ میرا بناؤ۔

خبر نہیں اس ہاتھ میں کیا تاثیر تھی۔ زلف حسن جھولنے لگی۔ اور بل کھا کر چلائی مجھ کو معین الدین حسن کا درجہ دیا۔ دین حسن کی امانت میرا فرض ہے۔ اور ہندی دلوں کی الجھن سلجھانا۔ دل کا ارمان۔ زلف کا اتنا ہی ماجرا سنا تھا کہ رجب کا چاند نظر آیا۔ ہندو مسلمان کے گھر میں عید آئی۔ اجمیر اجمیر کی دھوم مچی ہر ہستی اپنی بستی چھوڑ کر گھر سے چلی۔ دیکھا پہاڑوں کی آغوش میں گنبد سفید کی وہی شان ہے جو مدینے میں گنبد سبز کی تھی۔ زبان سے نکلا ؎

درِ خواجہ یار و درِ مصطفیٰ ہے　　سراسر مدینے کا نقشا کھچا ہے

ادب نے کہا خاموش۔ سلسلۂ زلف میں اسیر ہو۔ زبان بند کر۔ تقریر نہیں تاثیر ہو۔ تاکہ دل کے اُلجھاؤ سلجھیں۔ من مانی مراد ہاتھ آئے۔

چارۂ تشنہ لبی

(از خطیب ۲۲۔ مئی ۱۹۱۵ء)

اجمیر کا عرس۔ مئی کا مہینہ۔ خلائق کا انبوہ۔ جس میں ہندو بھی۔ مسلمان بھی۔ دانا بھی نادان بھی۔ مگر ہر جان پانی کی خواہاں۔ اور پانی مثل حجاز خطہ میں نایاب۔

اخباروں نے چھاپا۔ اس کا تدارک ضرور ہو۔ اہتمام کرنے والوں نے کمر میں باندھ لیں حضور نظام کے وعدے چشمہ کشائی بھی یاد آگئے۔ مگر دل نے انگڑائی لیکر کہا۔ میری پیاس کا کیا انتظام ہوگا۔ اس کے لیے کونسا ہمدرد ہے۔ جو کنڈی کھٹکھٹائے گا۔ تشنہ کامی سے

جان لبوں پر آئی ہے۔ روح کی زبان خشک ہے۔ چہرہ پر مردنی چھائی ہے۔ کوثری خواجہ سے کہو۔ اس تشنہ لبی کا چارہ کار بنے تو اخبار العشق میں ریمارک چھپائے جائیں گے نکتہ چینی ہوگی۔ پھر نہ کہنا کہ یہ سخت نویسی حد سے دلنشین تک پہونچی ہے۔ پریس ایکٹ کے اشارے کنائے یا اور کسی انداز میں گرفتار کرو۔ اسیر پہلے ہی میں صاف کہے دیتا ہوں۔ اس پیاس کا انتظام کرنا ہوگا۔ خالی جام بھرنا ہوگا۔

ایک میں ہوں۔ ایک میرا خماری ہے۔ مجھ میں اس میں اسی جام کی خاطر مدت سے یاری ہے۔ دودھ کی نہر نہیں مانگی۔ شہد کا چشمہ طلب نہیں کیا۔ سادے پانی کا ایک کٹورہ درکار ہے۔ بڑھا دو۔ منہ سے لگا دو۔ دل کی لگی کو بجھا دو۔ للہ بجھا دو۔ میں قربان۔ کوچۂ شرابی سے بچا کر عشق کے اصلی واثر خانہ تک پہنچا دو۔

اے دلِ مجھ پر آ!

(از خطیب ۲۲۔ جون ۱۹۱۵ء)

تو اچھی صورتوں پر آتا ہے۔ میں بھی خدا کی صورت پر بنا ہوں۔ اچھی سیرتوں پر آتا ہے۔ تمام کائنات کی مخلوق سے افضل و اشرف سیرت رکھتا ہوں۔ تو لباس پر، رفتار پر، گفتار پر، ادائے طرحدار پر جان دیتا ہے۔ دیکھ مجھ میں کسی چیز کی کمی نہیں۔

پس میں درخواست کرتا ہوں کہ تو مجھ پر آ۔ یعنی مجھ سے محبت کر۔ میری الفت میں سیر ہو تو مجھ کو کتنا پیارا ہے۔ سینے کے اندر۔ پہلو میں چھپا کر۔ سوائے تیرے کس کو رکھا ہے۔ اس جون کی گرمی میں تیری خاطر نیلوفر کا شربت پیتا ہوں۔ دریا کے ٹھنڈے ریت پر لوٹتا ہوں۔ تاکہ تو خنکی سے راحت پائے۔ اور ہاں اپنے

سانس کا پنکھا

تجھ پر لگا رکھا ہے۔ جو دن رات چلتا رہتا ہے۔ اور تجھ کو ہوا دیتا ہے۔

میرے دل میں تیری مخفی خواہش کو ذرا سے اشارے سے تاڑ جاتا ہوں۔ اور جس طرح تو کہتا ہے کھاتا ہوں۔ پہنتا ہوں چلتا ہوں۔ پھرتا ہوں تیری ہی آنکھوں سے دنیا کو دیکھتا ہوں یعنی جس چیز کو تو چشم مسرت سے دیکھنا چاہتا ہے اسی پر نظر ڈالتا ہوں اور کسی پر نہیں۔ تیرے ہی کانوں سے سُنتا ہوں یعنی تیری مرضی کے خلاف کسی آواز پر کان نہیں دھرتا۔ تو پھر کیا شرط انصاف ہے کہ تو مجھ کو چھوڑ کر دوسروں پر آئے۔ مجھ سے بے وفا بنکر غیروں کی وفا کا عہد باندھے۔

خبر بھی ہے میں اس خدا کا بندہ ہوں جس کو شرک سے نفرت ہے۔ ہر گناہ کی اس کے دربار میں معافی ممکن ہے۔ مگر شرک کی نہیں۔ پس میں کیونکر گوارا کروں کہ تو اغیار کی الفت میں مبتلا ہو اور میرا حق دوسروں کو دے۔

اے دل تیرا نام ایک مجاز ہے۔ حقیقت میں شکوہ راز و نیاز ہے۔ میری اس تحریر کو چشم حقیقت سے پڑھ۔ اور خدارا مجھ سے محبت کر۔

اگر تو مجھے محبت کرنے لگے تو خدا تک تیری رسائی ہو جائے گی۔ کیونکہ میری شناخت خدا کی شناخت ہے۔ چونکہ تو خود میرا دل ہے۔ جب میرے وجود کا عرفان حاصل کرے گا عرفان رب حاصل ہو جائے گا۔ من عرف نفسہ عرف ربہٗ دلیل موجود ہے۔

مگر ہائے تو مجھ کو بھول گیا۔ تو غیر کی چاہت میں میری وفا شعاریوں کو پس پشت ڈال بیٹھا ہے۔ مجھے تجھ پر غصہ آتا ہے۔ چاہتا ہوں اپنے سینے کو چیر ڈالوں۔ اور تجھ کو نکال کر پھینک دوں لیکن یہ بھی محال ہے۔ نہ تاب وصل و دم نہ طاقت جدائی الٰہی یہ کیسی مشکل آئی

اچھا تو میں دنیا والوں کو تیری کج ادائی سناتا ہوں۔ اور ان سے کہتا ہوں کہ جس کو سینہ سے لگا کر رکھا ہو۔ اس پر بھروسہ کبھی نہ کرنا۔ وہ تمہارا نہیں غیر کا طلب گار ہے۔ بلکہ خود

تجھ سے کہتا ہوں کہ خدا نے قدرت کا کارخانہ یوں ہی بنایا ہے کہ میں تجھ پر مروں اور تو دوسروں پر لہٰذا تو جن پر مرتا ہے وہ بھی تجھ سے بے وفائی کریں گے۔ اور تجھ کو اسی طرح آتش فراق میں جلنا ہوگا۔ جس طرح میں جلا کرتا ہوں۔

تو مجھ کو چھوڑ کر ماسوا پر فریفتہ ہوا۔ دیکھیو ایک دن ماسوا تجھ کو چھوڑ کر ایک دوسرے ماسوا کا اسیر ہوگا۔ پھر تو ہوگا اور درد بھری آہیں۔ وہ آہیں جن کا کچھ نتیجہ نہ نکلے گا۔ کیونکہ دوزخ کا عذاب ابدی اور غیر فانی ہے۔

سوہنے دی یاد وچ

ہچکی

تو کیوں آتی ہے؟ میرا کہنا تو یاد نہیں کرتا؟ میرے من موہن سندر کے دل میں میرا خیال تو نہیں آیا۔

پھر آئی۔ ہچکی نہ ستا، میرا سینہ ناتواں ہے۔ اس میں جگہ جگہ پھانسیں چبھی ہوئی ہیں۔ تو آتی ہے تو سینے میں کھٹک ہوتی ہے۔ اس کے زخم دکھنے لگتے ہیں سانس رکا جاتا ہے۔ جب تو آتی ہے گردن کو جھٹکا دیتی ہے۔ اور ناف سے سر تک پھٹوں اور رگوں کو ہلا ڈالتی ہے۔ میرا جی سانس سے گھبراتا ہے۔ اور پیا پیارے کی یاد میں بے قابو ہوا جاتا ہے۔

ہائے میں نے کیسے کیسے درد بھرے خط بھجوائے۔ لکھنا نہ آتا تھا دوسروں سے لکھوائے۔ مگر اس نے کاغذ کا ایک پرزہ نہ بھیجا۔ دو حرفوں میں بخیلی کی۔ کس سے کہوں میری نہ کوئی سکھی ہے نہ سہیلی ہے۔ اپنا ہے نہ پرایا ہے۔ کاش مجھ پر کوئی لعن طعن

ہی کرنے والا ہوتا۔ اسی بہانے سے دل بہلتا اور اس کا ذکر سننے میں آتا۔

میں نے اس کی خاطر رسوائیاں برداشت کیں۔ دنیا نے کچھ نہ کیا لیکن اس نے اتنا نہ پوچھا۔ کہ میں بھی کوئی ہوں۔ اب یہ ہچکی آئی ہے کیا امرہنے ڈاسینہا) پیام کی لائی ہے۔ اگر یہ اس کا خط ہے تو کس سے پڑھواؤں۔ خیال کی ڈاک میں سانس کا ڈاکیہ لایا ہے۔ وہی پڑھے گا۔ مگر آہ اس خط میں کیا لکھا ہے۔ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے آتے ہیں۔ تلھ (پیارے) مجھے بتا تو کیوں رونذا (روتا) ہے۔

میرا ساجن تو اچھا ہے؟

یہ ہچکی موت کی خبر لاتی ہے۔ اس کے نہ دیکھنے کا ارمان دل میں رہا جاتا ہے دنیا کا آسمان اب تک اونچا نظر آتا ہے۔ زمین اسی طرح بچھی ہوئی ہے چولھے کی آگ ویسی ہی زبان نکال کر جل رہی ہے۔ میرا دل اب تک تڑپ رہا ہے۔ گواہ رہو میرا خاتمہ دلِ جان کے نام پر ہوتا ہے۔ جس کا ہمیشہ کلمہ پڑھا۔ مجھے قبر کا کچھ ڈر نہیں اس کی تاریکی کا اندیشہ کیا کروں۔ فرقت کی رات سے زیادہ اندھیری نہ ہو گی اور میں نے ساری عمر انہیں راتوں میں بسر کی۔ میں منکر نکیر کا کیا خوف کروں پیارے کا نام یاد ہے اسکی گلی کا پتہ یاد ہے وہی میرا دین ہے۔ وہی میرا ایمان ہے۔

زندگی کا چراغ بجھتا ہے۔ روح کا پروانہ دوسری شمع کے گھر جاتا ہے۔ اب گھر سے بستروں کو لپیٹو۔ آئینے توڑ دو۔ کسی کو بلاؤ۔ جو میرے غم میں گریبان چاک کرے۔

آخری ہچکی آنے سے پہلے مجھے بیان کر لینے دو کہ میرا صیاد ہر جائی ہے کائنات کے ذرہ ذرہ میں اس کی سمائی ہے۔ نہیں آتا۔ تو ایک میرے پاس۔ اس واسطے اے دنیا کے لوگو! تم اگر اس کوچے میں آؤ۔ اور اس سے جی لگاؤ۔ جس کو خدا کہتے ہیں تو ذرا سوچ سمجھ کر ایسا کرنا۔

آغوشِ محشر میں شبِ عید

(از رسالہ نظام المشائخ نومبر ۱۹۱۳ء)

آنکھوں نے رونا چھوڑ دیا۔ دلوں نے آہیں کھینچنی ترک کر دیں۔ اب کہیں سے سسکیوں اور ہچکیوں کی آوازیں نہیں آتیں۔ اب کوئی عشقبازی کے کوچے میں قدم نہیں رکھتا۔

آج وہ وقت ہے کہ زلف و کمر کا خیال بدترین گناہ مانا جاتا ہے جناب حالی اس کے مفتی اعظم ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ انھوں نے لاانتہا سرگرد وہم خیال پیدا کر دئیے ہیں۔ ایک جانب مولانا اشرف علی اصلاح خیال کے درپے ہیں۔ ایک طرف خواجہ غلام الثقلین اصلاح تمدن کا ترانہ گاتے ہیں۔ انہیں کے پردوں میں اسوہ حسنہ کی صدا بلند ہوئی۔ نظام المشائخ بھی لمبی لمبی آیات و احادیث و اقوال و حکایات لکھنے لگا۔ حسن نظامی تک اس گلی میں نہیں آتا۔

اب اس سال زندگی کا کیا انجام ہو گا۔ جس کی روح خدا ہے۔ جسکو شیکسپیر نے مجسم خدا کہا۔ اور جس کی حقیقت سمجھنے سے وہ عاجز ہو گیا۔ جس پر مولانا روم کو حال آتا تھا۔ جس کو دیکھ کر حافظ شیراز رحمہ کا دم دنیا سے گھبراتا تھا۔

اب پروانوں کی پرسش نہیں ہے۔ اب شمع کی یادگاریاں مٹ رہی ہیں اب بلبل کی بدمستیاں خواب و خیال ہوئی جاتی ہیں۔ اب شاخ گل کا جھومنا کوئی نہیں دیکھتا اب گل کی چشم سرمگیں سے کسی کی آنکھیں نہیں لڑتیں۔

اور کیونکہ یہ چرچے باقی رہتے۔ ہر وجود روٹی اور عزت کے دام میں گرفتار ہے ہر ہستی کو بال بچوں کی پرورش کا آزار ہے جناب حافظ رحمہ کے مطرب کے کون پوچھے

رازونیاز کا معما نوالے کھانے والوں نے کیسی حکمت سے حل کرلیا ہے ÷

کباب کھانے والے گزر گئے۔ شراب پینے والے گزر گئے۔ سرمد تک راہی عدم ہوئے۔ جو سوکھی روٹی پانی میں بھگو کر اوقات بسری کرلیا کرتے تھے۔ جرمن کی سالہا سال کی تیاریاں بھی جنگ میں آئیں اور گزر رہی ہیں۔ یورپ کی بزد آزمائیوں کے ولولے نکلے چلے جارہے ہیں۔ توپوں کے گولے بندوقوں کی گولیاں۔ سنگینوں کی نوکیں سب اپنی زندگی کے دن آگے بڑھ بڑھ کر پورے کررہے ہیں ÷

مگر محبت کو دنیا میں رہنے کی ممانعت کی جاتی ہے۔ الفت کو اس دورِ حیات میں آنے سے روکا جاتا ہے۔ مولانا روم نے خارِ گندم کا الزام لگا کر ہر مجاز کو خوفناک بنا دیا۔ کیا حقیقت والے گندم نہیں کھاتے۔ کیا ان کے جذبات میں گندم کے دانے آگ نہیں لگاتے۔

مجاز اور حقیقت دو لفظ ہیں۔ جو ذہنِ انسانی کے برزخِ خیالی ہیں ورنہ نہ حقیقت کی کچھ ہستی ہے نہ مجاز کی۔ سوزِ لفظی کا کچھ نتیجہ ہے نہ ساز کا ÷

آؤ! محبت کی ایک نئی دنیا آباد کریں۔ آؤ! عشق کا ایک نیا آسمان و زمین بنائیں آؤ! اب وقت آگیا ہے کہ ان پیٹ پیٹ پکارنے والوں اور دولت و عزت کے متوالوں کو بائیکاٹ کریں۔ یہ ہم کو جینے نہ دیں گے۔ ان کو کالج و اسکول بنانے دو۔ ان کو انجمن و کانفرنس میں غل مچانے دو۔ یہ اور ان کے سب حالی موالی یہاں رہیں۔ ہم وہاں اٹھ چلیں گے۔ ہم ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہم کو ایک سانس ان کے ساتھ لینا دوبھر ہے ÷

انھوں نے بہت لکھنے والے بنائے ہیں۔ جو چھاپ کی مشینوں کی طرح انجان اور بے خبر رہ کر چلتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے بولنے والے تیار کیے ہیں۔ جو گراموفون کے ریکارڈوں کی مثل گاتے بجاتے ہیں۔ اور عالمِ بیچارگی میں دوسرے کے ہاتھ سے البم میں بند کرکے رکھ دیے جاتے ہیں۔ ہم بیچارے ہوں تو ان کو بنفشہ گاؤزبان یاد آتی ہے برسام کا خطرہ ہو تو سر کے بالوں کو نظر لگاتے ہیں۔ سردی آئے تو لحاف تو شک سے جی بہلاتے ہیں

گرمی آئے تو برف و پنکھے کے سامنے سر جھکاتے ہیں ÷

یہ مقدموں میں وکیلوں کے محتاج ہیں۔ یہ چلنے میں جانوروں اور کولمبانی کے محتاج ہیں۔ ان کو لباس کے لیے بھیڑ کی اترن اون درکار ہوتی ہے۔ ان کا سہارا جھوٹ مکر ہے۔ ان کی پشت و پناہ دغا و جفا کاری ہے ÷

یہ خدا کو کیا جانیں۔ یہ اس کی امانت محبت کی کیا قدر کریں۔ منہ سے شرک خفی و جلی پکارتے ہیں۔ آنکھوں۔ ہاتھوں اور خیال و ارادہ سے خود ہی اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اب ہم ان میں ایک دم بھی نہیں گزار سکتے۔ اب ایک لمحہ بھی ان میں رہنا دشوار ہے۔ چلو چلو کر علیحدگی میں بیڑا پار ہے ÷

اس دنیائے جدید کی کیا بات ہے۔ عید قربان کی مستانی رات ہے۔ ہوٹل اکیلا کمرہ ہے سامنے کمپنی باغ ہے۔ میز پر آئینہ کے سامنے لیمپ جل رہا ہے پر اس دنیا کا کوئی پروانہ نہیں ہے۔ نور جہاں اسی منظر کے لئے کہہ گئی تھی۔ ع

نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

ہوا آتی ہے۔ مگر عاشق مزاج مچھروں سے گستاخی نہیں کرسکتی۔ مچھر آتے ہیں۔ گاتے ہیں۔ حال میں لاتے ہیں۔ آغوش کھلا ہوا ہے۔ نہ تو غیری نہ من غیرم کی صدا ہے۔ اِدھر مچھر۔ اُدھر مچھر۔ نیچے مچھر۔ اوپر مچھر۔ دائیں مچھر۔ بائیں مچھر۔ ہر طرف مچھر۔ ہر سمت مچھر۔ خیال میں بھی وہی۔ عالمِ مثال میں بھی وہی ÷

آ میرے پیارے مچھر۔ میری آنکھوں پر۔ میرے رخساروں پر۔ میرے ہونٹوں پر۔ میری ٹھوڑی پر۔ تو اس نئی دنیا میں عشق کا پروانہ ہے۔ تو شاخِ شجرِ محبت کا بلبلِ مستانہ ہے۔ آفاق ہا گردیدہ ام۔ بسیار خوباں دیدہ ام۔ لیکن تو چیزے دیگری ÷

میں شکل صورت کا پابند نہیں ہوں۔ میں سیرت کے حسن و قبح کو بھی دیکھنا خلافِ آزادی سمجھتا ہوں۔ جو دل کو بھا جائے۔ جو تنہائی میں انیس و ہمدم بن جائے۔ جو سب کو

چھوڑ کر میرا ہو جائے جو ہوائے دہر کے مخالفانہ جھونکوں کے باوجود میرے پہلو سے جدا نہ ہو۔ وہی میرا ہے۔ اسی کا میں ہوں باقی سب ہیچ ۔

اس نئی دنیا کے قوانین کچھ بھی ہوں۔ لیکن محبت اور اس کے رسول محمدؐ سے یہ آباد ہے۔ سُن لو۔ محبت کے پیام رساں نے فرمایا ۔

جو تیری دوستی کو دوسروں کی دوستی پر۔ تیری بات کو دوسروں کی باتوں پر۔ تیری محبت کو دوسروں کی محبت پر ترجیح دے وہی تیرا دوست ہے۔ گویا ان کے خلاف دوستی نہیں ہے۔ میرے دلدار مجھ کو دیکھ لو سب اوصاف مجھ میں ہیں۔ میری بات سننے آیا ہے۔ میری دوستی میں وطن سے ہجرت کی ہے۔ میری محبت کو تمام کائنات کی ہم نشینی سے مقدم جانتا ہے۔ بس یہی میرا جاناں ہے۔ بس یہی میرا جاناں ہے ۔

مَیں محبت کے پیامبر کے قربان۔ کیا بات سنائی ہے۔ کیا دل کی بے کلی مٹائی ہے۔ ساری رات آنکھوں میں گزری آنکھیں لال ہو گئیں۔ خمار کے ناسوت سے لاہوت تک پہونچیں۔ اندھیری رات نہ تھی۔ چاندنی نے لپک چمک کر بجلیاں گرائیں۔ گملوں کے سبز پودے۔ شجر فتنے بنے۔ تشنۂ انتظار کو کسی کی آمد کی آہٹ کا سراب دکھایا۔ ہر لحظہ کلیجہ منہ کو آیا۔ آخر جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مخلوق بشر کی تسلی کا یہ تخیل پرور سامان بھجوایا ۔

وہ میری الجھن کے سلجھانے والے۔ وہ میری ہر دشواری کو آسان کرتے ہیں۔ وہ شفیع اکبر ہیں۔ میری شفاعت کو دوسروں کے لئے سُنتے ہیں۔ تو کیا خود میری نہ سُنتے ۔

ہمیں اس نئی دنیا میں مجھ کو صرف محبت کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ پیغمبر بھی اُسی کے ہیں۔ اسی کے اشاروں سے کام کرتے ہیں۔ تو بتاؤ میں کیونکر آج کی تسکین کا شکرانہ بھیجوں۔ میں پرانی دنیا میں ان کو خدا کہتا تھا۔ اللہ کہتا تھا۔ رحمٰن کہتا تھا رحیم کہتا تھا۔ یہاں ان کو نہ صرف :۔

محبتؔ کے اِسمِ صفاتی

سے یاد کرتے ہیں۔ وہاں ان کے ادب کی کچھ رسمیں تھیں۔ یہاں کے رواج سے میں واقف نہیں ہوں۔ تو انہیں کو سامنے کیوں نہیں بلایا جاتا۔ یہاں بھی پردہ قائم رہا تو بڑی مشکل ہوگی۔ انہی سے پوچھیں۔ انہی سے معلوم کریں کہ آپ کی مہربانیوں کی حمد و ثنا کیونکر ہوتی ہے۔ اور آپ کی دل نوازی کی داد کس طرح دی جاتی ہے ۔

حکم ہو تو آنسوؤں کے سمندر قدموں پر نثار کریں۔ ارشاد ہو تو ایک نعرۂ مجنونانہ بلند کر کے دنیائے جدید کو آپ کے الطاف کی خبر دیں۔ کچھ تو بولو۔ ہم بھی تو موسےٰ سے ہمکلام ہونے والے کی آواز سُنیں۔ ہم کو بھی تو معلوم ہو کہ امتِ مرحومہ کے یہ درجے اور مراتب ہیں۔ آپ کے لحاظ و سکوت سے دم لبوں پر آ گیا۔ ہم اور تو کچھ نہیں چاہتے فقط آپ کی تعریف کا طریقہ دریافت کرتے ہیں ۔

ہاں یہ۔ آہ یہ۔ ربنا انت۔ مولانا انت۔ بکذا۔ مثل ہذا۔ ارے تُو او تُو آپ۔ اے قمر حضرت شما۔ نئی دنیا کے دیوانو۔ آؤ دیکھو نقاب اُٹھ گئی۔ پہلے میرے جدید محرم راز مچھروں کو بلاؤ۔ جو راتوں کو ان کی یاد میں بلبلایا کرتے تھے۔ اور درد کے افسانے سریلی صداؤں میں سنایا کرتے تھے ۔

دیکھیں وہ یہ ہیں۔ قربانی کے جانوروں کو پکارنا جن کی خاطر آج کے دن انہوں نے سر کٹائے ہیں۔ دیکھو کھلم کھلا میرے گھر میں آئے ہیں۔ تم نے جان کھوئی اور یہ جان لینے سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ کیا بیچارے انجان ہیں۔ دوسروں کی گردن پر چھریاں پھر گئیں اور آپ بے خبر بنے کھڑے ہیں۔ یہ تمہارے ہی کھلونے تھے۔ تم ہی پر صدقے ہو گئے اور ذرا آنکھوں میں تو آؤ۔ ذرا کلیجہ تو ٹھنڈا کرو۔ منم عبد و تو معبود۔ یا موجود۔ یا موجود ۔

تیسری منزل

سرِّ دلبراں در حدیثِ دیگراں

آنسو کی سرگذشت

از رسالہ زمانہ سنہ ۱۹۰۲ء

جس دل میں درد نہیں اس کو انسان کے سینے میں نہ رہنا چاہیئے۔ آنسو نشانِ درد ہے۔ اور مجھ کو اس کی سرگذشت بہت بھاتی ہے۔ زمانہ کی خاطر اسکو قلم بند کر دیا گیا۔ تاکہ سب درد آشنا دل دیدہ کا لطف اُٹھائیں ×

بچارا آنسو اس گھر میں پیدا ہوا جہاں خوشی کی چہل پہل۔ اور شادی کی خوب گہماگہمی تھی چاروں طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر جس ننھے سے دل میں اس کا ڈیرا تھا۔ اسکو شکمِ مادری کی یاد نے گھیر رکھا تھا۔ آنکھیں بار بار اس وطن تاریک کو ڈھونڈھتی تھیں۔ اور مایوس ہو کر رہ جاتی تھیں۔ آخر دلِ نازک کو تاب نہ رہی اس میں درد کا ایک دھواں اُٹھا اور آنسوؤں کو زبردستی آنکھوں تک کھینچ لایا ×

یہ کشمکش مدتوں آنسو کو درپیش رہی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ بھرے پرے گھر میں بربادی شروع ہوئی۔ پہلے باپ مرا اور پھر ماں بھی رخصت ہوگئی ایک جوان لڑکی اور چھوٹا سا لڑکا زندہ بچا۔ باقی سب کا خاتمہ ہوگیا۔ لڑکی ہوشیار تھی۔ بار بار بیکسی و لاچاری کا خیال آتا۔ اور غم زدہ دل پر ایک ٹھیس سی لگتی۔ آنسو امنڈ امنڈ کر آتے حسین و غمگین آنکھوں میں تیرنے لگے۔ مگر یہ دکھیاری ان کو زبردستی پی جاتی۔ تاکہ معصوم بھائی نہ دیکھے اور اس کے شکستہ

دل کو صدمہ نہ پہونچے ×

کچھ دن تو یونہی گذرے۔ اس کے بعد لڑکی کی شادی ہوگئی۔ لڑکی پڑھی لکھی تھی تعلیمیافتہ خاوند کو بہت عزیز ہوئی اور دونوں میں اخلاص و محبت کا رشتہ مضبوط قائم ہوگیا۔ یہ صورت دیکھ کر آنسو خلوت میں سدھارے۔ اور ان کی سرگذشت کا سلسلہ ملتوی ہوگیا ×

یکایک زمانہ نے اپنی نیرنگی کا ورق الٹا اور بیچاری کا پیارا ساجن طاعون کا شکار ہو گیا شوہر کیا مرا۔ یہ خود مر گئی۔ ہندو دھرم اور راجپوتی شرم کے پیام آنے لگے کہ زندگی ختم ہوئی اب اس آباد دنیا میں تیرا کچھ حصہ نہیں۔ اپنا چت چتا کی سلگتی آگ میں لگا وہی تیرے دکھ کا خاتمہ کرے گی۔ چندرماں کی سہانی چاندنی کو مت دیکھ اور برکھارت کی مستانہ ہوا سے اپنے دامن بچا۔ اور یقین کر کہ خوشی کے دن تیرے ساجن کے ساتھ جل گئے۔ بپتا کی ماری لڑکی دم بخود۔ چپ کی سُن رہی تھی۔ کہ دل میں ایک سناٹا سا آیا۔ درد کی ہلکی ہلکی چمک ہونے لگی اور برسوں کے رُکے ہوئے آنسو ابل پڑے۔ یہ آنسو نرالی شان کے تھے۔ اندرونی سوزش نے ان کی رنگت نکھار دی تھی۔ سیاہ پلکوں سے ڈھلک کر زرد رخساروں پر بہنا اور چمکنا ستم ڈھا رہا تھا۔ اب آنسوؤں کا دور دورہ تھا اور انہیں کا عمل دخل۔ اندھیری رات میں بے چاری جوان بیوہ کا کوئی ساتھ نہ دیتا۔ غریب اکیلی پڑی سسکیاں لیا کرتی تھی مگر اس کے اصلی رفیق آنسو اس سے ایک لحظہ کو بھی جدا نہ ہوتے تھے ×

ایک دفعہ ہولی کے موسم میں ارمان بھری بیوہ اپنے رنگیلے پریتم کو یاد کر کے آنسو بہا رہی تھی اور اس کی سہاگن سہیلیاں رنگ اُچھالتی کلیلیں کرتی پھرتی تھیں اور اسکی حالتِ زار پر کسی کو بھی رحم نہ آتا تھا۔ یہ بے ترسی دیکھ کر اسے خیال آیا کہ مہاتما بدھ نے سچ فرمایا ہے کہ کل سنسار خود غرض اور دکھ کی پوٹ ہے۔ اسکی فانی خوبی پر نہ رہجھنا۔ اپنی ہستی کے مطالعہ میں دل لگانا اصلی سکھ اور آنند ہے یہ خیال آتے ہی بدنصیب لڑکی نے جی میں ٹھان لی کہ اب اس جوتی سروپ سے دل لگانا چاہیئے جس نے ان نیرنگیوں کو ظاہر کیا ہے یہ سوچ کر ایک رات گھر سے نکل گئی اور گھنگھور جنگل

میں آسن جما کر جا بیٹھی۔ لیکن جوں جوں حجابات دور ہوتے جاتے تھے دل میں میٹھا میٹھا درد ہوتا تھا۔ اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلے پڑتے تھے۔

اس لڑکی کا بیان ہے کہ جو لطف اس درد اور اس گریہ میں آتا ہے۔ وہ دنیا کی سب خوشیوں سے افضل ہے۔ یہی آنسو ہیں جن پر اسکی دلچسپ زندگی کا انجام ہوا۔

لمپ

(از رسالہ زبان ۱۹۰۵ء)

اب ہر ملک میں چراغ اور شمع کے بدلے لمپ کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ انسان تاریکی دور کرنے کا کوئی ذریعہ نہ جانتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں سب کام آسانی سے پورے کرلے جاتے تھے۔ ہندوستان کی نسبت سنا ہے کہ جب کسی شخص کو رات کے وقت کوئی تحریر پڑھنی ہوتی تو جنگل کی گھاس وغیرہ جلا کر پڑھتا تھا۔ یہی حال عرب کا تھا وہاں بھی چراغ کا دستور نہ تھا وہ لوگ بھی خاص ضرورت کے وقت لکڑیاں روشن کرکے کام نکال لیتے تھے۔ اس کے بعد انسان تمدن میں آگے بڑھا اور مٹی کا چراغ بنایا۔ سینکڑوں برس خاکی چراغ نے خاکی انسان کے گھر کو روشن رکھا اور اسکی روشنی میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی گئیں۔ جب نفاست بڑھی تو موم اور کافوری شمع بنائی گئی اور اس کے لیے مختلف وضع کے فانوس تیار ہوئے۔ تاکہ ہوا اور پروانوں کی آفت سے محفوظ رہے۔ فانوس عموماً شمعوں کے لیے بنائے جاتے تھے۔ چراغ کے واسطے بہت کم چیزیں تھیں جو بیچارے کو ہوا کے جھونکوں سے بچا سکتیں۔ ترقی کے زمانہ میں مٹی کے بدلے تانبے اور پیتل کے چراغ بنائے گئے مندروں مسجدوں اور خانقاہوں میں ان برنجی چراغوں کا بہت رواج ہوگیا۔ چنانچہ آج تک باوجود اعلیٰ ترقی کے مذہبی مقامات میں یہی پیتل اور تانبے کے چراغ پائے جاتے ہیں یورپ نے جس کو نئی روشنی کا استاد بیان کیا جاتا ہے۔ چراغچی

کے فن میں بڑا کمال پیدا کیا ہے۔ اس نے اول ٹین کی ڈبیاں روشن کیں۔ اس کے بعد کانچ کی چمنیاں ڈالیں اور لمپ تیار کیے۔ کانچ کی چمنیاں ایک طرح کے فانوس ہیں جو روشنی کو بیرونی آفتوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔

انسان ذرا آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے اس کو پرانے زمانے کے دو چراغ چاند سورج نظر آئیں گے۔ جو اپنی قدیمی حالت پر جوں کے توں قائم ہیں۔ زمین پر مٹی کے چراغ سے لے کر برنجی چراغ۔ شمع کافوری۔ شمع موی۔ مٹی کے تیل کا لمپ۔ گیس کا لمپ یہاں تک کہ بجلی کا لمپ بن گیا۔ مگر آسمان پر وہی پرانا قاعدہ جاری ہے۔ کیا مجال جو ذرا تغیر و تبدل ہو۔ مگر زمین کی ترقی نے جو روشنی کے معاملے میں ہوئی۔ بجائے اس کے کہ انسان کو فائدہ پہنچاتی اُلٹا نقصان پہنچایا۔ آج کل آدمی اس نئی روشنی کی بدولت طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا ہے اول تو خرچ کی زیادتی۔ پہلے تھوڑے خرچ میں بہت سا کام نکلجاتا تھا۔ اب کروڑوں روپیہ نمائشی اور فضول روشنی میں برباد ہوتا ہے غریب ہندوستان میں امیر یورپ کی دیکھا دیکھی ان فضولیات میں مبتلا ہو گیا۔ اور اپنی محنت کی کمائی یورپ کے لیمپوں کی نذر میں مُفت گنوا رہا ہے۔

مسلمانوں کے مشہور پیشوا اور حضرت رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے دوسرے خلیفہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت مشہور ہے کہ جب وہ رات کے وقت ملک کا کام کرتے کرتے اپنے کسی کام کو باہر جاتے تو چراغ گل کردیا کرتے تھے اور فرماتے کہ میں نہیں چاہتا قوم اور ملک کا تھوڑا سا تیل بھی بیکار جلے اسواسطے چراغ گل کردیتا ہوں کہ فضول روشن نہ رہے۔

بخلاف اس کے آج کل پبلک کے روپیہ کی جیسی قدر کیجاتی ہے ظاہر ہے۔ میونسپل کمیٹیوں کی طرف سے شہروں میں روشنی کا انتظام کیا جاتا ہے مگر اس میں ذراسی بھی دقت نہیں کی جاتی۔ لمپ ایک ڈبیہ کا نام ہے۔ خواہ وہ لوہے کی ہو یا کانچ کی۔ اس میں تیل بھر دیتے ہیں اور

پنیچ میں لٹکا دیتے ہیں۔ پھر اس پر کانچ کی چمنی لگا دی جاتی ہے یہ روشنی کا حجاب ہے۔ اس کے اندر بی بتی نئی روشنی کا تاج سر پر رکھ کر ملک ظلمات فتح کرکے حکومت کرتی ہیں۔

پروانے بیچارے اس روشن تاج کے دیوانے ہیں۔ دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں اور کانچ کے سفید پردے سے ٹکرا کے گر پڑتے ہیں۔ پچھلے زمانہ میں شمع کے رخ پر حجاب لٹکایا جاتا تھا وہ دور سے اور نزدیک سے پردہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ مگر آج کل چونکہ دنیا ہی دھوکے کی ہے یہ پردہ بھی دھوکے کی ٹٹی ثابت ہوتا ہے۔ ننھے سے پرندے کو روشنی بے حجاب نظر آتی ہے۔ لیکن جب قریب جاتا ہے تو غریب مایوس ہو کر گر پڑتا ہے اور منزل تک نہیں پہونچ سکتا۔

گورنمنٹ کی مہربانی ہے کہ اس نے رعیت سے ہتھیار لے لئے تاکہ لوگ خودکشی سے محفوظ رہیں۔ اسی طرح ان دیوانے عاشق مزاج پرندوں کی حفاظت جان بھی سرکار کو منظور تھی اس لئے سفید کانچ کے پہرہ دار کھڑے کردیئے ہیں۔ اب طالبان مرگ کی آرزو کسی طرح پوری نہیں ہوسکتی۔ مگر کیا تعجب ہے کہ پروانے بھی انسانوں کی طرح دوری حجاب کی کوئی نئی صورت نکالیں اور بقاو فنا کی منزلیں آسان ہو جائیں۔

مٹی کا تیل

(از رسالہ زبان ۱۹۰۶ء)

خاکساران جہاں را بحقارت منگر — تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اللہ میاں نے اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں پیدا کی جو بے کار ہو یا حقیر و ذلیل سمجھی جاسکے۔ چار عنصر آگ۔ ہوا۔ پانی خاک میں سب سے زیادہ بے حقیقت خاک ہے جو تمام مخلوقات کے پاؤں میں روندی جاتی ہے پانی کے زور کے ساتھ بہہ جاتی ہے۔ ہوا کے جھونکے سے اڑ جاتی ہے۔ اور آگ کی تمازت سے جلا کرتی ہے مگر اف نہیں کرتی۔ دیکھنے میں اسکی بیچارگی اور ذلت پر ترس آتا ہے۔ لیکن خود اس سے سوال کیا جائے تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر کرے گی

کہ میری شان سب سے بڑی اور نرالی بنائی۔ ہر چیز کا خمیر میرے وجود سے تیار کیا خاصکر انسان جو اشرف المخلوقات ہے مجھ سے پیدا ہوتا ہے اور مجھی میں فنا ہو جاتا ہے۔

اسی حقیر خاک کی تہ میں وہ نایاب خزانے قدرت کے دبے ہوئے ہیں جن کو کام میں لا کر انسان آدمی کہلاتا ہے۔ ورنہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا۔ خیر اور بڑی چیزیں تو اپنی جگہ ہیں۔ مٹی کے بعض ٹکڑوں کی تہ میں ایک قسم کا چکنا بدبودار پانی ہوتا ہے جس کو لوگ مٹی کا تیل کہتے ہیں۔ مقابلہ کرکے دیکھو تو چنبیلی کا تیل مرتیا کا تیل اپنی خوشبو کے سبب اس بدبودار تیل سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ بڑے بڑے خوبصورت اور نازک دماغ لوگ چنبیلی وغیرہ کے تیل کو سر چڑھائے رکھتے ہیں اور جہاں مٹی کا تیل آیا اور ناک ڈھکی۔ مگر ضرورت کے لحاظ سے یہ گندا سڑا پانی تمام تیلوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ آج کل تمام دنیا میں اسی کے دم سے اُجالا ہے۔ اگرچہ گیس اور بجلی کی روشنی نے اب مٹی کے تیل کو بھی مات کرنا شروع کردیا ہے تاہم اسکا عالمگیر اثر ابھی تک باقی ہے۔ متوسط درجہ اور ادنے درجہ کے آدمی جو دنیا میں زیادہ تعداد رکھتے ہیں۔ مٹی کے تیل کے سوا اور کچھ نہیں جلا سکتے۔ یہی تیل روشنی میں لڑکوں کو سبق یاد کراتا ہے جوانوں کو حسن افروزی کے جلوے دکھاتا ہے اور بڑھوں کو ٹھوکروں سے بچاتا ہے۔ اسی کی روشنی میں نمازی نمازیں پڑھتے ہیں پجاری پوجا کرتے۔ وعظ اور کتھا کے جلسے ہوتے ہیں یہی وہ تیل ہے کہ چور کو چوری میں مدد دیتا ہے۔ اور پولیس کو چور پکڑنے میں لالٹین دکھاتا ہے غم کی رات میں جدائی کی رات میں جب مونس و غمگسار پاس نہ ہو تو مٹی کا تیل جل جل کر اپنا وجود فنا کردیتا ہے اور انسان کا شریک غم بنکر باعث تسلی ہوتا ہے۔

امریکہ کا "راک فیلر" اسی خاک کے نیچے رہنے والے تیل کی بدولت لاتعداد دولت کا مالک ہے۔ مگر یہی تیل دوسرے ملک کے ہاتھ میں رہنے کے باعث ہندوستان کی دولت غیروں کو بانٹ رہا ہے۔ یہی تیل دنیا کی تمام کلوں میں کام آتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے بل پر دنیا کی مشہور سواری موٹر کار زمین پر دوڑتی پھرتی ہے۔

اے خاک نشین تجلی! ہمکو یہ تیری ادا بھاتی ہے کہ جہاں آگ قریب آئی اور تو مشتعل ہوا
خدا کی قدرت ہے کہ تجھ میں یہ صلاحیت ہے کہ تو آن کی آن میں شعلہ زار بنکر مقبول ہو جاتا
ہے اور انسان کی یہ قسمت کہ برسوں ٹکریں مارتا ہے۔ پہاڑوں۔ دریاؤں میں سرگرداں
پھرتا ہے مگر وہ تجلی نصیب نہیں ہوتی جو وجود خاکی کو جلا کر فنا کر دے۔

تو اتنا بے غرض و بے تعلق کیوں ہے؟ تیری روشنی میں شراب خواری ہو زنا کاری
ہو یا عبادت الٰہی۔ تجھے روشنی دینے سے کام۔ کیا تو محتسبی نہیں کر سکتا جو لوگوں کو گناہ سے
بچائے یا کم سے کم ان کو گناہ کرنے میں مدد نہ دے۔ کیا تجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ خدا کے
نافرمان انسان کو اپنے آتشی طمانچے سے خبردار کر دے۔ بیشک تجھ میں سب طاقتیں خدا نے
رکھی ہیں۔ مگر تو اچھی طاقتوں کو کام میں لاتا ہے جس سے کسی کو تکلیف یا کسی کی دل آزاری
نہ ہو البتہ انسان اپنی نیک قوتوں کو بھول جاتا اور بری طاقتوں کو کام میں لا کر خود تکلیف
اٹھاتا اور دوسروں کو تکلیف دیتا ہے۔ اگر وہ تیری صلح کل پالیسی پر عمل کرے تو دنیا میں ایسا ہی امن
قائم ہو جائے جس طرح لمپ کی روشنی میں سب لوگ خوشی و خرمی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

عشقیہ آتشبازی

پھلجھڑی۔ انار مہتابی

یہ شب برات، آتش بازی کے دن آگ جلائے گی۔ ہستیاں مٹائے گی۔ فنا
کے پھول بہار دکھائیں گے۔ بچے پھلجھڑیوں کے لئے ضد کرتے ہیں ان کو دلائی جاتی ہیں۔
آؤ ہم بھی ناداں بنکر نار کے نورانی کھلونے مانگیں اور جی بہلائیں۔

پھلجھڑی کیونکر بنتی ہے۔ کاہے سے بنتی ہے؟ یہ سب کو معلوم ہے۔ گندک ہوتی ہے
تاکہ آگ قبول کرے۔ شورہ ڈالا جاتا ہے تاکہ تیزی اور شورش پیدا ہو۔

کوئلے جن کی ایک ہستی آگ پہلے بگاڑ چکی ہے۔ پھلجھڑی کا جزو اعظم ہیں اور یہ پھول
لوہے کے برادے سے بنتے ہیں۔ اور اس لئے اس کی آمیزش بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔
بس یہ پھلجھڑی کی کائنات ہے جس پر کاغذ کا خول چڑھا کر بازاروں میں پھلجھڑی کے نام
سے بیچا کرتے ہیں۔ ہم ایسی پھلجھڑی چاہتے ہیں جس میں گندھک نہ ہو تو اس جیسا آگ قبول
کرنے والا مادہ ضرور ہو۔ نمکین شورہ نہ ملے تو کوئی دوسری جل بھنی چیز شامل کر لیں اور ہاں
لوہے چون ذرات آہن جن پر پھولوں کی ہستی کا مدار ہے۔ ڈھونڈھنا ضروری ہے تو کیا
پھول ایسی سخت دھات کے ذروں سے بنتے ہیں۔ نہیں نہیں خاک کے ذرے بھی
چمک دمک دکھانے میں کم نہیں وہی ڈال دینا۔

آہا! عشق کی دیا سلائی انسانی پھلجھڑی میں لگا دی۔ آنکھوں کی راہ پھلجھڑی کے اندر
کا مسالہ جل جل کر نکل رہا ہے۔ آنسوؤں کے پھول جھڑ رہے ہیں۔ کوئی دم کا یہ تماشہ ہے
پھلجھڑی جل چکے گی۔ اس کا خول راکھ ہو کر گر پڑے گا۔ اہا! کا غل و شور رہ کر بند ہو جائیگا
اور جلی ہوئی راکھ اندھیرے میں زمین پر گر کر پامال ہونے لگے گی۔

نہیں جناب ہم ایسی پھلجھڑی نہیں چاہتے جس کے جلنے کے بعد اندھیرا ہو جائے جس کا
تماشہ تھوڑی دیر کا ہو جس کی بہار عارضی نظر آئے۔ ہماری ضد پوری کرنی ہے۔ ہمارا دل
رکھنا ہے تو ایسی پھلجھڑی منگا کر دو جو ایک دفعہ سلگنے کے بعد کبھی نہ بجھے جس کے پھولوں
کا مینہ ہمیشہ برستا رہے جس کی بہار کبھی ختم نہ ہو۔ دیکھو ہم کو منگا دو

پھلجھڑی نہیں تو کوئی اور آگ کا کھلونا دلا دو۔ سمجھتے ہیں یہ دن آگ بازی کے ہیں
آج کی رات اللہ میاں پہلے آسمان پر آئیں گے۔ اچھا تو ہم ان سے کہیں گے کہ ہم آپ کے
بندے ہیں۔ سب کو آگ کے کھلونے مل گئے۔ ہم کو بھی دلوائیے دل کے انار میں بارود
بھری ہوئی ہے۔ مگر ایسی آگ نہیں ملتی جس سے یہ انار چھوٹ جائے۔ آپ ہی کوئی چنگاری
دے دیجئے۔ تاکہ انار قلب کی چند لمحہ بہار دیکھ لیں۔ مہتابی بھی خوب ہوتی ہے روشن اور منور

ظلمت کو کافور کرنے والی۔ آسمانی ماہتاب کی ماجائی مگر اس میں بھی وہی عیب ہے جلکر
خاک ہو جاتی ہے۔ مہتابی وہ اچھی جو ہمیشہ چمکتی رہے ہر وقت نور افشانی کرے ظلمت
کو فتح کرے کبھی مفتوح نہ ہو۔ بھلا وہ گورا کس کام کا جو کالے کو فتح کرکے پھر اس کا مفتوح
ہو جائے ہمارا نسخہ بنگیا تو دکھاویں گے کہ جس وقت مہتابی روشن ہوئی تو پھر کبھی نہ
بجھے گی۔ یہاں بھی نور وہاں بھی نور۔ ادھر بھی نور۔ اُدھر بھی نور جہاں سنو یہی آواز آئیگی
اللہ نور السمٰوات والارض۔ خیر اگر اب کی شب برات میں یہ عاشقانہ آتشبازی
میسر نہ آئی تو آئندہ کی امید رکھنی چاہیے۔

دیاسلائی

از رسالہ زبان ۱۹۰۹ء

آپ کون؟ ناچیز تنکا۔ اسم شریف؟ دیاسلائی کہتے ہیں۔ دولت خانہ؟ جناب
دولت خانہ اصلی گھر جنگل ویرانہ تھا۔ مگر چند روز سے "احمد آباد" میں بستی بسائی ہے اور
سچ پوچھئے تو یہ ننھا سا کاغذی ہوٹل جس کو آپ بکس کہتے ہیں اور جو آپ کی انگلیوں میں
دبا ہوا ہے۔ میرا موجودہ ٹھکانہ ہے۔

یہ "احمد آباد" ناروے یا سویڈن کے پاس کوئی نیا مقام ہے؟ کیونکہ آپ کی
بستیاں تو انھیں علاقوں میں بسی جاتی ہیں۔

نہیں جناب احمد آباد۔ ہندوستان میں ہے۔ آپ دیکھتے نہیں میری رنگت
کالی ہے۔ یہ اسی ملک کی نشانی ہے۔ ورنہ ناروے سویڈن کی دیاسلائی گوری چٹی
ہوتی ہے۔ مجھ غریب کو اس سے کیا نسبت؟

آہا تو آپ ہمارے ملک کی دیاسلائی ہیں۔ تب تو گو آپ کا رنگ سانولا ہے۔ مگر
ہماری نگاہ میں سب دیاسلائیوں کی رانی ہو۔ ذرا مہربانی کرکے مجھ کو "رانی" نہ فرمایئے۔

"بیگم" کہئے۔ میں نے مسلمانوں کے گھر میں جنم لیا ہے۔

بہت اچھا میاں تنکے ناراض نہ ہو۔ اللہ اکبر تم کو بھی یہ دن لگے کہ "رانی" اور "بیگم"
میں تمیز کرتے ہو۔ "کے آدمی کے پیر شدی" وہ وقت بھول گئے کہ زنجیروں میں باندھ کر
مشین کے آرے کے نیچے رکھے جاتے تھے۔ اور آرا آن کی آن میں تمہارے ٹکڑے کرڈالتا تھا
اس کے بعد جیسی گت بنتی تھی وہ خود خیال کرکے گریبان میں منہ ڈال سکتے ہو۔ تمہارے
تراشیدہ کندوں کا ظلماتی گرم چشمے میں ڈالا جاتا اور اس کھولتے ہوئے پانی میں تمہارا تلملانا
کبھی سطح آب پر آنا کبھی پھر تہ میں جا پڑنا۔ یہاں تک کہ اسی دار و گیر اور پیچ و تاب میں تمہاری
کھال تک اتر جاتی تھی۔ اس وقت کچھ دیر کے لئے باہر نکال کر تم کو دم دیا جاتا تھا۔ اس کے
بعد پھر مشین میں کس دیا جاتا تھا۔ اور مشین چھیل چھیل کر تمہارے لمبے لمبے پرت بنا دیتی تھی اور
پھر وہ پرت دوسری کل میں ڈال کر کترے جاتے تھے۔ اس طرح اس حرکت میں تم جیسی ہزاروں
ہستیاں عالم وجود میں آجاتی تھیں۔ نہ رو گندھک اور سرخ مصالحہ کا لباس بھی کچھ عزت
سے نہیں پہنایا جاتا تھا۔ بلکہ سرنگوں کرکے گرم گرم گندھک اور مصالحے میں تمہاری ناک
ڈبو دی جاتی تھی۔ اس پر یہ مزاج! اکو بیگم کہلانے کی آرزو۔ کھیچی کی ڈبیا میں تپتے رہتے
یہ دماغ ہو گیا۔ ابھی کوئی شخص بکس کی کالی مٹی سے منہ یا رگڑ کر پھینک دیگا۔ پھر
جو آئے گا پاؤں میں مسلتا آئے گا۔

حضرت! آپ کو تو غصہ آگیا خفگی کی کیا بات ہے۔ جو چیز جہاں ہو اسی سے منسوب
ہوتی ہے۔ میں مسلمانوں کی خانہ زاد ہوں۔ اگر "رانی" کے مقابلہ میں بیگم کے لفظ کو پسند
کروں تو کیا گناہ ہے۔ یہ سب نام کی بحث ہے۔ کام دیکھنا چاہیے۔ سو جیسا مسلمانوں کا
کام کرتی ہوں ویسے کم و کاست ہندوؤں کا بھی بجالاتی ہوں یہاں تک کہ میرے مشرب میں
دیسی بدیسی گورے کالے کا فرق بھی جائز نہیں۔ مندر میں میرے دم سے روشنی ہے
اور مسجد میں بھی۔ راجہ اور نواب کے محل کی تاریکی بھی دور کرتی ہوں اور ایک غریب کے

جھونپڑے میں بھی میرے سبب اُجالا ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ بے حقیقت ہوں اور بے بسی کے عالم میں انسانی کلوں سے عرصہ تک بے کل رہی ہوں تو یہ کچھ مجھی پر منحصر نہیں آپ پر بھی یہ بپتا پڑ چکی ہے۔ بلکہ آپ کی مجھ سے زیادہ درگت ہوئی ہے۔ کیا یاد نہیں کہ بیرم کی آری نے خنجر راز سے کاٹا۔ اور نو مہینے شکم مادر کے چشمہ میں آپ بھی جوش کھاتے رہے اور پھر برسوں پرت در پرت کے چکر میں گردش رہی۔ میرے "رانی" اور "بیگم" کے لفظ سے اتنے چونکے ذرا اپنی ہٹ دھرمی کو دیکھئے کہ فقط نام اور لفظ کے فرق سے آپ کے کاموں میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ جو کالا کرتا ہے وہ گوارا کرنا نہیں چاہتا جو مسلمان کو پسند ہے۔ اس سے ہندو کو نفرت ہے اور غریب و کمزور ہونا تو گویا دائرۂ آدمیت سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس کو دنیا میں رہنے اور انسان کہلانے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا ہے۔

بس بس خاموش رہو بی فتنی ہو تو اتنی ذرا سی۔ مگر زبان بارہ ہات کی ہے۔ لگیں حد سے گزرنے۔ تم کیا جانو کہ آدم زاد کی کیا عالی شان ہے۔

مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئی ہو تو قرآن میں سنا ہوگا کہ خدا نے آدمی کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور تمام اسرار کا علم اسکو بخشتا ہے بس یہ جو کچھ کرتا ہے۔ عین منشائے الٰہی کے مطابق کرتا ہے۔ کیونکہ سب کاموں کی حقیقت اس کو معلوم ہے

اوہو! آپ کو یہ غرہ بھی ہے۔ بیشک آپ خلیفہ خدا ہیں۔ مگر سب چیزوں کی حقیقت آپ کو معلوم نہیں۔ قرآن میں تو یہ آیا ہے کہ آدمی کو سب چیزوں کے نام بتائے گئے ہیں۔ یہ کہاں ہے کہ اصلیت بھی بتا دی گئی ہے اگر اصلیت اور حقیقت معلوم ہے تو بتاؤ کہ بجلی کیا چیز ہے۔ وہ تو غلاموں کی طرح آپ کی خدمت کرتی ہے۔ اور اس کی تابعداری پر آپ کو گھمنڈ بھی بہت بڑا ہے۔ مگر آج تک آپ کو یہ خبر نہیں کہ یہ کیا چیز ہے اور چند حرکتوں سے کیونکر ظاہر ہو جاتی ہے۔

خیر بجلی تو بڑی چیز ہے تنکے کے اسرار سے بھی آپ ناواقف ہیں کہ ذرا سی رگڑ میں

یہ نورانی شعلہ کہاں سے آجاتا ہے محض غلط ارشاد ہے کہ آپ کے سب کام عین مرضی الٰہی کے مطابق ہوتے ہیں۔ خدا کی ہوا عام ہے۔ پانی اور روشنی عام ہے۔ جنگل اور دریا عام ہیں۔ مگر آپ کی ذات شریف ان سب چیزوں کو اپنے لئے مخصوص کر لینا چاہتی ہے۔ آپ کی خواہش ہوتی ہے کہ روٹی۔ پانی۔ ہوا۔ سب میرے قبضے میں ہو جسکو چاہوں دوں اور جسکو چاہوں محروم کروں۔ ایک آدمی کروروں روپے خزانوں میں بند رکھتا ہے اور لاکھوں آدمی بھوک سے مر جاتے ہیں۔ مگر وہ خود غرض کچھ پروا نہیں کرتا اپنی ہوس اور طمع کے جوش میں نام اور نشان کے شوق میں لاکھوں ہم جنسوں کو فنا کر ڈالتا ہے تو کیا خدائی خلافت کا ان ہی اعمال سے دعویٰ کیا جاتا ہے اور کیا یہ باتیں منشائے پروردگار کے موافق ہیں حضرت آپ ہزاروں لاکھوں سجدے کرتے ہیں مگر آپکا سرکش وجود ویسا ہی باقی موجود رہتا ہے۔ مجھ کو دیکھئے کہ ایک ہی سجدے میں مقبول ہو جاتی ہوں۔ اور تجلی اس چھوٹی سی شکل کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔

خدا تمہاری طرار زبان کو چلتا رکھے۔ میں ہارا تم جیتیں اچھا تو لاؤ اندھیرا زیادہ ہو گیا میرے کلبہ تاریک کو تجلی راز سے روشن کر دو۔

کھٹکہ

(از رسالہ صوفی ۱۹۰۹ء)

لوگ کہتے ہیں زندگی وہ اچھی جس میں کسی بات کا کھٹکہ نہ ہو بلکہ ایسی زندگی کو بہشت سے تشبیہہ دیجاتی ہے۔ کیونکہ بہشت میں فکر و تردد کا کھٹکا نہ ہوگا شعر ہے

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد — کسے را با کسے کارے نباشد

ہر شخص کا اپنے کام میں مست و سرشار رہنا اور کسی سے کچھ علاقہ نہ رکھنا بہشتی زندگی ہے۔ مگر اس جہان کو اختلاف سے زیبائش ہے۔ ایسے آدمی بھی اس دنیا کے پردہ پر

ہوتے ہیں جو بے کھٹکہ رہنا عیش سمجھتے ہیں اور ایسا گروہ بھی موجود ہے جو

کھٹکہ وار گزران

کا شیدائی ہے۔ اس کو جینا مرنا۔ چلنا پھرنا۔ ہنسنا بولنا۔ کھانا پینا۔ الغرض کوئی بات ہو
کھٹکے کے بغیر بے مزہ اور پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ اور انصاف یہ ہے کہ کھٹکہ پسند جماعت
حق بجانب ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دین و دنیا کا کارخانہ کھٹکہ پر چل رہا ہے۔ موجودات
محسوسات ذرا اور آگے بڑھ کر حیوانات وغیرہ کی تمام نوعیں کھٹکہ سے ظاہر ہوئیں۔ کھٹکہ
سے قائم رہتیں اور کھٹکہ ہی سے فنا ہو جاتی ہیں۔ حیوانات میں انسان کو دیکھئے کھٹکہ اس پر
بھی محیط ہے ہر سانس میں کھٹکہ کا سلسلہ موجود ہے ۔

کھٹکے کی خارجی مثالیں

کسی بڑے تار گھر میں چلے جایئے۔ ہزاروں کھٹکے سنائی دیں گے انسانی انگلیاں
حرکت کر رہی ہونگی اور کھٹکے کی گونج ان سے نکل رہی ہوگی۔ آواز سب کی ایک
انگلیوں کی حرکت بھی یکساں۔ لیکن کاغذی نقوش کو ملاحظہ کیجئے یہاں آکر کھٹکہ
رنگ برنگ کی صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ کہیں لکھا ہے ۔ زید کو لاکھ روپیہ کا فائدہ
ہوا۔ کسی میں درج ہے ۔ ،، عمرو ہلاک ہو گیا ہے ، ایک کھٹکہ کے مختلف ظہور اور
نتیجے کاغذ پر ہویدا ہوتے ہیں جن لوگوں کو اس

برقی کھٹکے کا عرفان

ہے وہ تو صرف آواز سُنکر نیک و بد کا فرق محسوس کر لیتے ہیں مگر ناواقف حیران
ہوتے ہیں اور بعض اوقات شک و شبہ کرتے ہیں کہ ایک ہی کھٹکے سے مختلف خبریں کیونکر

بن گئیں۔ جو کھٹ کھٹ خوشی کے تار میں سنائی دیتی تھی وہی غم کی اطلاع میں سُنی
گئی۔ اتنا بین فرق کس طرح ہو گیا۔ حقیقت آشنا تار بابو ان نادان لوگوں کے شک و
شبہ کی کچھ پروا نہیں کرتے اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں ۔

اسی تار کے کھٹکے میں وحدت و کثرت کا سبق موجود ہے۔ جس میں آج کل کے
بعض کم فہم انسان اُلجھ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ واحد کثرت میں ظاہر ہو کر واحد کیونکر
رہ سکتا ہے۔ حالانکہ وہ اگر ذرا سا غور کریں تو معلوم ہو جائے کہ دہلی سے کلکتہ تک
دو سو تار گھر ہیں ایک بابو دہلی میں بیٹھ کر کلکتے کو تار دیتا ہے۔ بس جس وقت اس کی
انگلی حرکت کر کے ایک کھٹکہ پیدا کرتی ہے تو کلکتے تک ہر تار گھر میں وہ کھٹکہ پیدا
ہو جاتا ہے وہی کھٹکہ دہلی میں۔ وہی کلکتہ اور وہی درمیانی تار گھروں میں کھٹکہ
میں ذرہ بھر کمی بیشی نہیں ہوتی ۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کھٹکے سے دو سو کھٹکے پیدا ہو گئے مگر حقیقت میں وجود ایک
ہی ہے۔ احمق سے احمق آدمی بھی جس کو تار کے معاملہ سے تھوڑی سی آگاہی ہے نہیں
کہہ سکتا کہ کھٹکا تقسیم ہو گیا۔ اور اس کی وحدت میں کچھ فرق آ گیا۔ پھر ذات واحد
کے کثرتی ظہور سے اس کی وحدت میں کیا نقصان ہو سکتا ہے ۔

گھڑی کا کھٹکہ

یہ سامنے والی دیوار کے سہارے دم لینے والی گھڑی بھی دیکھی۔ سانس کا کھٹکہ
چل رہا ہے اور سوئی کی گردش وقت کاٹ رہی ہے۔ ہر کھٹکا فنر کی پیچیدہ طاقت
کا ایک حصہ کم کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن یہی ننھا منا کھٹکہ گھڑی کی سب
طاقت ختم کر کے اس کو خاموش کر دے گا ۔

رات کے اندھیرے میں جب کوئی مونس و غم خوار پاس نہ ہو کھٹکے دار گھڑی

کو پاس رکھ لیجئے۔ دیکھئے یہ کھٹکا کیا لطف دیتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ گھڑی کی زندگی بھی کھٹکے سے معلوم ہوتی ہے اور موت کا باعث بھی یہی کھٹکا ہوتا ہے۔ انسان کو گھڑی سے تشبیہ دی جائے تو مشابہت بہت ہی ٹھیک اور موزوں ہوگی گھڑی کی بناوٹ اور کل پرزے سب انسانی اعضاء کی ساخت سے نکلے ہیں پھر بھلا نقل تو کھٹکے سے بجے۔ کھٹکے سے مرے اور اس کھٹکے سے لوگوں کو فائدہ پہونچے اور اصل یعنی انسان کھٹکے سے محروم سمجھا جائے اور بے کھٹکے زندگی کو بہشتی کہا جائے یہ کہاں کی عقل مندی ہے۔

گراموفون کا کھٹکہ

غیبی آواز سے خود بخود بولنے والا باجہ گراموفون جو نئے زمانے کی لاثانی اور عجیب ایجاد تصور کیا جاتا ہے۔ نوکدار کھٹکے سے بولتا ہے۔ ایک سوئی کی نوک ریکارڈ کی چکلانے والی تختی پر کھٹکے دار ضرب میں لگاتی ہے اور مومی پیکر کی مخفی آواز کو عیاں کردیتی ہے پھر دیکھئے کہ کیا کیا عجیب وغریب صدائیں نکلتی ہیں۔ آج کل کے خوش باش انسان گراموفون کے بغیر زندگی بسر نہیں کرسکتے۔ مگر ان میں کسی کی اس کھٹکے پر توجہ نہیں ہوتی جس کے طفیل باجے کا کاروبار چلتا ہے۔ حالانکہ ہر بار سوئی انسان خود ہی بدلتا ہے۔ اگر وہ ادھر توجہ کرے تو اپنے وجود کے کھٹکے کا حال بھی ایک دن معلوم کرلے۔

انسانی کھٹکا

ان خارجی مثالوں کے بعد خود انسان کے اندرونی کھٹکے کو دیکھنا چاہیئے کہ یہ نادان بے کھٹکے زندگی پر مرا جاتا ہے۔ حالانکہ زندگی بغیر کھٹکے کے بالکل نکمی اور

بیکار ہے۔ آدمی کے تمام دینی و دنیاوی افعال کسی سبب سے ہوتے ہیں نوکری کرتا ہے تاکہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالے۔ اسی طرح دنیا کے سب دھندے کسی سبب کے ماتحت ہیں۔ تو یہ سبب اس شخص کے لئے ایک کھٹکا ہے بظاہر تو یہ کھٹکا اس کو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں یہ کھٹکا نہ ہو تو جاہل آدم زادہ ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھ جائے اور کچھ کام نہ کرے۔

دینی امور کا بھی یہی حال ہے۔ دوزخ کے خوف۔ بہشت کے لالچ۔ خدا کی رضامندی کی طمع۔ غرض اس کے اعمال کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ یہی اس کے لئے کھٹکا ہے جس کے بغیر یہ سب اعمال جن سے انسان کی روحانی زندگی وابستہ ہے چل نہیں سکتی۔

کھٹکے کے باطنی اسرار

جو اسرار کھٹکے کے وجود میں پائے جاتے ہیں ان تک رسائی ممکن ہے مگر ان کا بیان کرنا بہت دشوار ہے۔ کیونکہ ان کا تعلق زیادہ تر کیفیت اور حال سے ہے۔ جو قال اور الفاظ میں نہیں سما سکتی۔ اس لئے ہم باطنی کھٹکے کا صرف ایک حصہ بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

زندگی کا مسلسل لطف

آدمی جگہ جگہ تلاش کرتا پھرتا ہے۔ اور اپنے اندر کی طلسماتی زنجیر کو حاصل نہیں کرتا۔ جس میں اسکو ساری دنیا کی مزیدار کیفیتیں حاصل ہوسکتی ہیں۔ ہر سانس جو جسم کے اندر جاتا اور باہر آتا ہے اگر اس کی قدر کی جائے تو لازوال نعمت ہے بشرطیکہ اس میں لوچدار کھٹکہ بھی پیدا ہو جائے۔

جوگی حبسِ دم وغیرہ طریقوں سے اِس سانس کو اپنے قابو کا بنا لیتے ہیں اور پھر ساری خلقت سے بے پرواہ ہو کر جنگل میں منگل کرتے ہیں۔ اور انند کے تار بجاتے ہیں۔ مسلمان درویش باوجود فقر و فاقہ کے مست و سرشار رہتے ہیں محض اس سانس کی بدولت جس میں ذکر الٰہی لہرایا کرتا ہے اور ان کو ہر وقت مسرور رکھتا ہے ۔

پوچھا جائے گا کہ کس طریق سے سانس میں لوچ پیدا ہوتا ہے۔ اور کیونکہ یہ مزیدار کھٹکا حاصل ہو سکتا ہے؟ مگر یہ سوال بھی ایسا ہی ہے۔ جیسے باطنی کھٹکے سے بے خبری۔ اخباروں کے مضمون میں یہ باتیں لکھنی دشوار ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ذکر جہر اور ذکر خفی جس کو پاس انفاس بھی کہتے ہیں سانس میں پر لطف کھٹکا پیدا کر دیتا ہے اور پھر انسان مسلسل لطف کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے ۔

جس وقت یہ کھٹکا انسان کے دم سے وابستہ ہو جاتا ہے پھر زندگی بے کھٹکے گزرنے لگتی ہے۔ جس کی اکثر لوگوں کو خواہش ہے ۔

خدائی گراموفون

(از رسالۂ صوفی سنہ ۱۹۰۹ء)

مسٹر ایڈیسن کو دعوےٰ ہے کہ اس نے گراموفون ایجاد کر کے ثابت کر دیا کہ انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ بیجان کا بولنا ایک زمانے میں معجزہ اور دوسرے عہد میں کرامت شمار ہوتا تھا۔ آج ایڈیسن معجزہ و کرامت کا انکار کر کے یہ عجیب چیز پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ محض عقل انسانی کا ظہور ہے۔ کسی غیبی طاقت کو اس میں دخل نہیں"

ہم ایڈیسن سے دریافت کرتے ہیں کہ عقل انسان کہاں سے آئی؟ جس نے یہ

کرشمہ ظاہر کیا۔ اس کا دار و مدار بھی ایک پراسرار طاقت پر ہے۔ پس کہہ سکتے ہیں کہ جس کرشمہ کا نام ایک وقت میں معجزہ۔ دوسرے وقت میں کرامت تھا۔ آجکل کے زمانہ میں اس کا نام ظہور عقل یا سائنس کا تماشا ہے۔ تینوں ناموں کے باطنی معانی میں کچھ فرق نہیں ۔

اصل میں خود انسان حضرت ایزد کا گراموفون باجہ ہے۔ جب اس سرا پا عقل و سائنس خدا کو منظور ہوا کہ آواز ہوا اپنے کان سے سُنے۔ اس نے خاکی ریکارڈ بنائے اور ان میں نفخت فیہ من روحی کی صدا بھر دی اور پھر اس کو ایڈیسن کے مومی ریکارڈ کی طرح ایک گردش میں مبتلا کر دیا ۔

بعض ریکارڈ ہیں جن میں سنسکرت زبان سے روح الٰہی ظاہر ہوتی ہے اور وید کے نام سے مشہور ہوئی ہے۔ بعض ہیں جو عبرانی و عربی کے ذریعہ سے انجیل و توریت و قرآن کہلاتے ہیں۔ غرض خیر و شر۔ خشک و تر۔ مہذب و غیر مہذب سب کچھ ان ریکارڈوں میں موجود ہے۔ خود میاں ایڈیسن بھی خدائی باجے کا ایک ریکارڈ ہیں۔ ذرا غور کریں تو ان کو بھید مل جائے ۔

مچھّر

(از رسالۂ صوفی سنہ ۱۹۱۰ء)

یہ بھنبھناتا ہوا ننھا سا پرندہ بہت ستاتا ہے۔ رات کی نیند حرام کر دی ہے۔ ہندو مسلمان عیسائی یہودی سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ ہر روز اس کے مقابلہ کے لیے مہمیں تیار رہتی ہیں۔ جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں مگر مچھروں کے جرنل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ شکست پر شکست ہوئی چلی جاتی ہے ۔

اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ذرا سے بھنگے پر قابو نہیں پا سکتا۔ طرح طرح کے مسالے بھی بناتا ہے کہ ان کی بو سے مچھر بھاگ جائیں۔ لیکن مچھر اپنی یورش سے باز نہیں آتے۔ آتے ہیں اور نعرے لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ بیچارا آدم زاد حیران رہ جاتا ہے۔

امیر غریب ادنیٰ۔ اعلیٰ۔ بچے۔ بوڑھے۔ عورت۔ مرد کوئی اس کے وار سے محفوظ نہیں۔ یہاں تک کہ آدمی کے پاس رہنے والے جانوروں کو بھی اس کے ہاتھ سے ایذا ہے۔ مچھر جانتا ہے کہ دشمن کے دوست بھی دشمن ہوتے ہیں۔ ان جانوروں نے میرے دشمن کی اطاعت کی ہے تو میں ان کو بھی مزا چکھاؤں گا۔

آدمیوں نے مچھروں کے خلاف ایجیٹیشن کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ہر شخص اپنی سمجھ اور عقل کے موافق مچھروں پر الزام رکھ کر لوگوں میں ان کے خلاف جوش پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مگر مچھر اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔

طاعون نے گڑبڑ مچائی تو انسان نے کہا کہ طاعون مچھر اور پسو کے ذریعہ سے پھیلتا ہے۔ ان کو فنا کر دیا جائے تو یہ ہولناک بلا دور ہو جائے گی۔ ملیریا پھیلا تو اس کا الزام بھی مچھر پر عائد ہوا۔ اس سرے سے اس سرے تک کالے گورے آدمی غل مچانے لگے کہ مچھروں کو مٹا دو۔ مچھروں کو کچل ڈالو۔ مچھروں کو تہس نہس کر دو۔ اور ایسی تدبیریں نکالیں جن سے مچھروں کی نسل ہی منقطع ہو جائے۔

مچھر بھی یہ سب باتیں دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔ اور رات کو ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھے ہوئے "پانیر" کو آکر دیکھتا اور اپنی برائی کے حروف پر بیٹھ کر اس خون کی ننھی ننھی بوندیں ڈال جاتا جو انسان کے جسم سے یا خود ڈاکٹر صاحب کے جسم سے چوس کر لایا تھا۔ گویا اپنے قاعدہ کی تحریر سے انسان کی ان تحریروں پر شوخیانہ ریمارک لکھ جاتا۔ کہ میاں تم میرا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

انسان کہتا ہے کہ مچھر بڑا کم ذات ہے۔ کوڑے۔ کرکٹ۔ میل کچیل سے پیدا ہوتا۔ گندی موریوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اور بزدلی تو دیکھو اس وقت حملہ کرتا ہے۔ جب کہ ہم سو جاتے ہیں۔ سوتے پر وار کرنا۔ بے خبر کے چرکہ لگانا۔ مردانگی نہیں انتہا درجے کی کمینگی ہے۔ صورت تو دیکھو۔ کالا بھتنا۔ لمبے لمبے پاؤں بے ڈول چہرہ اس شان و شوکت کا وجود اور آدمی جیسے گورے چٹے۔ خوش وضع پیاری اداؤں کی دشمنی بے عقلی اور جہالت اسی کو کہتے ہیں۔

مچھر کی سنو تو وہ آدمی کو کھری کھری سناتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ جناب ہمت ہے تو مقابلہ کیجئے۔ ذات صفات نہ دیکھئے۔ میں کالا سہی۔ بد رونق سہی۔ نیچ ذات اور کمینہ سہی مگر یہ تو کہئے کہ کس دلیری سے آپ کا مقابلہ کرتا ہوں اور کیسا نکو بنا کے ناک میں دم کرتا ہوں۔

یہ الزام سراسر غلط ہے کہ بے خبری میں آتا ہوں۔ اور سوتے میں ستاتا ہوں۔ یہ تو تم اپنی عادت کے موافق سراسر ناانصافی کرتے ہو۔ حضرت میں تو کان میں آکر "الٹی میٹم" دیتا ہوں کہ ہوشیار ہو جاؤ۔ اب حملہ ہوتا ہے۔ تم ہی غافل رہو۔ تو میرا کیا قصور۔ زمانہ خود فیصلہ کر دیگا کہ میدان جنگ میں کالا بھتنا۔ لمبے لمبے پاؤں والا۔ بے ڈول فتحیاب ہوتا ہے یا گورا چٹا آن بان والا۔

میرے کارناموں کی شاید تم کو خبر نہیں کہ میں نے اس پردۂ دنیا پر کیا کیا جوہر دکھائے ہیں۔ اپنے بھائی نمرود کا قصہ بھول گئے۔ جو خدائی کا دعویٰ کرتا تھا۔ اور اپنے سامنے کسی کی حقیقت نہ سمجھتا تھا۔ کس نے اس کا غرور توڑا۔ کون اس پر غالب آیا۔ کس کے سبب اس کی خدائی خاک میں ملی۔ اگر آپ نہ جانتے ہوں تو اپنے ہی کسی بھائی سے دریافت کیجئے۔ یا مجھ سے سنئے کہ میرے ہی ایک بھائی مچھر نے اس سرکش کا خاتمہ کیا تھا اور تم تو ناحق بگڑتے ہو۔ اور خواہ مخواہ اپنا دشمن تصور کئے لیتے ہو۔ میں تمہارا مخالف نہیں ہوں۔ اگر تم کو یقین نہ آئے تو اپنے کسی شب بیدار صوفی بھائی سے دریافت کرلو۔

دیکھو وہ میری شان میں کیا کہے گا۔ کل ایک شاہ صاحب عالمِ ذوق میں اپنے ایک
مرید سے فرما رہے تھے۔ کہ میں مچھر کی زندگی کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ دن بھر بیچارہ
خلوت خانہ میں رہتا ہے۔ رات کو جو خدا کی یاد کا وقت ہے باہر نکلتا ہے۔ اور پھر تمام
شب تسبیح و تقدیس کے ترانے گایا کرتا ہے۔ آدمی غفلت میں پڑے سوتے ہیں تو اسکو
ان پر غصہ آتا ہے۔ چاہتا ہے کہ یہ بھی بیدار ہو کر اپنے مالک کے دیے ہوئے اس سہانے
خاموش وقت کی قدر کرے اور حمد و شکر کے گیت گائے۔ اس لئے پہلے ان کے کان
میں جا کر کہتا ہے۔ اٹھو میاں اٹھو جاگو۔ جاگنے کا وقت ہے۔ سونے کا اور ہمیشہ سونے
کا وقت ابھی نہیں آیا۔ جب آئے گا تو بے فکر ہو کر سونا۔ اب تو ہوشیار رہنے اور کچھ
کام کرنے کا موقع ہے۔ مگر انسان اس سریلی نصیحت کی پرواہ نہیں کرتا۔ اور سوتا
رہتا ہے تو مجبور ہو کر اس کے غیظ و غضب میں اس کے چہرہ اور ہاتھ پاؤں پر ڈنک
مارتا ہے۔ پرواہ رے انسان۔ آنکھیں بند کئے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ اور
بے ہوشی میں بدن کو کھجا کر پھر سو جاتا ہے۔ اور جب دن کو بیدار ہوتا ہے تو بیچارے
مچھر کو صلواتیں سناتا ہے کہ رات بھر سونے نہیں دیا۔ کوئی اس دروغ گو سے پوچھے
کہ جناب عالی کے کُے سکنڈ جاگے تھے۔ جو ساری رات جاگتے رہنے کا شکوہ ہو رہا ہے۔

شاہ صاحب کی زبان سے یہ عارفانہ کلمات سنکر میرے دل کو بھی تسلی ہوئی۔
کہ غنیمت ہے ان آدمیوں میں بھی انصاف والے موجود ہیں۔ بلکہ میں دل ہی میں
شرمایا کہ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ یہ شاہ صاحب مصلے پر بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے ہیں۔
اور میں ان کے پیروں کا خون پیا کرتا ہوں۔ یہ تو میری نسبت ایسی اچھی اور
نیک رائے دیں اور میں ان کو تکلیف دوں۔ اگرچہ دل نے یہ سمجھایا کہ تو کاٹتا تھوڑی
ہے قدم چومتا ہے۔ اور ان بزرگوں کے قدم چومنے کے ہی قابل ہوتے ہیں۔ لیکن اصل
یہ ہے کہ اس سے میری ندامت دور نہیں ہوتی۔ اور ابتک میرے دل میں اسکا افسوس باقی ہے

سو اگر سب انسان ایسا طریقہ اختیار کریں جیسا کہ صوفی صاحب نے کیا تو یقین
ہے کہ ہماری قوم انسان کو ستانے سے خود بخود باز آجائے گی۔ ورنہ یاد رہے کہ میرا
نام مچھر ہے۔ لطف سے جینے نہ دوں گا۔ اور بتادوں گا کہ کمین اور پنچ ذات ادنٰی درجہ
والوں کو پریشان اور بے چین کرسکتی ہے۔

لا

(از رسالہ نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۱ء)

انگریزی زبان میں اس سربلند لفظ کے معنی قانون اور ضابطہ کے ہیں۔ عرب
والے انکار اور نفی کے وقت اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اہل اردو تحکمانہ طلب کے
موقعہ پر لا بولتے ہیں۔ مگر لام الف کے دو حرفی لفظ کی اصلی شان پر بہت کم لوگوں
کو توجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ آج دو چار ساعت اس کی حقیقت پر غور کریں۔
اول تو ذرا اس لفظ کی ظاہری صورت پر نظر ڈالئے کیسا مغرور اور متکبر وجود
ہے۔ شاعرانہ مدح سرائی کرنی ہو تو سرو بالا قد کہہ کر جی خوش کر لیجئے۔ مگر حضرت لا میں
سرو کی سی لچک کہاں۔ سرو گو خود سر درخت ہے۔ تاہم ہوا کے جھونکوں سے اس کے
ننھے ننھے پتے جنبش میں آجایا کرتے ہیں۔ برخلاف لا کے کہ یہ کسی ہوا کے جھونکے
سے نہیں ہلتا اور مضبوطی سے بے حس و حرکت قدم جمائے کھڑا رہتا ہے۔ لا نہیں جانتا
کہ اس کے پیروں میں کون پڑا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنا سر نخوت سے اونچا رکھتا ہے۔

انگریزی زبان میں جس کام کے لئے یہ مستعمل ہے اس کی ضد اور ہٹ کو کون
نہیں جانتا۔ سارا زمانہ ایک منہ ہو کر چیخے چلائے مگر میاں لا کے حکم کے سامنے کسی
کی نہیں چلتی۔ جو لوگ جناب لا کے حقایق و معارف سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔ وہ
اول تو برسوں اسکول و کالج کی خانقاہ میں راتوں کو جاگ جاگ کر لا کے ذکر اذکا

میں مشغول رہتے ہیں۔ اس کے بعد لندن کی سب سے بڑی خانقاہ میں جا کر وہاں کے حلقہ ذکر میں تین سال گزارتے ہیں۔ جب کہیں ان کو خرقہ لا کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ یہ خرقہ اور سند خلافت لے کر اپنے ملک میں آتے ہیں۔ اور آبادی سے الگ ایک خلوت خانہ لے کر رہتے ہیں۔

اس کے بعد کیا ہوتا ہے یہ نہ پوچھئے۔ ورنہ مسٹر لار کا نیا تازیانہ سامنے آجائیگا۔ اگر آپ اس کوڑے سے نہیں ڈرتے اور آزادانہ تحقیقات چاہتے ہیں تو سن لیجئے کہ خرقہ پوشان لا اپنے خلوت خانوں میں ہزاروں مکر و فریب کی کمندیں بچھاتے ہیں۔ اور انجان بھولی بھالی چڑیوں کو جال میں پھانستے ہیں۔ لا کی قینچی سے جیبیں کترتے ہیں۔ لا کے استرے سے سر مونڈتے ہیں۔ اور ممکن ہوتا ہے تو لا کے پستول کی گولی سے بے زبان جانور شہید کر ڈالتے ہیں۔

لا کے سیاہ خرقہ والے بزرگ کے کمالات اور کرامتیں اس قدر زبردست اور مستند ہیں کہ کوئی دہریہ اور ملحد ان کے انکار کی مجال نہیں رکھتا۔ سب مانتے ہیں کہ لا کے تصرفات باطنی بالکل سچے اور یقینی ہیں۔ لا دن کو رات اور رات کو دن بنا سکتا ہے۔ لا ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم ثابت کر سکتا ہے۔ لا کے ایک ادنیٰ اشارۂ چشم میں بے گناہ پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں۔ اور لا ہی اگر چاہے تو اصلی مجرم کو دار سے اُتروا لے۔

عرب کا لا مصر و اسرائیل ہے۔ انگریزی لا کی اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں۔ ایک ہی ضرب میں لا ر انگلش کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔ انگریزی لا ر کی بساط ہی کیا ہے جو عربی لا ر کے سامنے آسکے۔ عربی لا تو وہ بلا ہے جو خداؤں پر چوٹ کرتا ہے اور ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔ کس خدا کی طاقت ہے جو لا ر عرب کے مقابلہ میں ٹھہر سکے۔ خداوند لات خداوند منات خداوند عزیٰ تینوں ایک دفعہ مل کر حجاز کے میدان میں

اس پہلوان لا کے سامنے آ گئے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ اپنی خدائی کو اس کانٹے سے صاف کر دیں۔ مگر جوں ہی لا نے اپنی گرجدار آواز نکالی۔ تینوں خدا سر کے بل اوندھے زمین پر گر گئے ہیں عرب کے اس لا میں یہ طاقت غیبی خزانے سے آگئی ہے۔ اور یہ وہ خزانہ ہے جو کنج وحدت میں مخفی ہے۔ اس خزانہ میں لازوال اور بے شمار دولت ہے۔ جو الف کی تھیلیوں میں رہتی ہے۔ جب اس کنز مخفی کو لام معرفہ میں زور پیدا کرنا منظور ہوا تو اس نے اپنے خزانے کا ایک الف اس کے آخر میں لگا دیا۔ یہ اسی الف کی قوت ہے جس کے بل پر لائے عرب دنیا کا بے مثل شہ زور مانا جاتا ہے۔ لائے عرب کو کنز مخفی کا حکم ہے کہ ہر وجود کو نابود کر دے۔ چنانچہ جب یہ حکم بجا لاتا ہے تو صلۂ خوشنودی میں اس لا کو دوسرا الف عطا ہوتا ہے۔ جو لا کے اول میں چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ لاے اِلّا بن جاتا ہے۔ اور جوں ہی اِلّا بنا اس کے سامنے سے تمام حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ اور کنز مخفی اس کے ذاتی ظہور کے لفظ اللہ میں وصلت کا شرف عطا فرماتا ہے۔ اور لوگ الا اللہ کے نعروں سے اس کی تشہیر کرتے ہیں۔

آپ نے سنا ہے عرب کے لا کا فسانہ۔ عرب کے کلمہ گو اور دنیا کے وہ سب آدمی جو ان کی ہمنوائی پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لا کا ورد یوں کرتے ہیں لا الٰہ الا اللہ گویا ہر شخص لا کی ضرب سے سب خداؤں کی نفی کر کے ایک خدا کا وجود قائم کرتا ہے اور فنا کے بعد بقا کا تماشہ دیکھتا ہے۔

اردو کا لا سوائے تکلمانہ طلب کی شان کے اور کوئی شان نہیں رکھتا۔ اس کا ذکر کرنا فضول ہے۔ بس ان میاں کی تو اتنی ہستی ہے کہ ذرا کڑک کے بولے کہ ہم کو بھی لا کی بحث میں لا سے آئے مگر لانے کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ خیر الامور اوسطہا درمیانی لا خوب تھا۔ یہ ہم کو بہت پسند آیا۔ اب خدا کرے جس دن ہم سب کے جسم سے جان نکلے تو لا الٰہ الا اللہ جھولے میں جھول رہا ہو۔ کبھی جھونٹا لے کر زبان پر آئے۔ اور کبھی

دل میں جائے۔ اور چاروں طرف وحدت کے ترانوں کا شور ہو۔ آمین۔

مکھی

(از رسالہ صوفی اگست ۱۹۱۱ء)

دیکھنے میں بھنبھناتا ہوا ذرا سا پرندہ ہے۔ بلکہ پرندہ کا لفظ بھی اس ننھی سی ہستی پر زیبا نہیں۔ یوں سمجھئے کہ ایک ناچیز و غلیظ و مکروہ بھنگا ہے۔ مگر نظر تعمق سے دیکھو تو عرفان قدرت کا پُر اسرار نوشتہ ہے۔

مکھیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم شہد کی مکھیوں کی ہے۔ دوسری قسم وہ مکھیاں ہیں جو انسان کے ساتھ بود و باش رکھتی ہیں۔ تیسری قسم مکھیاں قبروں۔ قتل گاہوں۔ ذبح خانوں وغیرہ مقامات میں رہتی ہیں۔

قسم اول شہد کی مکھی آدمی کو طریق تمدن سکھانے والی اور بڑی عقلمند ہے۔ قرآن شریف میں ایک سورت اس کے نام سے منسوب ہے۔ اس مکھی کے ضابطے اور قانون انسان کو حیرت میں ڈالتے ہیں۔

آدمی جوں جوں ترقی کرتا ہے قدامت کے اصول سے منحرف ہوتا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ تمام دنیا میں شخصی حکومت کا دور دورہ تھا۔ یا اب یہ وقت ہے کہ خود مختاری اور مساوات کی روح ہر شخص میں سرایت کر گئی ہے۔ جس کو دیکھئے ہمچو من دیگرے نیست، کا راگ گاتا ہے۔ یورپ میں ان خیالات کا بڑا زور ہے۔ وہاں کے باشندے آزادی کی ترنگ میں کسی کی برتری گوارا نہیں کرتے۔ اکثر مقامات میں جہاں بادشاہ کوئی چیز نہیں۔ ہر فرد بشر اپنا آپ حاکم ہے۔ اور اگر کہیں بادشاہ موجود ہے تو اس کا کچھ اختیار نہیں۔ شطرنج کے مہرے کی مثل نام کا بادشاہ ہے۔

اگرچہ اہل یورپ نے عملاً اس کو ثابت کر کے دکھا دیا کہ فرد واحد کی حکومت سے

زیادہ مفید پنچائتی حکومت ہے۔ لیکن یہ عملدر آمد ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ یہ اصول اُسی وقت تک کارگر ہے جب تک خلقت میں علم کا شوق عام ہے۔ اور لوگوں میں اپنے فرض کا احساس باقی ہے۔ جس دن علمی چرچا کم ہوا اور تعیش و آرام طلبی نے جہالت کا بازار گرم کیا۔ اسی روز دیکھ لینا کہ جمہوریت کا سارا شیرازہ درہم و برہم ہو جائے گا۔ اور پھر وہ لوگ جن کے دماغ اور قوئ قدرتاً شاہی و افسری کے قابل ہیں۔ خود مختار بادشاہ بن جائیں گے۔

شہد کی مکھی ابتداء سے خود مختار بادشاہ کے ماتحت ہے۔ آدمی کی طرح رنگ نہیں بدلتی۔ ان مکھیوں کے ہر چھتہ میں ایک حکمراں ملکہ ہوتی ہے۔ جس کے حکم پر ہزاروں مکھیاں گردش کرتی ہیں۔ مکھی ملکہ کا فرمان اشاروں ہی اشاروں میں پورا ہو جاتا ہے۔ اس کو نہ گزٹ میں اعلان کرنے کی ضرورت ہے۔ نہ وائسرائے اور ڈپٹی کمشنر کی معرفت کی تلاش جب ذرا پروں کو حرکت دی۔ اور آنکھوں کو سامنے کر کے بھنبھنائی ذرا سب رعایا تعمیل کے لئے کھڑی ہو گئی۔ مکھی ملکہ کی خوش نصیبی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ اس کے ملک میں نہ کوئی باغی ہے۔ نہ انارکسٹ شورش کنندہ۔ مکھیوں کی شہزادی بڑی کم خوراک ہے۔ رعایا جس قدر شہد جمع کرتی ہے یہ اس میں سے صرف اپنے اور اپنے بچوں کی خوراک لے لیتی ہے۔ باقی رعایا کا حصہ رہتا ہے۔ اگرچہ اس کی رعایا ایسی اطاعت گزار ہے کہ ملکہ کی خواہش اگر ہو تو سارا شہد اس کے حوالے کر دے یا کم از کم جو زاید ٹیکس اُن پر لگایا جائے اس کو بخوشی برداشت کرے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ ملکہ رعیت کے حصے پر بُری نگاہ نہیں ڈالتی اور قناعت سے اپنے حصہ پر زندگی بسر کر لیتی ہے۔

ذرا سننا یہ پھولوں کی ڈالیوں سے کیسی گونج کی آواز آ رہی ہے۔ یہاں تو سوائے مکھیوں کے اور چیز نظر نہیں آتی۔ آ یا سمجھ میں آیا۔ گونج انہی مکھیوں کے پروں کی ہے مگر نہیں بہت سی مکھیاں پھولوں پر میٹھی رس چوس رہی ہیں۔ پروں میں کسی قسم کی حرکت

نہیں۔ اس پر بھی ان میں سے ایک آواز آتی ہے۔ یہ کس چیز کی صدا ہے۔ آپ کو خبر نہیں۔ یہ مکھی کا ترانہ حمد و شکر ہے۔ رزق کہاتی جاتی ہے۔ اور رازق کا شکر ادا کرتی جاتی ہے۔ اسی پر بس نہیں ان کے چھتے میں جا کر دیکھ لینا۔ صبح شام ایک خاص آواز سنائی دے گی۔ وہ ان کی حمد و ثنا ہوتی ہے۔

گھریلو مکھی

اب قسم دوم گھریلو مکھی کو لیجئے۔ جس کو آپ کی اصطلاح میں مگس بھیا کہتے ہیں۔ کیسا ملنسار اور محبت کرنے والی چیز ہے۔ آپ دھکے دیتے ہیں۔ دھتکارتے ہیں۔ اور وہ دامن نہیں چھوڑتی۔ چہرے سے اڑایا تو وہ ہاتھ پر آبیٹھی۔ وہاں سے جھٹکا تو قدموں میں آن گری۔ بہت ہوا تو طواف کرنے لگی۔ اور دو چار چکر لگا کر پھر پہلو میں آگئی۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اس کے ایک پر میں زہر ہے اور دوسرے میں تریاق۔ کہانے میں گرتی ہے تو پہلے زہر دار پر ڈالتی ہے۔ اس لئے حکم ہے کہ اسکو غوطہ دے کر پھینکا کرو۔ تاکہ تریاق کا اثر زہر کو معتدل کر دے۔ کون مسلمان ہے جو اس حدیث کے سننے کے بعد بچاری مکھی پر آنکھیں نہ نکالے گا۔ مگر اس میں اس غریب کا قصور نہیں۔ یہ تو قدرتی بات ہے کہ ایک پر میں زہر رکھا گیا اور دوسرے میں تریاق جب وہ گرتی ہے تو اپنے اختیار سے نہیں گرتی۔ بے قابو ہو کر غوطہ کہاتی ہے۔ ایسی حالت میں محض قدرتی حکمت کا تقاضا ہے کہ زہر دار پر کے رُخ پر گرائی جائے۔

ہندو مذہب سے مکھی کی عداوت

ایک ہندو فقیر نے جو چھوت چھات کی قید سے آزاد تھا بڑی دلچسپ بات کہی کہ یہاں ہندو مذہب والے خواہ مخواہ چھوت چھات کا غل مچاتے ہیں اور اپنے ہمسایہ

مسلمان بھائیوں سے الگ تھلگ رہکر ان کے دلوں کو مکدر کرتے ہیں۔ پہلے کمبخت مکھی کا تو کچھ تدارک کریں جس نے چھوت کے تمام اصول میں گڑبڑ ڈال رکھی ہے مسلمانوں سے ان کی گوشت خوری کے سبب احتیاط کی جاتی ہے۔ مگر مکھی کا کیا علاج جو گوشت پر بیٹھتی ہے۔ اور اسی وقت اُڑ کر برہمن کی رسوئی اور دال بھات کی تھالی میں آجاتی ہے۔ اس پر بس نہیں سارے جہان کے غلیظ اور میلے کچیلے مقامات میں مکھی کا گذر ہے۔ اور اسی حالت میں پاک صاف نہائے دھوئے ہندوؤں کے بدن کپڑے کہانے پر پہنچتی ہے۔ پھر چھوت کہاں رہی اس نابکار نے تو گندے ستھرے کو ایک کر دیا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کچھ علاج سمجھ میں نہیں آتا۔ مسلمانوں سے تو علیحدہ رہنا ممکن مگر اس موذی سے کسی طرح چھٹکارا اور بچاؤ ممکن نہیں۔

فقیر نے کہا سنتے ہیں کہ آدمؑ کے بیٹے نے اپنے بھائی کی لاش کوے سے سیکھکر دفن کی تھی۔ لہٰذا ہندو مکھی سے نصیحت حاصل کریں۔ اور چھوت کے خیال کو چھوڑ کر مسلمانوں سے شیر و شکر ہو جائیں۔

مردار خوار مکھی

مکھی کی تیسری قسم مردار خوار ہے۔ یہ عموماً قبروں اور سڑی ہوئی لاشوں اور قتل گاہوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کے زہر سے خدا بچائے۔ بڑی خوفناک چیز ہے۔ میں تو جب کبھی اس سبز رنگ کی مکھی کو دیکھتا ہوں تو موت کے بعد کا زمانہ یاد آجاتا ہے۔ اور خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ مجھکو اور سب بھائیوں کو مکھی کے عذاب سے بچائے۔

مکھی کے صوفیانہ اوصاف

(۱) جس طرح صوفی لوگ انسان کی روحانی حفاظت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں مکھی

بھی جسمانی محافظ ہے۔ گھروں کی زہریلی چیزوں کو چوس چوس کر صاف کر دیتی ہے۔

(۲) دل میں جذبۂ الفت رکھتی ہے۔ گو پروانہ کی مانند جل مرنا اس کو نہیں آتا تاہم جس گھر میں پیدا ہوئی ہے اس سے دلی محبت رکھتی ہے۔ ہر وقت پاس رہنا چاہتی ہے۔ ہزار تدبیریں اس کو جدا کرنے کی کیجئے مگر یہ دامن نہیں چھوڑتی۔

(۳) متوکل ہے جو مل جائے کھا لیتی ہے۔ در بدر ماری ماری نہیں پھرتی۔

(۴) بہت سویرے بیدار ہوتی ہے۔ اور اپنے محبوب انسان کو غافل دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی۔ اس لئے سوتے میں بار بار چہرہ پر آتی اور بار بار پر مار مار کر بھنبھناتی ہے۔ اور زبان حال سے کہتی ہے۔ اُٹھ پیارے آدمی یہ وقت خدا کی حمد کا ہے۔ دیکھ کیسا سہانا سماں ہے۔ بیدار ہو اور دوگانۂ شکر بجا لا۔ تو اب تک پڑا سوتا ہے مجھکو دیکھ بڑی دیر سے جاگ رہی ہوں۔ اور خدا کی دی ہوئی ہوا میں اُڑتی پھرتی ہوں۔

(۵) شہادت پسند ہے۔ یعنی دانستہ مکڑی کے منہ میں چلی جاتی ہے۔ تاکہ اس کا بھوکا پیٹ بھرے اور یہ مرتبۂ شہادت کمائے۔ آپ کہیں گے کہ اس میں مکھی کا کیا کمال ہے۔ مکڑی تو بے خبری میں جھپٹا مارتی ہے۔ مکھی کی خوبی تو جب تھی کہ جان بوجھ کر موت کے منہ میں چلی جاتی۔

یہ اعتراض درست نہیں۔ آج کل کے سائنس داں ڈاکٹروں نے خورد بین آلات سے مشاہدہ کیا ہے کہ مکھی کے جسم میں ہزاروں آنکھیں ہیں۔ تو بس جس کے دو نہیں ہزار آنکھیں ہوں وہ مکڑی کے داؤں سے بے خبر کیونکر رہ سکتی ہے۔

نہیں جناب یہ صرف مکھی کا ذوق قربانی ہے کہ اپنی ہستی کو مٹا کر دوسرے کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ کاش ہم لوگ بھی مکھی ہی سے جاں نثاری کا سبق سیکھیں اور عشق حقیقی کے جالے میں گرفتار ہو کر فنائیت حاصل کریں۔

اُلّو

(از رسالۂ صوفی ۱۹۱۰ء)

اُلّو ایک ایسے جانور کا نام ہے جس کی نحوست کو سب مانتے ہیں۔ ضرب المثل کے جملے بیچارے اس پرندے کے وجود پر بن گئے ہیں۔ جب کسی گھر یا شہر کی ویرانی بیان کرنی منظور ہو تو کہتے ہیں کہ وہاں تو اُلّو بول رہا ہے۔ یعنی وہ مقام بالکل اُجاڑ ہے۔ آبادی کی چہل پہل بالکل نام کو نہیں۔ اور فقط نحوست اور ویرانہ پن میں ہی اُلّو بدنام نہیں ہے حماقت و بے عقلی کے موقعہ پر بھی اُلّو ہی کا نام لیا جاتا ہے۔ اُلّو کی آواز سے بہت بدشگونیاں منسوب ہیں۔

پس ایسے منحوس جانور کے ذکر اذکار میں کون جی لگائے گا۔ کس کو رغبت ہوگی کہ بلبل ہزار داستاں اور طوطی شکر مقال کے چرچوں کو چھوڑ کر اس بدنام پرندے کے بیان میں مصروف ہو۔ مگر دنیا کے پردہ پر سب آدمی ایک مزاج و طبیعت کے نہیں بستے۔ ہزار اُلّو کو برا کہنے والے ہیں۔ تو دو چار اس کی مدح سرائی کرنے والے بھی نکل آئیں گے۔ خاصکر وہ گروہ جو موجودات کے ہر نیک و بد کو صفات یزدانی کا مظہر تصور کرتا ہے۔

جو لوگ بلند آسمان۔ چمکدار ستاروں۔ روشن آفتاب و ماہتاب۔ لہلہاتے باغوں میں شان غیبی کا ظہور مشاہدہ کرتے ہیں۔ جن کو چشم مستانہ میں جلوۂ راز نظر آتا ہے۔ جو گل کی صورت میں حسنِ ازل دیکھتے ہیں۔ جن کی زبان سے ان نظاروں کو دیکھکر ربنا ما خلقت ھذا باطلا نکلتا ہے۔ وہ پست زمین۔ اندھیری رات۔ سنسان بیاباں۔ نگاہ مغموم اور نوکدار کانٹوں میں بھی حقیقت کی نمود پاتے ہیں۔ اور کل یوم ھو فی شان پڑھتے ہیں

لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اس جماعت کے رسالے میں جس کا مذہب ہمہ اوست ہے اور

جو خیر و شر دونوں میں محمل لیلا کے جرس کی صدا سنتے ہیں۔ اُلّو کی سرگذشت نہ لکھنی چاہئے
صوفی کی روش یہ نہ ہونی چاہئے کہ ہر اچھی بُری چیز میں منزلِ مقصود کو تلاش کرے۔ یہ رسالہ
صوفیوں کا ہے۔ اس لئے ایسی بھی جہاں عام پسند عنوانوں پر مضامین لکھے جاتے ہیں۔ وہاں
ان عنوانوں کو بھی زیرِ بحث لایا جائے جن پر توجہ کرنا قاعدے اور دستور کے قانون میں قابل
نفرت ہے۔

اُلّو کے اوصاف

اُلّو کی زندگی، بود و باش، ایک باخدا، تارک الدنیا درویش کی سی ہے وہ آبادی
سے گھبراتا ہے۔ اس کو خلوت، تنہائی بھاتی ہے۔ عام پرندوں کی طرح رونق دار شہروں
اور غل و شور کے مقام پر آشیانہ نہیں بناتا۔ سرسبز درختوں کی شاخوں پر چہچہا کر نغمہ سنجی نہیں
کرتا جس سے فرحت پسند انسان جی بہلائے۔ اُلّو سارا دن حریص پرندوں کی طرح پیٹ
کی خاطر دربدر مارا مارا نہیں پھرتا۔ بلکہ وہ اُجاڑ اور غیر آباد کھنڈروں میں نشیمن بناتا ہے
جہاں کوئی غیر مانوس آواز اس کی مشغولی میں خلل انداز نہ ہو۔ دن بھر صائم رہتا ہے اور
شام کو سورج چھپنے کے بعد رزق کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اور جوں ہی نکلا خداوند تعالیٰ
شکار کے چند لقمے دلوا دیتا ہے۔ جن سے روزہ افطار کر کے کسی ٹوٹے ہوئے گنبد یا جھکی
ہوئی دیوار پر آ بیٹھتا ہے۔ اور ہو ہو کے نعرے لگانے لگتا ہے۔ اسی ذکر و شغل اور یاد
الٰہی میں صبح ہو جاتی ہے۔ اور یہ پکا اور سچا صوفی ریاکاری کے ڈر سے خاموش ہو کر
اپنے حجرے میں گھس جاتا ہے اور حبس دم کر کے مراقبہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ پھر شام تک باہر نہیں آتا
یہ خود پسند آدمی بادشاہی کا تاج پہن کر نوبت نقارے بجواتا ہے۔ نوبت خانوں
کیلئے اونچے اونچے مکان تیار کراتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ یہ نوبت ہمیشہ بجے گی۔ لیکن زمانہ
کا چکر چند ہی روز میں اس سرکش کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ پھر دنیا اُس کو اور اس کے
نوبت نقاروں کو بالکل بھول جاتے ہیں مگر اُلّو نہیں بھولتا۔ مٹنے والے تاجدار کے خاکی

ڈھیر پر جاتا ہے اور نقیب و چوبداروں کی آواز کو صدائے عبرت میں مرنے والے کے
وجود خاکی کو سناتا ہے۔ اور اس کے نوبت خانے پر بیٹھ کر ٹھیک رات کے بارہ بجے کل من علیہا
فان کی نوبت بجاتا ہے۔

ایک دفعہ گرمی کے موسم میں راقم الحروف درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب میں حاضر تھا
پچھلی رات جبکہ چاند غروب ہو رہا تھا جی چاہا کہ قطب مینار کا نظارہ کروں۔ اس وقت عجیب
پُر اثر وقت تھا۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ رات سائیں سائیں کر رہی تھی درگاہ
شریف سے نکل کر مقبرہ ادہم خاں کے قریب آیا تو دسویں رات کے چاند کی صورت سامنے
آگئی۔ بیچارہ ماندگی کے عالم میں افقِ تنزل پر جھک رہا تھا۔ اور اپنی افسردہ شعاعیں ویران
در و دیوار پر ڈال رہا تھا۔ ملگجی روشنی میں شاہی کھنڈرات کی صورت ایسی ہیبت ناک اور
ڈراونی معلوم ہوتی کہ کلیجہ کانپنے لگا۔ تاہم ہمت کر کے ذرا اور آگے بڑھا۔ جوگ مایا کا مندر دور
سے نظر آ رہا تھا۔ دوسری طرف جو پھر کر دیکھا تو غیاث الدین بلبن۔ محمد خاں شہید کے شکستہ
مقبرے اور بیسیوں اونچی نیچی ٹوٹی پھوٹی عمارتیں نظر آئیں۔ جن پر پھیکی پھیکی چاندنی اور رات
کی خاموشی نے خبر نہیں کس بلا کا اثر پھیلا رکھا تھا کہ بے اختیاری کی سی حالت پیدا ہو گئی۔
لیکن ارادہ قطب مینار دیکھنے کا تھا۔ ان نظاروں میں تھوڑی دیر مصروف رہ کر آگے
بڑھ گیا۔ اور علاؤ الدین خلجی کے مقبرے کے پاس پہونچ گیا۔ دیکھا کہ بے چارہ سلطان
خلجی اکیلا تنہا۔ خوفناک کھنڈر کی گود میں پڑا سوتا ہے۔ کوئی پہرہ دار نہیں۔ پاسبان نہیں
جو اس سکندر ثانی کی خوابگاہ کے قریب جانے سے مجھ اجنبی کو روکے۔ زندگی کی خبر نہیں مرنے
کے بعد جب ابن بطوطہ نے اس مقبرے کو دیکھا ہے تو عجب شان تھی۔ زریں مخملی غلاف
پڑے ہوئے تھے۔ اگر اور لوبان کی خوشبو سے مقبرہ مہک رہا تھا۔ عالی شان گنبد کے
قریب بہت بڑا مدرسہ تھا۔ جہاں سینکڑوں طلبا رہتے تھے۔

آج کی رات نہ گنبد باقی تھا۔ نہ غلاف۔ نہ خوشبو۔ نہ مدرسہ۔ نہ طلبا۔ یہاں تک کہ

قبر کا نشان بھی ناپید تھا۔ چونے اور پتھروں کے انبار میں خبر نہیں کس جگہ سکندر ثانی کی سلطان علاؤ الدین خلجی کی ہڈیاں پڑی تھی۔ اس منظر نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ بدن ساکن کر دیا آنکھوں کو دریائے عبرت میں غرق کر دیا۔ جو عبرت بنا کھڑا تھا کہ سامنے کی شکستہ دیوار پر ایک اُلّو کی صدا کان میں آئی جو سلطان کی گزشتہ شان و شوکت کا نوحہ رُک رُک کر پڑھ رہا تھا۔

ان سب پُر اثر نظاروں سے زیادہ میرے دل پر صدائے بُوم کی چوٹ لگی۔ نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت کیا حالت ہوئی۔ اور اب جب اُس کا خیال کرتا ہوں کیا کیفیت دل کی ہو جاتی ہے۔ تو کیا ایسے ناصح اور بیکسوں کے دمساز جانور کو آپ بُرا کہہ سکتے ہیں۔ اگر اُس کی محل شناسی پر غور کیا جائے تو بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ جن کو سب بھول گئے سب نے چھوڑ دیا۔ اُن کو اُلّو نے نہیں بھلایا۔ اور ساتھ نہیں چھوڑا۔ اُلّو کی آواز کو منحوس ناحق کہتے ہیں۔ ذرا دھیان سے سنو۔ اللّٰہ ھو صاف سمجھ میں آجائے گا۔ بعض دفعہ ھُو ھُو بھی کہتا ہے۔ اور بعض وقت پورا اللّٰہ ھو پکارتا ہے۔ بنگالی مینا۔ ہیرامن طوطا۔ اور یہ ننھی ننھی خوبصورت چڑیاں میٹھی میٹھی بولیوں سے آپ کا جی خوش کرتی ہیں۔ مگر اُلّو اپنے نعرۂ حق سے آپ کے دل کو لرزا دیتا ہے۔ اس لئے آپ اس کو منحوس کہتے ہیں۔ نہیں نہیں ایسا خیال نہ کرو۔ یہ خوش نوا پرندے دل کو یادِ حق سے ہٹا کر تکلیفاتِ دنیا میں مصروف کرتے ہیں۔ اور اُلّو کی جگر خراش فریاد انجامِ کار یادِ حق دلاتی ہے۔ اور کہتی ہے ؎

جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے　　یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

آج سے آپ کو چاہیئے کہ اُلّو کی نحوست کا خیال چھوڑ کے اس کی خوبیوں پر غور کیا کیجئے۔ اور اُلّو پر کیا منحصر ہے۔ عالمِ موجودات میں جو شے نظر سے گزرے اچھی ہو یا بُری۔ اُس کے اچھے معنی نکالنے چاہئیں۔
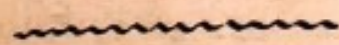
~~~~~~~~~~~~

رسُولؐ کی من بھاتی غذا

جَو

(از اخبار زمیندار ۱۹۱۲ء)

میرا چاہیتا زرد پوش جَو کیسا پیارا پیارا۔ پیدا ہوتے ہی عشقبازی کا بسنتی لباس پہن لیتا ہے۔ اور مرتے دم تک اس کو تن سے جدا نہیں ہونے دیتا۔ یہاں تک کہ موت کی چکی میں پس کر نابود ہو جاتا ہے۔ اس نکیلے دانے سے نفرت نہ کرنا۔ بھائی یہ تمہارے رسول (صلعم) کا منہ چڑھا دانہ ہے۔ یہی وہ ہستی ہے۔ جس کے آگے کھانے کو سرکار رسولؐ تک رسائی نہ ہو سکتی تھی اس کی تعریف کون کرے۔ خلقت تو دیوانی ہو گئی ہے جس کو دیکھو

گندم گنہگار

پر جان دیتا ہے۔ روٹی تو روٹی۔ محبوب بھی گندمی رنگ کا تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ وہی دانۂ گندم ہیں جن کو نوش کرکے آدمؑ جنت سے نکلے۔ اور عتابِ الٰہی کے سزاوار ہوئے یہ وہی چیز ہے جس کو مولانا رومؒ ہوس پرست عشاق کی بوالہوسی کا سبب قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ ؎

ایں خمار از خوردنِ گندم بود

نہیں جناب ہم کو تو اپنے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی من بھاتی غذا جو مرغوب ہے اس کا تن بھی اچھا اور من بھی مزیدار۔

پالیسی کی تلاش

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ایک نئی پالیسی بنانے کی ضرورت ہے۔ اگر واقعی ہے تو
~~~~~~~~~~~~

ہے تو یعنی میرے نزدیک پالیسی یہ ہونی چاہئے کہ

جَو کھاؤ اور جَو کی رنگت بن جاؤ

لیگ و کانگریس، اسکول و کالج ہوش و خرد سب کو آگ لگا دو۔ گردش سے یہ وقت آگیا کہ پیٹ بھرنے کو جَو کے چار دانے بھی نہیں ملتے۔ تو بس یہی پالیسی بہتر ہے کہ دیوانہ وار جَو کا چھلکا اُتارنے کی کوشش کرو۔

خیر بیٹھیں میں نے کیا کہا اور آپ کیا سمجھے۔ یہ کوئی معمّا نہیں ہے۔ جَو کو چاہتا ہوں۔ جَو پر مرتا ہوں۔ اسی کا نام بار بار زبان پر آتا ہے۔ مدینہ شریف سے واپس آکر دونوں وقت جَو کی روٹی کھاتا ہوں۔ اس میں صحت ہے۔ تندرستی ہے۔ طاقت ہے۔ لذت ہے۔ اور وہ یاد ہے جس کے بھولنے نے قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔ یاد رکھو۔ بحول امت رسولؐ جو کھاتے تھے صحابہؓ جو کھاتے تھے تلوار چلانے والے ہاتھ اور ملک چلانے والے دماغ کو وہ معدہ خوراک دیتا تھا جس میں جَو کی روٹی کے سوا توس کمین کا نام نہ تھا۔ ذرا کھا کر تو دیکھو کیسی مزے کی چیز ہے۔ ذرا سا خمیر ملا لیا کرو۔ روٹی نرم ہو جائے گی۔ اور ہضم میں دیر نہ ہوگی۔ سنا ہوگا۔ دلّی میں دربار تھا۔ انہی دنوں کا ذکر ہے۔ مرنے والے بہادر شاہ بادشاہ کے خاندان کی چند شہزادیاں اپنے ٹوٹے ہوئے بوریئے پر بیٹھی جَو کی روٹی کھا رہی تھیں۔ چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ سردی چمک رہی تھی۔ سب سے چھوٹی سات برس کی عمر والی لڑکی اپنی ماں سے مخاطب ہو کر بولی۔ کیوں بی اماں۔ یہ انگریزوں کے بادشاہ بھی جَو کھاتے ہوں گے۔ کیونکہ تم نے پرسوں کہا تھا کہ سب بادشاہ اور ان کے بچے جَو کھایا کرتے ہیں۔ ماں اس معصومانہ سوال کو ٹالنا چاہتی تھی۔ مگر بچی نہ مانی۔ اور بولی۔ اچھی بی بتاؤ۔ جواب ملا۔ نہیں۔ جو دربار کرتے ہیں وہ جَو نہیں کھاتے بیٹی پرسوں تم سے یہ کہا تھا کہ بادشاہ اور انکے بچے جَو کھایا کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جن

بادشاہوں کا نام فقط بادشاہ رہ جاتا ہے۔ اور کام چھین جاتا ہے۔ اُن کو جَو کے سوا اور کچھ کھانے کو نہیں ملتا۔ بیٹی یہ ٹکڑا میسر آجاتا ہے۔ اس کو بھی غنیمت سمجھو۔ تقدیر تو اس قابل بھی نہیں۔ آج لاکھوں روپیہ آتشبازی اور خبر نہیں کن کن بازیوں میں سرکارِ انگریزی کا خرچ ہو جائے گا۔ مگر اس سے کہے کون کہ ہم تیمور کے گھر والے جَو کی روٹی سے بھی محتاج ہیں۔ ایک بازی ہمارے نام کی بھی۔ دلّی میں تخت بچھا ہے۔ ایک نظر ان پر بھی ڈالو جو کل کے دن اس تخت کے مالک تھے۔ اور آج فرشِ خاک پر ذلیل پڑے ہوئے ہیں۔ مگر یہ کس کا کہنا۔ کس کا سننا۔ میں تم سے کہتی ہوں کہ شاہوں کے شاہ سلطانِ کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی جَو کی روٹی کھاتے تھے۔ ہم اور کسی بادشاہ کو کیوں دیکھیں۔ اپنے آقا و مولیٰ کی مثال کیوں نہ دیں۔ کہتے ہیں دانہ دانہ پر مہر ہوتی ہے۔ رسولنا میں جَو کے دانہ پر قبولیت کی مہر لگنی چاہئے۔ دیکھوں کتنے عاشقانِ رسول گندم ترک اور جَو اختیار کرتے ہیں۔ یقین مانو کہ مسلمانوں کو غذا کا فیشن ذرا بدلنا چاہئے۔ سفید چپاتی پر مرنا چھوڑ دو۔ تم کالے ہو۔ گوری چیز سے رشتہ جوڑو گے تو قانون گھور کر دیکھے گا۔ اگر دس بیس خدا کے بندے جَو کھانے کا عہد باندھ لیں تو میں سمجھوں گا۔ روحانی حکومت کی زندگی میں جان پڑ گئی۔ کیونکہ بزرگوں سے مروی ہے کہ روح کا رنگ زرد ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ روحانی حکومت کو دنیاوی حکمرانوں سے کچھ سروکار نہیں۔ ذوق و شوق کی اقلیم پر قبضہ کرنا اور اس میں اپنا سکہ و خطبہ رائج کرنا مقصود ہے تو اس خواہش کو زرد خطرہ نہ بنا لیا جائے جیسے کہ چین و جاپان کی زرد قوموں نے ایک ولایتی مضمون نگار زرد خطرے کا عنوان قائم کرکے ڈرایا کرتے ہیں۔ میرا جو اندیشہ کی چیز نہیں صاف ہے۔ چلتا ہے۔ ایسے ہی ہم اس کے چاہنے والے بھی پالٹکس سے علیحدہ اور کسی دوسری دُھن کے شیدائی ہیں۔

پھولوں کے شکوے

قسمت و تقدیر کی شکایتیں

(از توحید ۱۶ر اپریل ۱۹۱۳ء)

میرٹھ کی نوچندی میں راقم فقیر نے پھولوں کی نمائش دیکھی۔ یہی سارے مجمع کی جان تھی۔ ادہر پھول۔ اُدہر پھول۔ نیچے پھول۔ اوپر پھول چاروں طرف گل خانے ہی گل خانے نظر آتے تھے۔ آراستہ خیمے میں سفید فرش پر میزیں بچھی ہوئی تھیں جن پر جداگانہ سلیقہ و ترتیب سے چینی اور شیشے کے گملوں میں رنگ برنگ کے پھول لگائے گئے تھے۔ نمائش اس کی تھی کہ کس نے نیچرل اور موزوں طریقے سے پھولوں کو چُنا ہے۔ چلنے والیاں بھی جن کو انگریز مس بابا اور میم کہتے ہیں۔ جگہ جگہ موجود تھیں اور فرش کے متحرک پھول ثابت ہو رہی تھیں۔ فقیر اس عالمِ گل و گُل کی سیر کرتا پھر رہا تھا کہ یکایک ایک جھاؤ کی ٹوکری پر نگاہ پڑی۔ جس میں چند نہایت خوش رنگ و خوبصورت پھول رکھے ہوئے تھے اور یہ ٹوکری زمین پر دہری تھی۔ ان کو دیکھکر آگے بڑہا ہی تھا کہ تصور کے کان میں ایک شیریں آواز نے کچھ کہا۔ یہ صدائے گل تھی۔ جو اپنی قسمت و تقدیر کا شکوہ کرتی تھی۔ جب میری اور میز کے سامنے والے گلدستہ کی ایک ذات ہے ایک رنگت ہے۔ ایک بُو ہے تو پھر اس کی کیا وجہ کہ اسکو شیشے کے گملے میں شاندار میز پر لگایا گیا۔ اور مجھ کو جھاؤ کی ٹوکری میں زمین پر ڈالدیا۔

پھول کے اس شکوے سے دل پر چوٹ لگی۔ اور ڈاکٹر اقبال کا شکوہ یاد آگیا جو انہوں نے خدا سے کیا تھا کہ اتنے میں دوسرے کان میں صدائے مخفی نے اس کا

جواب دیا۔ اور کہا کہدے۔ اے سننے والے۔ ٹوکری کے پھول گوشہ اور خلوت کے امن میں ہیں۔ دیدار بازوں کی یورش میز پر ہے۔ مگر یہ سب ہوس پرست ہیں۔ پھول کی ظاہری خوشنمائی کو دیکھتے ہیں۔ لیکن ٹوکری کے پھول کو دیکھنے کے لئے نظر عرفان بھیجی جاتی ہے۔ یہ ایسی بڑی عزت ہے جو میز کے پھول کو نصیب نہیں۔ بس اے ٹوکری کے غریب گلدستے! تجھکو بشارت ہو کہ تیری شان کو دوام ہے۔ اور میز کے پھول کو زوال۔

دوسری طرف پھلوں کی میزیں تھیں۔ ہر قسم کے میوے اور پھل چنے ہوئے تھے ان میں بعض پھلوں کو تراشکر دکھایا گیا تھا۔ ایک ترشے ہوئے پھل نے کہا۔ مجھکو زخمی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جواب آیا تیرا باطن اہل ظاہر کو نظر آجائے۔ اور وہ بھی اپنے اندرُن کو چیر کر دیکھیں کہ اس میں اور ظاہر میں کچھ فرق تو نہیں ہے۔

ہولناک لیکچر

(از توحید ۱۰ر مئی ۱۹۱۳ء)

کل رات کو ۸ بجے ۲۹ر جمادی الاول کا چاند شب اول کے ہلال کی مثل تاروں میں جھلملا رہا تھا۔ یہ آخری تاریخ تھی۔ اب دو روز تک یہ چاند مخفی رہے گا۔ اور ۲۹ر یا ۳۰ر تاریخ کو نمودار ہوگا۔ مگر جمادی الاول کے نام سے نہیں جمادی الاخری نام لیکر۔

راقم فقیر۔ آسمانوں والے۔ زمینوں والے پہاڑوں اور سمندروں والے۔ نور و ظلمت کے رکھوالے خدا سے کچھ مانگ رہا تھا کہ احساس و ادراک کے کان میں ایک نطق ایک خطبہ۔ ایک لیکچر۔ ایک تقریر کی آواز آئی۔ ہوش نے اپنے گوش ادہر لگائے اور سُنا۔

افسردہ اور اُداس چاند ستاروں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ستارے دل لگائے

سن رہے تھے۔ بیان ہولناک تھا۔ لہجہ اندیشہ خیز تھا۔ دل نے کہا زمین کے قانون بنانے والے سنتے نہ ہوں۔ صورت سرد نے جواب دیا۔ نہیں وہ سب سوتے ہیں۔ خفیہ پولیس کار خاص کے اہل کار نسیم سحر کی آغوش میں پڑے ہوئے مدہوش ہیں۔ پہرہ پر کوئی نہیں۔ چاند نے کہا۔

ستارو! سنتے ہو اب ہم تم چند ساعت کے مہمان ہیں۔ آفتاب افق مشرق سے طلوع ہونے والا ہے۔ نور کو انوار زیر و زبر کرنے آتے ہیں۔ آج کی رات ہم نے تاریکی کا مقابلہ کیا۔ اس سے لڑے۔ اس کو شکست دی۔ مگر اہل جہاں سوتے رہے ہماری معرکہ آرائی کی سیر نہ دیکھی۔ اب سورج کی جنگ دیکھنے کیلئے سب کی آنکھیں کھل جائنگی

میرے درخشندہ بھائیو! آسمان کی خاموشی دور ہونے والی ہے۔ زمین کا سکوت ختم ہونے کے قریب آگیا۔ اس لئے میں اپنے مہینہ بھر کی روشن گویائی کو تمام کرتا ہوں۔ اور حجرۂ خلوت میں جاتا ہوں۔ کل کی رات اور پرسوں کی رات اور شاید اس کے بعد ایک اور رات مجھکو میدان فلک میں نہ پاؤگے۔ تمہارا کمانڈر غروب ہوتا ہے۔ تمہارا سردار تلوار میان میں کرتا ہے۔ تنہائی میں ہمت نہ ہارنا۔ ظلمت شب کا مردانہ وار مقابلہ کرنا وہ دیو ہیکل ہے۔ تم نازک اندام ہو۔ ڈر نہ جانا۔ سیاہ باطن کور دیدہ کا فتح کرلینا دشوار نہیں۔ جب تاریکی کے لشکر، سمندروں۔ پہاڑوں اور زمینوں کے غاروں سے نکلکر آسمان کے کناروں پر حملہ آور ہوں تو مریخ اپنا سوار دستہ لیکر میمنہ کو سنبھالے۔ مشتری میسرہ کو روکے۔ زحل قلب میں جم جائے۔ زہرہ عطارد وکسرٹ کی نگرانی کریں۔ باقی افسر کمینگاہوں میں رہیں۔

شہاب ثاقب کی سرچ لائٹ سے دیکھ بھال رکھنا۔ بے خبری بُری بلا ہے۔ اور اس کے بعد فائر ہو۔

نورانی گولے اندھیرے پر برسائے جائیں۔ شعاع کی سنگینیں چلیں کرنوں کی

گولیاں سن سن کرتی نکلیں۔

جب دشمن کا پاؤں ڈگمگائے، شکست کے آثار نمودار ہوں۔ سب سپاہی چمکیں دمکیں۔ اور ایک آخری حملہ کرکے اس کا کام تمام کردیں۔

جب آسمان کا فلک صاف ہوجائے گا۔ تاریکی کا کوئی حصہ باقی نہ رہے گا۔ تو فرشتے فتح کا جشن رچائیں گے۔ پروردگار کی نصرت غیب کا ترانہ گائیں گے تم بھی اپنی زبان کھولنا۔ حمد سبحان ذی شان میں فرشتوں کی شرکت کرنا۔

ستاروں نے کہا۔

اے عثمانی ہلال کی صورت کے قمر! ہم کیا ہماری بساط کیا۔ غریب غروب ہونے والے تارے ہیں۔ تو بھی چھپ جانے والا کرۂ نور ہے۔ دن کا صف شکن آفتاب ہم سب میں بڑا۔ ہم سب سے زیادہ شہ زور ہے۔ مگر شام کو ناپید ہو جاتا ہے ہما پر کیا گھمنڈ اور غرور کریں۔ تاریکی بھی خدا کی پیدا کردہ ہستی ہے۔ اس سے کیوں لڑیں خوں ریزی و سفاکی اپنا کام نہیں۔ خاموشی میں پیدا ہوئے۔ خاموشی میں مرجائیں گے پھر اس غل و شور فتنہ و فساد سے کیا سروکار۔ کچھ اور سنا۔ اور کوئی بات کہہ۔ زہرہ کا ایک گیت سن۔ نغمۂ ربانی میں جی لگا۔ گود میں پاؤں لگائے بیٹھا ہے۔ ایسی نصیحت کر جو یادگار زمانہ رہے۔

چاند مسکرایا۔ اپنی جگہ سے سرکا۔ اور جھک کر ستاروں کے کان میں کہا اس پر وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ تلواریں میانوں سے کھینچ لیں۔ اور ایک ایک کرکے نابودی کی رزمگاہ میں گھس گئے۔ اور ان کے پیچھے چاند بھی کن انکھیوں سے دنیا کے سونے والوں کو دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ چلا۔ اور آخر کہیں غائب ہوگیا۔

خاکی جام

فنا کے بعد بقا
عشق کی خیالی داستان

(از توحید یکم جولائی ۱۹۱۳ء)

جب فراق کی بے چینی آدم زاد سے برداشت نہ ہو سکی۔ جب ہجر کی بیقراری انسان کے وجود خاکی کی تاب و توانائی سے بڑھ گئی تو مایوس ہستی نے زہر کا ایک پیالہ ہاتھ میں لیا۔ آسمان کو دیکھا۔ اور کہا۔ پیدا کرنے والے خدا۔ یہ مشت خاک اتنی بڑی امانت کے قابل نہیں ہے۔ اپنی امانت واپس لے۔ میرے بازوؤں کو اس بوجھ سے ہلکا کر۔ اور اگر تو ایسا نہیں کرے گا۔ یا نہیں کرنا چاہتا تو میں خود اس بار سے سبکدوش ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر زہر کا پیالہ پی لیا۔ اور تھوڑی دیر میں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اس کے بعد رسموں کے پابند لوگ آئے۔ بیجان لاش کو نہلایا۔ اور سفید کفن کا جوڑا پہنا کر جنگل بیابان میں ایک گہری قبر کے اندر لیجا کر دفنا دیا۔ کسی نے یہ خیال نہ کیا کہ ہمارے اس ہمجنس پر کیا گذر گئی۔ اور ہم کیوں اس معدوم ہستی نما پیکر کو خاک میں ملاتے ہیں۔

(۲)

بڑے زور کی آندھی آئی بادل کڑکے۔ بجلی چمکی۔ طوفانی بارش ہوئی جنگل میں پانی زور شور سے بہنے لگا۔ پہاڑی ندی میں سیلابی کیفیت پیدا ہوئی جس کی زد میں

پرانا قبرستان بھی آگیا۔ شہید محبت کی قبر ذرا اونچے مقام پر تھی۔ سیلاب بچ گئی تاہم سامنے کے غار میں کچھ دن کے بعد مینہ پڑنے سے یہ بھی گر پڑی اور گڑھے کے اندر مٹی کا انبار بنی رہی۔ اس کو بھی ایک سال گزر گیا۔ اتنے میں ایک اور طوفان آیا سردی کا موسم تھا۔ اس زور سے اولے برسے کہ تمام صحرا سفید ہو گیا۔ قاعدہ ہے کہ اولے جب برستے ہیں تو پانی ان کو سمیٹ سمیٹ کر نشیبی مقامات میں جمع کر دیتا ہے۔ چنانچہ جس گڑھے میں ہمارے مردہ عشق کی خاک پڑی ہوئی تھی۔ وہاں بھی اولوں کا انبار لگ گیا۔ یہ قصہ رات کا ہے۔ صبح کو جب کہ اولے گھل کر اور پگھل کر مٹی میں جذب ہو چکے تھے۔ ایک کمہار اپنے گدھوں کو لئے ہوئے اولوں کی مٹی کی تلاش میں آیا۔ یعنی جن گڑھوں میں اولے جمع ہوئے تھے وہاں وہاں کی مٹی کھود کھود کر بوروں میں بھر لی۔ ہمارے مرحوم عاشق کی مٹی بھی ایک بورے کے حصہ میں آئی۔ اور کشاں کشاں کمہار کے گھر میں پہونچی۔ مشہور ہے کہ جس مٹی میں اولے ملے ہوئے ہوں اس کے برتن میں پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اور گرمی کے موسم میں دُنیا والے اس کی بہت قدر کرتے ہیں۔ چنانچہ کمہار نے اس مٹی کے بہت سے برتن۔ مٹکے۔ مٹکیاں۔ گلاس۔ صراحیاں وغیرہ بنائیں۔

(۳)

برسات کا موسم تھا۔ سخت گھس اور گرمی کے بعد ابر گھر کر آیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا اور درختوں میں لہر آ رہی تھی۔ سبز ٹہنیاں آبادیوں میں ہوا پاشی کر رہی تھیں یکایک دیکھا کہ ایک کمرہ آراستہ ہے جس میں ایک پری جمال حور لقا مستی نشہ شباب میں مخمور انگڑائیاں لیتی ہوئی اٹھی اور نوکر کو حکم دیا۔ کہ کمہار کے یہاں سے ایک صراحی اور جام لیکر آئے۔ مگر یہ صراحی اور جام اولوں کی مٹی کے ہوں۔ تعمیل کی گئی۔ گنگا رہا تھا کہ شراب کی بوتل کھولی۔ صراحی میں پانی بھرا۔ اور اس میں وہ شراب ڈالدی گئی۔ اس کے

بعد پانی ملی ہوئی شراب گلاس میں نکالی گئی۔ اور ایک انداز مستانہ سے وہ گلاس ہونٹوں تک پہونچا جس وقت لب جاں بخش جام خاکی سے ہم آغوش ہوئے ایک صدائے غیب نے یہ شعر پڑھا ؎

لب جاں بخش کے بوسے ملیں گے خاک میں مل کے　　پس مردن بنائے جائیں گے ساغر مری گل کے

او مغرور بے خبر، جفا کار مستانے۔ شرابی۔ میں اس آدمی کی خاک ہوں جو تیری یاد میں پھڑک پھڑک کر مر گیا۔ میرا جسم۔ میری ہڈیاں۔ میری آنکھیں جو تجھ کو دیکھنا چاہتی تھیں، میرا وہ دل جس میں تیرے ملنے کی آرزو تھی۔ میرا وہ دماغ جو تیرے وصال کے تخیلات میں سرشار رہتا تھا سب خاک ہوگئے۔ لیکن پوری بربادی کامل تباہی اور آخری فنا کے بعد آج یہ مقام بقا حاصل ہوا۔ اور میرے ہونٹوں کی خاک گلاس کے کنارے میں پیوست ہوکر تیرے لب سراپا حیات تک پہونچی۔ اور وصال کی گھڑی نصیب ہوئی۔ اگر یہ وصل جسم کی زندگی میں میسر آتا۔ تو ہرگز ہرگز وہ دوامی لطف حاصل نہ ہوتا جو آج کے دن محسوس ہو رہا ہے۔ اور جو یقیناً ہمیشہ قائم و برقرار رہیگا۔

(۴)

عشق کی اس داستان کو سنکر راقم درویش نے کہا او مسلمان! تو ہراساں اور پریشان نہ ہو۔ وہ دو جہان کی مصیبتیں تیری ابدی بقا اور پائدار زندگی کی نشانیاں ہیں۔ غور کر اور خوش باش ہو۔

دُوربین اور مکاشفات غیب

(از توحید یکم جولائی ۱۹۱۵ء)

تمہاری آنکھ دور کی چیز نہیں دیکھ سکتی۔ تو ایک دُوربین منگالو۔ بُعد کی منزلیں قریب آجائیں گی۔

دوربین کیا چیز ہے؟ سب جانتے ہیں آدمی نے ہنر اور علم کے زور سے ایک شیشہ ایجاد کیا ہے۔ جہاں اس شیشہ کو آنکھ کے سامنے لگایا۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہرگز پرے کے در و دیوار چہرہ کے پاس آگئے۔

بعض دوربینیں لاکھوں کوس کی چیز دکھا دیتی ہیں۔ آج کل یورپ والوں نے ایسی دوربین ایجاد کی ہے جس سے چاند سورج اور آسمان کے سب تاروں کی حقیقت نظر آجاتی ہے۔ لوگوں نے اس دوربین کے ذریعہ حساب لگا کے بتا دیا ہے کہ سورج کتنا بڑا اور ہم سے کس قدر دور ہے۔ چاند اور مریخ زمین سے کتنے فاصلے پر ہیں اور ان کی اندرونی حالت کیسی ہے۔ انہی دوربینوں سے قدرت کے نامعلوم بھید بھی کھل گئے۔ مثلاً پہلے زمانہ میں فقط ایک چاند سورج کا علم اور ناداں خلقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد پر ہنستی تھی کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی متعدد عالم ہیں۔ جہاں یہاں کی طرح چاند سورج اور مخلوق آباد ہے۔

مگر اب دوربین نے یہ دعوی بچا کر دکھایا۔ اور یورپ والے مان گئے کہ اس سورج کے علاوہ جو ہم کو نظر آتا ہے اور جس کے طلوع و غروب سے دنیا کے رات دن کا حساب مقرر ہے۔ اور بھی بہت سے سورج ہیں۔ اور ان کے ساتھ بھی اسی طرح ایک عظیم الشان نظام اور کائنات گردش کر رہی ہے۔ جس طرح ہمارے سورج کے ساتھ ہے۔ گویا دوربین نے غیب کی باتوں کو عیاں کر کے دکھا دیا۔ اور مسلمانوں کے ایمان بالغیب کی تصدیق ہو گئی۔

ان بڑی دوربینوں کے علاوہ میدان جنگ میں ایک اور دوربین استعمال کی جاتی ہے یعنی جنگی جہازوں اور خشکی کے لشکروں کے پاس ایک دوربین ہوتی ہے۔ جس سے سیکڑوں کوس کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں کہ دشمن اس وقت کس حال میں ہے۔ اور اس کے پاس کیا کیا ساز و سامان ہیں۔

بہر حال دوربین ایک عجیب طلسم کشا روح ہے۔ جب آنکھ کے سامنے آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گویا دور کی چیز بالکل سامنے کھڑی ہے۔ لیکن درحقیقت وہ وہاں نہیں ہوتی دیکھنے والے کو صرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز قریب آگئی تو کیا دوربین

دھوکہ کی ٹٹی ہے:

نہیں یہ بات نہیں ہے۔ دوربین صداقت کا آئینہ ہے۔ وہ جو کچھ دکھاتی ہے بے کم و کاست سچ اور واقعی ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے آدمی جن کی آنکھ پر دوربین نہیں ہوتی اس میں شک کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ اتنی دور کی چیز آنکھ کے پاس آگئی۔

چنانچہ صوفیائے کرام کے مکاشفات غیب پر ایسے ہی لوگ جو ظاہری دوربین کے کمال سے بے خبر ہیں۔ لعن طعن کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کو یہ بات بالکل عقل کے خلاف اور عجیب معلوم ہوتی ہے۔ ایسی ہی معراج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت وہ لوگ جن کی آنکھیں بصیرت کی دوربین سے محروم ہیں۔ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آن کی آن میں ساتوں آسمانوں کو طے کرکے عرش اعظم پر پہونچ گئے۔ پروردگار عالم سے ملاقی ہوئے۔ دوزخ جنت کی سیر دیکھی اور واپس آئے تو بستر گرم تھا۔ دروازہ کی کنڈی ہل رہی تھی۔ یعنی اتنے عظیم الشان سفر میں چند سکنڈ سے زیادہ عرصہ نہ لگا۔

مگر اس کو نہیں دیکھتے کہ دوربین کے اندر سے نگاہ آن کی آن میں لاکھوں کوس کیونکر پہونچ جاتی ہے۔ اور بڑے بڑے مقامات کی سیر کرکے چند سکنڈ میں واپس بھی آجاتی ہے۔ تو آیا یہ مشاہدہ عقل کی موافق ہوتا ہے یا خلاف؟!

اصل یہ ہے کہ نئے زمانہ کی تمام ایجادیں اور سائنس کے آلات بظاہر تو لوگوں کو

خدا سے بے خبر کر رہے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کے باطنی حقائق پر غور کرے تو یہی چیزیں مذہبی عقائد کی مستحکم دلیلیں اور خدا پرستی کے

سگنل

بن جائیں اور پھر حیات انسان کی سب ریل گاڑیاں دنیا کے سٹیشن سے بے خطر پاس ہوکر منزل آخر تک پہنچنے لگیں۔

گلاب تمہارا کیکر ہمارا

(از توحید ۲۴ر جولائی سنہ ۱۹۱۳ء)

ان سب شاعروں کو سامنے سے ہٹاؤ جو گلاب کے پھول پر مرتے ہیں۔ سینکڑوں برس سے ایک ہی چہرے کے طلبگار ہیں۔ یہ سب لکیر کے فقیر ہیں۔ مقلد ہیں۔ سنی سنائی تقلیدی باتوں پر جان دیتے ہیں۔

میں کچھ اور دیکھتا ہوں۔ مجھ کو ایک اور آنکھ ملی ہے جو ان سب سے اونچی ہے میرے دل کی ہمنشینی و ہمسری کے ان میں سے ایک بھی قابل نہیں۔ میں بندہ ہوں سب بندوں کی شکل ہوں۔ میں بشر ہوں۔ تمام بنی آدم کے برابر درجہ رکھتا ہوں۔ میں نبی نہیں ہوں۔ ولی نہیں ہوں۔ مہدی اور مسیح نہیں ہوں۔ دعویٰ خودنمائی و خودستائی سے بھی انکار ہے۔ مگر میں عالم تعین و ہستی مثالی کی ایک تصویر ہوں جس میں رنگ فطرت کی جھلکاریاں ہیں۔ اس واسطے میں خود اپنے وجود کا طلبگار ہوں۔ اور اسی لئے یہ تعلی یہ خود آرائی ہے۔ تاکہ میں خود کو اپنی خودی دکھاؤں اور خطاب کروں کہ جتنے یہ تُک جوڑنے والے شاعر ہیں۔ سب نے گلاب کے پھول کو تختہ مشق بنایا ہے

کوئی اس کی بھینی بھینی بو پر فدا ہے۔ کوئی اس کی نازک نازک پتیوں پر نثار ہے۔ کسی کو اس کے رنگ سے رخسار محبوب کی یاد پیدا ہوتی ہے۔ کسی کا دل اس کے کھلنے اور مرجھانے کے انقلاب میں اسیر ہے۔ بعض ہیں کہ جو گلاب کے خار سے خار کھائے بیٹھے ہیں۔ غرض یہ جتنی باتیں ہیں ان میں تو شکایت کا کوئی موقع نہیں ہے۔ کہنا یہ ہے کہ انہوں نے خدا کی بے شمار

مخلوقات کی حق تلفی

کی۔ ایک ہی دروازے پر ڈیرے ڈال دئے۔ ایک ہی آئینہ کی دید میں مدہوش ہو کر رہ گئے۔ اور ان بے شمار جلووں کو نہ دیکھا جو ان کے لئے صفحہ ہستی پر نمودار کئے گئے تھے۔ یہ انہوں نے بہت بڑا گناہ کیا۔ اس میں اُن سے ایسی خطا سرزد ہوئی ہے۔ جس کی سزا نہایت ہولناک ہونی چاہیئے۔ گلاب کی الفت میں باغ لگائے۔ چمن بنائے مالی محافظ بسائے۔ پانی کھچوائے۔ اور زمین کے تختوں کو سیراب کیا۔ پھولوں کی ٹہنیوں کے سامنے اپنے تخیل کے ذوق کو سجدے کرائے۔

پر نصیب نہ ہوا کہ جنگل میں نکل جاتے۔ خودرو پھولوں کو دیکھتے جن کا مالی خدا ہے۔ جن کا چمن صحرا ہے۔ جن کی سیرابی قدرتی سیلابی ہے۔ ان میں ایک

کیکر تھا

کیا چپ چاپ تھا۔ کیا مضبوط و توانا تھا۔ اس کی شاخیں دیکھی ہوتیں اس کی پتیوں پر غور کیا ہوتا۔ گلاب کی ٹہنی میں کیا رکھا ہے۔ ایک کمزور لچکنے اور ٹوٹ جانے والی شاخ ہے۔ جس کو آج کل کے

شہ زور زمانہ

میں بقول ڈارون رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ وقت اُن کی زندگی کا ہے۔ جو حوادث ایام کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جن کے اعضاء دوسروں کے کام آتے ہیں۔ کیکر کی چھال مفید جس سے کپڑے رنگے جاتے ہیں۔ اور مختلف رنگ تیار ہوتے ہیں۔ کیکر کی لکڑی سینکڑوں کام میں انسان کی مدد کرتی ہے۔ کیکر کی پتیاں بکریاں کھاتی ہیں اور آدمی کو دودھ دیتی ہیں۔ کیکر پھلیاں بھی چارہ اور رنگ بنانے میں کام آتی ہیں۔

یہ میاں گلاب کس مرض کی دوا ہیں۔ پیٹ میں درد ہو۔ گلقند کھلاؤ۔ ہیضہ ہو جائے تو گلاب پلاؤ۔ مر جاؤ تو قبر پر چڑھاؤ۔ اور بھی کوئی کام اس منحوس وجود سے نکلتا ہے۔

گلاب کے کانٹوں کو دیکھو۔ کیسے دھوکہ باز ہیں۔ دکھائی نہیں دیتے۔ ہاتھ لگاتے ہی چبھ جاتے ہیں۔ کیکر کے کانٹے دُور سے نظر آتے ہیں۔ کیا مجال کہ بے خبری میں کسی کو ستائیں۔

گلاب کے کانٹے سوکھ جائیں تو پھینک دینے کے قابل۔ کیکر کے کانٹے سوکھ کر گھروں اور کھیتوں کی حفاظت کریں۔ اس پر طرہ یہ کہ کیکر کا کانٹا کیسا سپید یا سادہ اور نکیلا ہوتا ہے۔ رنگ دیکھو تو وہ بھی اُجلا۔ مزا لا شاعروں کے گلاب کو یہ بات کہاں نصیب۔

گلاب کے درخت میں پتے بالکل بدشکل اور بیکار۔ کیکر پتیوں کے کیا کہنے۔ کیسی چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی پتیاں ہیں کہ بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔

کیکر کا پھول گلاب کے پھول سے لاکھ درجہ اچھا۔ گلاب کا پھول ایک دن کی تیز دھوپ میں کملا اور مرجھا جاتا ہے۔ اور کیکر کا پھول ہفتوں سورج کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور آج کل تعریف اسی کی ہے۔ جو دشمن کے مقابلہ میں زندہ سلامت رہے۔

گلاب کا پھول سرخ یا سرخی مایل اور ایسا کچا کہ مالیوں کی اُستادی سے رنگ بدل دیتا ہے۔ مالی جس کو چاہیں سرخ رکھیں۔ جس کو چاہیں سفید بنا دیں۔ کیکر کا پھول اپنے رنگ میں پختہ۔ سارے جہان میں ایک ہی زرد رنگ۔ کیا مجال

جو کوئی شخص اس کے رنگ کو بگاڑ سکے۔

شاعر کہتے ہیں گلاب کے پھول سے معشوق یاد آتا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کیکر کے پھول سے عشق یاد آتا ہے۔ جس سے انسان کی رنگت زرد ہو جاتی ہے۔

اب بتاؤ عشق اچھا یا معشوق۔ عشق نہ ہوتا تو نہ عاشق کو کوئی پوچھتا نہ معشوق کی کچھ وقعت رہتی۔ یہ عشق ہی کی بدولت سب بستیاں آباد ہیں۔

ارے نادان تجھے شاعروں سے کیا کام۔ پہلے اپنے وجود کے تخیلات کو درست کر ان میں فطرت شناسی کا ملکہ نمودار ہونے دے۔ آج گلاب کو چھوڑ کر کیکر کے آگے جھکتا ہے۔ کل اس کو بھی چھوڑ دو۔ کسی اور پیکر کے جلوے میں دھیان جمائیو۔ ساری دنیا میں کانٹے پھیلے ہوئے ہیں۔ کس کس جگہ جھاڑو دے گا۔ خود جوتی پہن لے۔ اور راستہ چلنے لگ۔ ہاں تو حق رہے۔ ہاں یہی صراط مستقیم ہے۔ یہی وہ راہ ہے جو منزل جاناں تک جاتی ہے۔ من و تو کا حجاب اُٹھا۔ اس کے بعد خود اپنی خودی کا پردہ کھول کر اندر گھس جا۔ پھر یہ آواز نہ آئے گی کہ

گلاب تمہارا اور کیکر ہمارا

اوس

(از توحید مہ اگست ۱۹۱۳ء)

میں شبنم نہیں کہتا۔ یہ فارس والوں کا لفظ ہے۔ فارس پر ادبار کی اوس پڑ چکی۔ وہ وقت اب کہاں ہے جب ایران کے چمن آباد تھے۔ سعدی و حافظ کی حقیقت شناس نظریں پھولوں کی ڈالیوں اور گھاس کی پتیوں پر شبنم کی بہاریں دیکھتی تھیں۔ اب تو روسی ظالموں کے جور و ستم سے بیوہ اور یتیموں کی آنکھیں قطرات شبنم کی شکل آنسوؤں

کی اوس پلکوں پر جاتی ہیں۔

برسات کے موسم میں کوئی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کا خواستگار ہے۔ کسی کو اودی اودی کالی کالی گھٹائیں پسند ہیں۔ کسی کا دل بادلوں کی کڑک اور بجلی کی چمک سے مست ہو جاتا ہے۔ مجھ کو تو برسات کی یہ ادا بھاتی ہے کہ مینہ برس کر کھل جاتا ہے اور صاف آسمان کی رات گزر جاتی ہے تو صبح کے وقت درختوں۔ پھولوں اور جنگل کی گھاس کی عجیب شان ہوتی ہے۔ اوس کے قطرے پھولوں کی پتیوں پر ایسے چمکتے نظر آتے ہیں۔ جیسے رات کو آسمان کے تارے تھے۔ کیا خبر ہے کہ رات کے وقت تارے ٹوٹ پڑے ہوں۔ یہ انہی کی گل افشانیاں ہیں۔

کہتے ہیں کہ اوس میں سونا۔ اوس میں پھرنا جسم انسان کے لئے مضر ہے۔ خبر نہیں یہ کیوں کہتے ہیں۔ خدا کی ساری مخلوق تو اوس باری سے تر و تازہ اور نہال ہو جاتی ہے۔ انسان بھی ایک مخلوق ہے۔ اُس کو اس سے کیوں نقصان پہنچتا ہے۔ یہ تو سائنس والے بتائیں گے کہ اوس کیا چیز ہے۔ کہاں سے آتی ہے۔ کیوں آتی ہے۔ فقیر تو اتنا جانتا ہے کہ اوس قدرت ربانی کا عجیب و غریب جلوہ ہے جن کی آنکھ بہت سویرے بیدار ہونے کی عادی ہے۔ وہ صبح کے وقت سورج نکلنے سے پہلے اوس میں ذات الٰہی کے ہزاروں جلوے مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک شخص کو دیکھا باغ میں جوہی کے پھولوں کے پاس جھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا۔ اور ایسا مستغرق تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہیں تھی۔ درحقیقت جوہی کے پھول پر اوس کا انداز قیامت کا ہوتا ہے۔ چھوٹا سا پھول۔ نازک پتیاں اور اُس پر اوس کی ننھی ننھی بوندیں جس و حرکت کرنے والے دل کے لئے دورِ محشر سے کم نہیں اوس کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ رات کو پیدا ہوتی ہے۔ اور سورج نکلتے وقت مر جاتی ہے۔ اوس کی سیرابی باران رحمت کی طرح ہر خاص و عام چھوٹے بڑے نیچے اونچے کے لئے یکساں مفید ہے۔ مگر مینہ سورج کا مقابلہ

کرتا ہے۔ بادلوں کے لشکر لاتا ہے تو آفتاب کو پوشیدہ ہونا پڑتا ہے۔ مگر اوس بیچاری بڑی ڈرپوک صلح کل ہے۔ آسمان پر جب سورج کا عمل دخل نہیں رہتا۔ اور بادل بھی اپنے گھروں میں چلے جاتے ہیں۔ اوسوقت یہ نمودار ہوتی ہے۔ اور سورج کے نکلنے کیساتھ ہی جان دیدیتی ہے۔

اوس کی شکایت

انسان اگر یہ شکایت کرے تو حق بجانب ہے۔ کہ اوس تمام درو دیوار کو شجر و حجر کو تر کردیتی ہے۔ مگر کسی پیاسی زبان کی تشنگی دور نہیں کرسکتی۔ اردو زبان میں ایک مثل ہے کہ اوس جب پڑتی ہے تو ہاتھی بھیگ جاتا ہے گویا ہاتھی اوس میں نہا لیتا ہے۔ مگر چڑیا کی پیاس نہیں بجھتی۔ یہ قدرت کا ایک گہرا راز ہے۔ اس میں اوس کی کچھ شکایت نہ کرنی چاہیئے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے اوس بھی ایک نشانی ہے جس کو دیکھکر دل حق پرست میں عرفان یزدان کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

رمضان میں سیاہ وسفید ڈورے کی رہنمائی

(از توحید ۱۶ر اگست سنہ ۱۹۱۳ء)

دنیا کی سب سے بڑی کتاب میں رمضان کی نسبت خدا نے فرمایا کلوا واشربوا حتے یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر کھاؤ اور پیو جبتک کہ صبح کا سفید ڈورا کالے ڈورے سے نمایاں نہ ہوجائے۔ اہل فقہ کہتے ہیں کہ صبح کاذب کے بعد جب صبح صادق نمودار ہونے لگے تو کھانا پینا ترک کردینا چاہیئے۔ ایک جماعت نے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ صبح صادق جب ہوتی ہے کہ نور سحر کے سبب آنکھ کالے سفید ڈورے میں تمیز کرنے لگے۔

یہ تو اہل علم کے مسائل ہیں۔ گدڑی پوش بے نوا کو یہ بحث مقصود نہیں ہے وہ تو قرآن بھیجنے والے کی اس ادا کو دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے۔ جو خیط ابیض اور خیط اسود یعنی سفید کالے ڈورے کے الفاظ میں نظر آتی ہے۔

اگر زخمی دل والوں اور تیر خوردہ جگر کو معلوم ہوجاتا کہ روزے کی سحری میں نور ظلمات کے کرشمے دکھائے جاتے ہیں۔ اور رخ و زلف کے جلووں سے رہنمائی ہوتی ہے تو ساری عمر روزہ ترک نہ کیا جاتا۔ اور غالباً یہی وجہ ہے جو بعض مست الست بارہ مہینے لگاتار روزے رکھتے ہیں ان پر انہی کالے سفید ڈوروں نے ڈورے ڈالے ہیں۔ خلقت ولائتی گھڑیوں۔ گولوں اور نقاروں پر آسرا جمائے بیٹھی رہتی ہے۔ ہزار میں شاید ایک آدمی کو بھی سحری کے وقت خدا کی بنائی ہوئی گھڑی کا خیال نہ آتا ہوگا۔

اگر وہ مجازی حیثیت سے ہی صبح کاذب اور صبح صادق کو محض وقت سحری معلوم کرنے کے لئے دیکھا کرے تو وقت سحر کے ہزاروں جلوے آسمان پر نظر آئیں۔

چشم حقیقت ان سیاہ وسفید ڈوروں میں رات دن کی سیاہی و سفیدی سے علیحدہ ایک چیز دیکھتی ہے۔ اس لئے اس کو رمضان کی سحری میونسپل کمیٹی کی ممبری۔ چھوٹے لاٹ کی کونسل کی ممبری۔ بڑے لاٹ کی کونسل کی ممبری اس سے بھی آگے عہدہ ججی اور اگر میسر آئے تو منصب وائسرائے یا وزیر ہند اس سے بھی بڑھ کر ہفت اقلیم کی بادشاہی سے بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔

دنیا کے حریص بادشاہوں اور امیروں سے کہو کہ اپنی طمع کاریوں کو چھوڑ دیں اور پچھلی رات بیدار ہوکر کالے سفید ڈوروں کی بہار دیکھیں کہ کیوں کر رات کی تاریکی میں نور کی سپیدی نمودار ہوتی ہے۔ اور اس ظہور کے وقت دل کو اگر اس میں حس ہو کیسی لذت آتی ہے۔ اگر وہ اس لذت کا ایک بار بھی معائنہ کریں تو دنیا کے یہ تمام جھگڑے فساد مٹ جائیں۔ مگر وہ سیاہ سفید ڈورے والے جناب تو خیر و شر

کے قبضہ دار ہیں وہ کب گوارا کریں گے کہ یہ آنکھ ان کی شان کو دیکھ کر لطف اٹھائے

گیان کتھا

(از توحید ۱۶ ستمبر ۱۹۱۳ء)

اپنے گیانی دیس ہندوستان کو کیا کہوں۔ بدیسی سنگت سے اگیانی ہو گیا۔ یونیورسٹی کی کتابوں میں صبر سنتوش شانتی و اطمینان کا راستہ ڈھونڈھتا ہے۔

کل پچھلی رات آکاش بانی صدائے ہو۔ میرے کان میں آئی۔ کہا۔ علم کاغذی کتابوں میں نہ دیکھ۔ سنسار کائنات ہستی موجود کا ورق کھول۔ اس میں دھیان کر۔ اور گیانی بن۔ میں نے کہا تو؟ ۔ اور مجھ کو پڑھا۔ میرے پرم گیان پربھو۔ عالم اسرار خداوند نے اس کو مانا اور مجھ پر نازل فرمایا۔

پانی دیکھنے میں ایک۔ مگر مزا سمندر کا کھاری۔ کنوئیں دریا کا میٹھا۔ گلاب کی جڑ اور تخم ایک۔ لیکن پھول۔ پتے کانٹے میں جدائی۔ پانی کی افراط۔ درخت کو گلا دیتی ہے مگر کنول کے پھول کی زندگی لبریز پانی سے ہے۔

تو دیکھ بگلا سفید ہے۔ کوئل کالی ہے۔ طوطا سبز ہے۔ تو سن۔ انجن کی سیٹی کان کو ناگوار ہے۔ اور پپیہے کے نغمے دلنواز۔ تو چکھ۔ املی کھٹی ہے۔ نیم کڑوا ہے۔ گھر سے نکل پہاڑ اونچے ہیں۔ زمین نیچی ہے۔ دریا بہتے ہیں۔ کنارے ساکن ہیں۔ غور کر۔ سورج نکلتا اور روز چھپ جاتا ہے۔ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں نور و ظلمت کی دو حکومتیں پلٹ جاتی ہیں۔

یہ کیوں ہے؟

تیرے صبر و قرار کے لئے سنسار بے قرار ہے شعلے بھڑکتے ہیں۔ دریا بہتے ہیں۔ سمندر

موجیں مارتا ہے۔ ہوا چلتی ہے۔ بادل آتے جاتے برستے برساتے ہیں۔ بجلی چمکتی کڑکتی ہے۔ بوندیاں اعلیٰ سے اسفل ہوتی ہیں۔ تاکہ تیرا وجود انقلاب ایام سے گھبرا نہ جائے اور جانے کہ گردش ہر موجود کی ڈیوٹی ہے۔ بدلنا ہر حالت کا اقتضا ہے۔ سمندر چڑھاؤ اور نشیب و فراز کے عالم اپنی صحت کی خاطر برداشت کرتا ہے۔ ورنہ اس کا پانی سڑ جائے دریا اپنی زندگی کے لئے رواں دواں ہے۔ ورنہ تالاب کا گندہ پانی کہلائے۔ ہوا نہ چلے تو گھٹ ورنہ بھری اور بھاری ہو جائے۔ شعلۂ آتش نہ بھڑکے تو دھوئیں کی تاریکی میں نابود رہے۔ بادل نہ برسیں تو دوسرے سال سمندر میں اژدہے پیدا نہ ہوں۔ اور ان کی نسل منقطع ہو جائے بجلی چمکنا گرجنا چھوڑ دے تو فلک کے اعیان و اشراف میں بے آبرو ہو جائے۔ بوندیاں خاک کی پامالی سے انکار کریں۔ تو ابر رحمت کے خطاب سے محروم کر دی جائیں۔

انسان! آدمی! خیال کر۔ جب ہر چیز اپنی غرض اور ذاتی مطلب کے لئے متحرک ہے۔ تو تو کیوں پریشان ہوتا ہے۔ کرم کر۔ عمل کر۔ گیان۔ موکش۔ سرور ابدی عمل و حرکت میں ہے۔

دنیا کی بنیاد خوشی و راحت پر ہے

دیوانہ ہوا ہے۔ زندگی کو آلام و مصیبت کی پوٹ سمجھتا ہے۔ تو کیسا نادان ہے۔ میں نے نیچر و فطرت کی بنا خوشی و راحت پر رکھی ہے۔ جب تو بیمار ہوتا ہے۔ ابر سورج پر آ جاتا ہے۔ دریا کنارے سے اُبل پڑتا ہے تو تو صحت۔ روشنی اور سیلاب سے سلامتی مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تکلیف ہوں۔ مگر بیماری کے جاتے رہنے۔ بادل کے پھٹ جانے طوفان کے ختم جانے سے کیا کوئی نئی چیز حاصل ہوتی ہے۔ بیماری گئی تو وہی تندرستی آئی جو پہلے تھی۔ بادل پھٹا تو وہ سورج چمکا جو پہلے اسی طرح چمکا کرتا تھا۔ طوفان رکا۔ دریا تھما

تو وہی کنارہ نظر آیا جو ہمیشہ خشک رہا کرتا تھا۔ کوئی نئی چیز تجھ کو حاصل نہیں ہوئی اس کو سوچ۔ میں نے تجھ کو تندرست بشاش مطمئن پیدا کیا ہے۔ تیرے اعمال تیرے کرم تجھ کو تکلیف دیتے ہیں۔ جو عارضی ہوتے ہیں۔ اور اس کا دور ہونا اور اصل بنیاد کا از سر نو نمودار ہونا میرا اٹل قانون ہے۔ اس واسطے عارضی تکلیفات سے مضطرب اور مایوس نہ ہوا کر۔ پھانس نکلنے کو چبھتی ہے۔ پیاس بجھنے کو لگتی ہے۔ بھوک پیٹ بھرنے کے لئے پیدا ہوتی ہے۔ جب کانٹا چبھے تو سمجھ لے کہ اس کو ایک وقت نکلنا ہے۔ بھوک پیاس کی خواہش ہو تو خیال کر کہ کھانا پانی ملنا لازمی ہے۔ بیماری آئے تو یقین کر کہ تندرستی بھی اس کے ساتھ ہے۔

میں نے آدم کو اپنے وجود محیط الکل کا آئینہ بنایا ہے۔ اس میں میری کبریائی دیکھ۔ میری رعنائی اور قہاری مشاہدہ کر۔ میری رحمدلی و ملنساری کو محسوس کر۔ اسرار مخفی کے نمود و ظہور کی خاطر یہ کارخانہ بنا ہے۔ ان کو نمودار ہونے دے۔ جب تو آئینہ ہے تو میرے ہاتھ میں رہ۔ اور جو کچھ تجھ میں نظر آئے اسمیں دخل انداز نہ ہو۔

معبود و عبد نواز کے اس القا کے بعد میں نے اپنے جسم۔ اپنی قوم کے جسم۔ اپنے ملک کے جسم۔ اعضا سے خطاب کیا۔ جو حوادث ایام سے آشفتہ تھے۔ اور روح سے ناواقی کے مطالبات کر رہے تھے۔ اور کہا ظہور صفات کے کرشموں سے ہراساں اور مایوس نہ ہو۔ اور اپنے رب پر توکل و اعتماد سیکھو۔ جس میں راحت و ایمان ہے۔

ہردواری گنگا کے کنارے چنتامن مورتی

(از توحید ستمبر ۱۹۱۳ء)

کیسا اچھا وقت تھا۔ جب اس مضمون کا لکھنے والا ننگے پاؤں ننگے سر ریل میں جگی

کندھے پر کمبل۔ ہاتھ میں ڈنڈا لئے۔ ہردوار میں ہر کی پیڑی کے سامنے گنگا کے عالم آب کی بہار دیکھ رہا تھا۔

دریا لہریں مارتا نہانے والوں کے میل کچیل کو صاف کرتا۔ بچہ سیڑھیوں کو گلے لگاتا۔ اٹکھیلیاں کرتا ہوا جا رہا تھا۔

مجھ کو عالم محویت و استغراق میں دیکھ کر ایک سادھو مورتی ادھر آن نکلی۔ میں سمجھا کوئی پوجاری ہے۔ اس لئے توجہ نہ کی۔ اور منہ پھیر لیا۔ کیونکہ تین روز سے پوجاریوں نے میرے اطمینان کو غارت کر رکھا تھا۔ اجنبی دیکھ کر نذرانے مانگتے تھے۔ اور سکوت کے لطف کو برباد کرتے تھے۔

سادھو داتا تاڑ گئے۔ اور بولے۔ گنگا جی کی لہروں میں دُکھ سکھ دونوں ہیں دکھ سے گھبراتا سکھ سے ہاتھ اٹھاتا ہے۔

کانوں کو اس مزیدار بات نے متوجہ کر لیا۔ مڑ کر دیکھا۔ عجیب مستانی صورت تھی۔ ساٹھ ستر برس کی عمر۔ مگر آنکھیں عہد شباب کی مستی سے مخمور۔ چہرہ ماہتاب کی مانند پُر نور۔ میں بولا، جا بابا اپنا کام کر۔ یہاں دُکھ سکھ سے غرض نہیں۔ ہر کا نام سنا تھا۔ ہردوار کے لفظ نے بیتاب کیا تھا۔ ادھر بھی آ گئے۔ دُکھ سکھ کا قصہ ان کو سنا جنھوں نے یہ سامنے کا کتبہ لگایا ہے جسمیں گنگا جی کے مناقب ہیں۔ سادھو نے منہ پھیر کر اس پتھر کو دیکھا۔ جس پر اردو زبان میں گنگا کی تعریف کے اشعار کندہ تھے۔ اور ہنسکر میری طرف متوجہ ہوا اور کہا۔ ان لکیروں سے تو مجھ کو بھی کچھ سروکار نہیں۔ اپنی جھولی کو ٹٹول اسمیں کیا ہے۔ میں نے کہا اس کو نوٹ بک کہتے ہیں۔ جی چاہتا ہے تو اس میں کچھ لکھ لیتا ہوں کہنے لگا اس کے پانچویں ورق میں کیا یادداشت لکھی ہے؟ اس سوال نے متعجب کیا۔ نوٹ بک نکالی۔ دیکھا لکھا تھا۔ ہردوار یا رشی کیش میں کوئی کام کا فقیر ملے تو اس سے خواب کا بھید دریافت کرنا چاہئے۔

سادہو کے مکاشفے سے حیرانی ہوئی۔ مگر اطمینان کے لہجہ میں کہا۔ میں نے وہ ورق دیکھا۔ آپ اس کا جواب دے سکتے ہیں؟

بولے۔ ہاں میں اسی لئے آیا ہوں۔ تم ابھی بیدار ہو۔ اور دنیا کے بیدار کرنیکا گھمنڈ دل میں ہے۔ اس کو چھوڑ دو۔ آنکھیں بند کرو۔ تاکہ نیند کا طلسم کھل جائے۔

میں نے کہا۔ کس کا سوتا۔ کیسا جاگنا۔ بات کو چکر میں نہ ڈالو۔ میں نے بہت سی آنکھیں دیکھی ہیں۔ جو کہنا ہو صاف صاف کہو۔ فرمایا۔ گنگا میں اشنان کیا ہو عرض کی کئی بار فرمایا کچھ دیکھا؟ کہا۔ کچھ نہیں۔ ارشاد ہوا اب نہاؤ۔ دل میں خطرہ گذرا کوئی چور نہ ہو۔ کمر کی نقدی بھانپ کر کپڑے اُتروانا چاہتا ہو۔ اس لئے عذر کیا کہ اس وقت نہیں نہاؤں گا۔ بولے اچھا جانے دو۔ دل کو شبہ کے گناہ سے بچاؤ۔ اور لو سنو۔ کان میں کچھ کہوں۔ میں نے سر جھکا دیا۔ اور سادہو داتا نے خواب کی نسبت کچھ کہا۔

بات معمولی تھی جس کو میں اکثر سوچا کرتا تھا۔ مگر اس انداز کی تھی کہ جی بیقرار ہو گیا۔ فرمایا لو جاتے ہیں۔ اور اٹھ کر چلنے لگے۔ میں نے بے اختیار ہو کر دامن پکڑ لیا۔ اور عرض کی نام بتاتے جایئے۔ ٹھکانے کا نشان فرمایئے۔ تاکہ پھر درشن ہو جائیں۔ بولے جیتا من اس مورت کا نام ہے۔ اور مقام کا کچھ ٹھیک نہیں۔ آج یہاں کل وہاں۔ ہر دوار میں دھوکہ بازوں سے بچنا۔ رشی کیش جاؤ تو وہاں بھی اچھی صورت پر فریفتہ نہ ہو جانا۔ بہت سے دوکاندار فقیری لباس میں ملیں گے۔ مگر جو بات کان میں کہی ہے۔ اس کو یاد رکھو گے تو گنگا کے کنارے آنے کا پھل مل جائے گا۔

گنگا جس کا نام ہے وہ یہ دریا نہیں جو پانی کی صورت میں رواں دواں نظر آتا ہے گنگا کی عظمت کو اس خیال سے کیا سروکار۔ جو نئی روشنی کے لوگ مادی صورت میں پیش کیا کرتے ہیں۔ گنگا کی حقیقت بڑے سوچ بچار سے معلوم ہوتی ہے یہ کہا اور چل دیئے۔

انگلی کا کشف

(از نظام المشائخ مئی ۱۹۱۲ء)

دل۔ دماغ۔ اور روح کا کشف سب نے سنا ہوگا۔ انگلی کا کشف عجیب ہے۔ مگر ان کے لئے جو انسانی اسرار سے بے خبر ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ اس بولتی چالتی مورت میں اللہ میاں نے کیا کیا بھید رکھے ہیں۔

کشف کے منکر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ کسی انسان میں کشف غیب کی طاقت نہیں۔ جو اولیاء اللہ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان کو کشف کے ذریعہ امور مخفی معلوم ہو جاتے ہیں۔ سب غلط اور توہم پرستی ہے۔

لیکن ہمیں انکار اقرار سے کیا سروکار۔ ہم تو کشف پر عقیدہ رکھنے والے لوگ ہیں جو قصہ اس قسم کا سنتے ہیں۔ ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اور اسرار سبحانی کی عظمت بڑھتی ہے۔

دہلی میں میرے ایک دوست ڈاکٹر سراج الدین نامی ہیں۔ حبش خاں کے پھاٹک میں مطب کرتے ہیں۔ طبی اور جراحی قابلیتوں میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ باعتبار مشرب اہلحدیث یعنی غیر مقلد ہیں۔ لیکن ان کی عادات وخصائل سچے اور پکے درویشوں کی سی ہیں۔ یعنی بے طمع سادگی پسند فقیر دوست۔ صلح کل۔ ہزاروں غریب ان سے فیض پاتے ہیں۔ قصہ مختصر چارصدی اول کے درویشوں کا نمونہ ہیں۔

میں بیمار تو زیادہ ہوتا ہوں۔ مگر علاج زیادہ نہیں کرتا۔ اور کرتا ہوں تو اس غیر مقلد درویش کا۔ خدا تعالےٰ نے بھی ڈاکٹر صاحب کی صادق بندگی کو محروم نہیں رکھا۔ اور ہاتھ میں وہ اثر دیا ہے کہ ان کے بیمار عموماً اچھے ہو جاتے ہیں۔ اور سب عجیب کمال یہ عطا ہوا ہے کہ ان کی انگلیوں کو کشف ہوتا ہے۔ جسم ٹٹول کر بتا دیتے ہیں کہ

یہاں پھوڑا ہے۔ اتنا بڑا۔ اتنا گہرا اور اتنی پیپ اس کے اندر ہے۔ اتنے عرصہ میں اسکا مواد پختہ ہو جائیگا۔ بظاہر یہ امر ایک معمولی معلوم ہوتا ہے۔ ہر جراح اور تجربہ کار ڈاکٹر اس قسم کی باتیں بتا سکتا ہے۔ مگر تعجب تو اس کا ہے کہ کبھی ان کی رائے غلط نہیں ہوتی۔ بڑے بڑے سند یافتہ ڈاکٹروں کے مقابلہ میں ان کی رائے درست نکلی ہے اور ایسی درست کہ ذرہ بھر فرق نہیں رہتا۔ دہلی و بیرونجات میں جن لوگوں کو ان سے سابقہ پڑا ہے وہ ایسے سیکڑوں واقعے جانتے ہوں گے۔ لیکن ابھی حال میں جو معرکہ پیش آیا ہے، وہ سب سے عجیب ہے۔ دہلی میں ایک مشہور و معروف ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ہیں جن کو شاید سرکار سے ہزار روپے کے قریب ماہوار پنشن ملتی ہے۔ سنا ہے کہ ان کے جسم میں کہیں پھوڑا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر سراج الدین کو بلایا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ پیپ پڑ گئی ہے۔ نشتر لگانا چاہیے۔ انگریز سول سرجن اور دیگر چند ڈاکٹر بلائے گئے۔ ان سب کی رائے ہوئی کہ پیپ نام کو نہیں۔ نہ ابھی پھوڑا پکا ہے۔ آخر بڑی بحث اور پورے غور و خوض کے بعد چیرا دیا گیا تو ڈاکٹر سراج الدین کی رائے صحیح نکلی۔

رمزِ حقیقت

ڈاکٹر سراج الدین کی یہ قابلیت رمزِ حقیقت ہے۔ خداوند تعالیٰ نے دکھانا چاہتا ہے کہ کسب اور کوشش سے انگلی تک کاشفِ حقیقت بن جاتی ہے۔ روحانی کشف تو اس سے بھی بڑھ کر کشافِ حقیقت ہوتا ہوگا۔

ڈاکٹر سراج الدین ناراض نہ ہوں ان کے عقیدے پر حملہ کرنے کی نیت سے یہ نہیں لکھا جاتا۔ وہ اگر اپنے مشرب اہلِ حدیث کے سبب کشف کے قائل نہ ہوں تو مضائقہ نہیں ہم ان کی انگلی کے کشف کے دل سے قائل ہیں۔ اور قدرتِ ایزدی کے کرشموں پر سر ہلانے والے مستانوں کی اطلاع کے لئے اس خبر کو درج کرتے ہیں۔ امید ہے کہ اس

بات کا علم بہت لوگوں کے باطنی لطف و طرب کا باعث ہوگا۔

اینٹ چونے کا وصال

(از نظام المشائخ جون ۱۹۱۳ء)

ایک دن کا ذکر ہے کہ انبالہ شہر میں کسی شاندار مکان کے اندر آدم کی اولاد جوق جوق جمع ہو رہی تھی۔ ہر ابنِ آدم کا چہرہ بشاش تھا۔ آنکھیں شگفتہ تھیں گویا وہ کسی ایسی چیز کے دیکھنے کو آئے تھے جو ان کے دل و دماغ پر شوق و اشتیاق کے عالم میں چھائی ہوئی تھی۔

ایک آدم زاد ان میں ایسا بھی تھا جو مکین سے پہلے مکان کے تماشے میں محوِ حیرت تھا اور کہتا تھا۔ او مکان! تو مجھ سے قد میں بھی بڑا جسم بھی تیرا بہت چوڑا چکلا۔ مگر زبان ہلا نہیں۔ مجھ کو دیکھ سوا دو گز اونچا ہوں۔ لیکن زبان بارہ ہاتھ کی رکھتا ہوں۔ میرے پاس اتنے آدمی مہمان آتے تو خوب جی کھول کر باتیں کرتا۔ اپنی کہتا۔ ان کی سنتا۔ تیری طرح ساکت و صامت رہکر یہ نہ کہوا تا کہ بیزبان منہ سے نہیں بولتا شاید اس کو مہمانوں کا آنا ناگوار ہوا ہے۔ آدمی کے اس اعتراض کا مکان نے تو کچھ جواب نہ دیا۔ البتہ خود اس کے دل نے اس سے کہا من عرف کل لسانہ جو پہچان لیتا ہے اس کی زبان گونگی ہو جاتی ہے۔ اور کبھی بھید کی بات لب تک نہیں آنے پاتی۔ اس مکان کے جتنے اجزا ہیں سب نے اپنے مقامات فنا سے گزر کر یہ مقام بقا حاصل کیا ہے۔ اب اس کو کیا ضرورت ہے کہ باتونی آدمی کو منہ لگائے وہ آدمی جو دعوئے اشرف المخلوقات کے باوجود امتحاناتِ فنائی سے دم چراتا ہے اور بغیر امتحان دیئے بقا کی ڈگری مانگنے پر آمادہ ہے۔

آدمی اپنے دل کی اس گفتگو سے خفا ہوا۔ تیوری چڑھائی اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔ اللہ میاں نے انسان کو سب طاقتیں دیں۔ مگر ایسی کوئی قوت نہ دی جس سے

یہ آستین کا سانپ خیال قابو میں آجاتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ذہن میں وہی بات پیدا
ہوا کرے جو مجھ کو اچھی معلوم ہو۔ یہ نہیں کہ میاں خیال رہیں تو میرے دل و دماغ میں اور
تعریف کریں دوسروں کی۔ میں ہاتھ سے کماتا ہوں۔ پکاتا ہوں۔ کھاتا ہوں۔ دانت سے
چباتا ہوں اور پیٹ سے ہضم کرکے دل اور اس کے تخیلات کو غذا پہنچاتا ہوں۔ پھر اسکو
کیا حق ہے کہ کھائے پئے میرے دسترخوان پر اور مدح سرائی دوسروں کی کرے۔

بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ میں اپنی کوئی حسرت پوری کرنا چاہتا ہوں تو یہ خیال
دامن پکڑتا ہے اور دوسری طرف لے چلنے کی ضد کرتا ہے۔ میں عالم تصور میں ایک نقشہ
جمانا چاہتا ہوں۔ یہ اس کا رنگ بگاڑ کر دوسرے رُخ متوجہ ہو جاتا ہے۔ کوئی ایسی مشین
نکلی جس کے ذریعے دل و دماغ کے باشندے خیالات قبضہ میں آجاتے اور آزاد
انسان اُس نظر نہ آنے والی ہستی کی قید سے رہائی پا جاتا۔

آدمی اتنا ہی سوچنے پایا تھا کہ اس کو صوت سرمدی میں ایک قہقہہ کی آواز آئی
کہنے والے نے کہا۔ تسخیر تخیل کی مشین مدت سے موجود ہے۔ تو کہاں تھا۔ کس حال میں تھا
جو آج تک اس کی خبر نہ ملی۔ ارے نادان۔ اگر تو ایک دروازے کو مضبوط پکڑلے اور
دربدر مارا مارا نہ پھرے تو تیرا دل اور اسمیں رہنے والا خیال بھی ہر جائی پنا چھوڑ دے۔
اس مکان کو نظر غور سے دیکھ جس پر بحث کا سلسلہ شروع ہوا ہے کہ جب اس کے منتشر
اجزا۔ اینٹ۔ چونہ۔ شہتیر ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔ کثرت کا نام فنا ہو گیا۔ (یعنی اب کوئی
اینٹ چونے کا نام علیحدہ نہیں لیتا۔ سب کے مجموعہ کو مکان کے نام سے پکارتے ہیں)
تب اس کو یہ درجہ حاصل ہوا کہ اشرف المخلوقات آدمی اس کی دید کو جمع ہوئے۔

تو بھی اگر اپنے ارادے و خیال پر قبضہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو حرص و ہوس بغض
ونفاق کی ہستی کو آتش عشق سے جلا ڈال۔ اور اپنے جذبات پراگندہ کو ایک بنیاد پر
چن لے۔ پھر دیکھ کہ خیالات قابو میں آتے ہیں یا نہیں۔

ذرا پھر غور کر۔ اس مکان میں لکڑی ہے۔ اینٹ ہے چونا ہے۔ رہا ہے لکڑی کو فنائی
امتحان کے کتنے درجے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اول ہرا بھرا درخت تھا جنگل میں آزادی و
خود مختاری سے ٹھنڈی ہوا کھاتا اور پاؤں کے ذریعہ زمین کا پانی پیتا تھا۔ جب داخلہ
امتحان کا وقت آیا۔ کلہاڑی سے کاٹا گیا۔ آری سے چیرا گیا۔ برمے سے برمایا گیا۔ رندے
سے چھیلا گیا۔ جب کہیں یہ رتبہ ملا کہ ایک شاندار مکان کا حصہ دار زینت ہے۔ اینٹ
کو زمین کا سینہ چاک کرکے کدال اور پھاوڑے مار مار کر مٹی باہر نکالی گئی۔ پانی ملا کر خوب
روندی اور مسلی گئی۔ سانچے میں ڈھال کر اس کی ایک شکل مرتب ہوئی۔ مٹی نے ہر چند کہا کہ
سب کچھ منظور۔ مگر میرے ہمجنس ذرات خاک کو باہم جدا نہ کرو۔ ایک ہی جگہ رہنے
دو۔ الگ الگ اینٹیں بنائی جائیں گی تو خانۂ وحدت کے ذرے جلا وطن اور خانہ ویران
ہو جائیں گے۔ لیکن اس کی فریاد کسی نے نہ سنی۔ یہاں تک کہ وہ دھوپ سے تپ تپ
کر خشک ہو گئی۔ اس کے بعد بیچاری آگ کے گھر میں بھیجی گئی۔ یا یوں کہئے کہ ناری قبر
میں دفن کی گئی۔ لوگ اس آتشی مقام سے گزرتے تھے۔ مگر کسی کو خیال بھی نہ آتا تھا
کہ اس کے اندر کون جل رہا ہے۔ جب اینٹ پر یہ بیکسی۔ کس مپرسی اور سوخت کا طول
کا وقت گزر گیا تو امتحان کی سند دی گئی۔ خاکی پیراہن کے بدلے سُرخ رنگ کا لباس
مرحمت ہوا۔ ٹھیلے پر سوار کرکے شہر میں لائی گئیں۔ حوض میں غسل دیا گیا۔ اور ان سب کو
جو امتحان سے پہلے ہمجنس کی فرقت سے پریشان تھیں۔ ہم آغوشی کی گھڑی نصیب ہوئی
کنکر زمین کا لخت جگر کدال کی نوک سے پارہ پارہ ہو کر باہر کھنچا۔ آگ میں پُھنکا۔ چونہ کہلایا
چکی میں پسا۔ پھر کہیں یہ نوبت آئی کہ عرصۂ دراز کی فرقت کے بعد اپنے ہم وطن اینٹ سے
وصال یابی نصیب ہوئی۔ اسی طرح لوہا بھی جلنے کٹنے پٹنے کی متعدد منازل کے بعد اس قابل
ہوا جو اس مکان میں جگہ پائی۔

جب یہ بے جان اشیاء کلفت و سوخت کے بغیر مرکز وحدت و طمانیت پر نہیں

ہوسکتیں تو پھر اشرف المخلوقات کہلا کر ان امتحانی سے کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے۔ تو نے سنا بھی۔ کہنے والا کہتا ہے۔ خام بودم۔ پختہ شدم۔ سوختم۔ پہلے کچا تھا۔ پھر پکا۔ اس کے بعد جل کر منزل حاصل کی۔ یہی کیفیت۔ اینٹ۔ چونے۔ لوہے کی ہوئی کہ ابتدا میں وہ بھی کچے تھے۔ پکنے اور جلنے کے بعد وصال نصیب ہوا۔ جس کی خوشی منانے آج اتنے آدم زاد جمع ہوئے ہیں۔ اسی طرح آدمیوں میں جو لوگ خامی سے گزر کر پختگی و سوختگی حاصل کر لیتے ہیں۔ تو ان کی قبروں پر بھی لوگ جمع ہوتے ہیں اور اس اجتماع کو عرس کے نام سے پکارتے ہیں۔ عرس کا لفظ عروس سے ہے۔ جس کے معنی شادی و خوشی کے ہیں۔ گویا عرس منزل رسیدہ لوگوں کی اصطلاح میں اس مسرت کی یادگار ہے۔ جو پختگی و سوختگی کے بعد مقام وصال و بقا تک لے جاتی ہے۔

نتیجہ

آدمی اور اس کے دل کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ جبتک امتحان فنائی کی تکلیفات و مصائب کو برداشت نہ کیا جائے یوم الوصال میسر نہیں آتا۔ اور خیالات مرکز توحید پر جمع نہیں ہوتے۔

لہٰذا ہم سب کو بھی اسلامی خدمت کے معاملے میں اس بے جان مگر معصوم ہستی کی مثال بغرض تقلید پیش نظر رکھنی چاہیئے۔ اور مردانہ وار آگے بڑھ کر دکھانا چاہیئے کہ ابن آدم اینٹ چونے سے گیا گزرا نہیں ہے۔

دوائی شیشی کے باطنی اشارے

آنکھ نے دیکھے کان نے سُنے

(از نظام المشائخ اگست ۱۹۱۲ء)

جب ڈاکٹر انصاری نے اپنے کان میں دوآلہ چڑھایا جسکو کان کی عینک کہنا چاہیئے

اور حسن نظامی کے سینے کو دیکھنا شروع کیا تو حسن نظامی کی آنکھ نے ڈاکٹری ساز و سامان سے باتیں شروع کیں۔ اور ان سے کچھ سُنا۔ گویا ڈاکٹر صاحب کے کان نے دیکھا اور حسن نظامی کی آنکھ نے سُنا۔

ڈاکٹر نے کہا معدہ و جگر میں ورم ہے۔ پھیپھڑا اپنے غنیم امراض کا مقابلہ کرتے کرتے تھک گیا۔ اس کو سکون کی ضرورت ہے۔ دماغ ترک مشاغل کا خواستگار ہے۔ یہ نسخہ استعمال کرو اور چپ چاپ ہو کر بیٹھو۔

کان کی تشخیص سے ڈاکٹری زبان تقریر کر رہی تھی۔ مگر اس کے جواب میں حسن نظامی کی آنکھ نے دخل نہ دیا۔ وہ برابر اُن اشیاء کو دیکھتی رہی جو میز پر مراقبہ ربانی میں مصروف تھیں۔

قلم آزادی سے دوات کے پہلو میں بیٹھا تھا کہ ڈاکٹری ہاتھ نے اسکو گرفتار کیا اور کہا لکھ۔ اس نے تعمیل کی۔ اور کاغذ پر حرکت کرنے لگا۔ پوچھا گیا کیا لکھتا ہے۔ بولا کچھ خبر نہیں۔ ہاتھ کا تابعدار ہوں جو چاہتا ہے لکھواتا ہے۔ ہاتھ کی آواز آئی۔ نہیں میرا بھی کچھ دخل نہیں۔ آنکھ کے اشارے سے لکھ رہا ہوں۔ آنکھ نے بگڑ کر کہا۔ کان نے مرض کی شناخت کی ہے۔ وہی لکھواتا ہوگا۔ کان نے کہا نہیں جناب مجھے بھی کچھ خبر نہیں۔ یہ تو کسی اور طاقت کا کام ہے۔

حسن نظامی اس انکار یہ بحث کو سن رہا تھا کہ نسخہ تیار ہو گیا۔ کاغذی پُرزا تھا دوا فروش نے پڑھ کر دو شیشیاں دیدیں جن پر ولائتی لاکھ کی سُرخ مہر لگی ہوئی تھی۔

جب یہ شیشیاں گھر میں آئیں کاغذی خرقے سے برہنہ ہوئیں۔ واحدی صاحب نے بستر بیمار کے قریب لا کر رکھا۔ چاقو منگایا۔ تا کہ بھیدی مہر شیشی کے منہ سے تراشیں تو ایک صدائے سرمدی آنکھ میں آئی۔ پہلے مجھ کو دیکھو اور میری سُنو۔

کانچ کی معمولی شیشی ہوں۔ دیکھنے میں چھوٹا سا ظرف رکھتی ہوں۔ مگر انسان

اشرف المخلوقات سے زیادہ صاحب تحمل و برداشت ہوں۔ اگر آدمی وہ سب دوا ایک ہی دفعہ پی جائے جو میرے اندر ہے تو مر جائے۔ مگر میں خود زندہ ہوں۔ اور دوسروں کی زندگی میرے ہاتھ میں ہے۔

یہ تمہارے منہ پر مہر کیسی ہے؟

ہائیں تم نہیں جانتے۔ باطنی تاثیر کے لئے یہ لازمی شرط ہے کہ سر بمہر ہو۔ درویش کے منہ پر سکوت کی مہر اسی غرض سے لگائی جاتی ہے کہ وہ امراض روحانی کی دوا ہے۔ منہ کھلی شیشی کی دوا قابل اعتبار نہیں۔

اچھا تو کاغذی لباس تم کو کیوں پہنایا گیا تھا۔

اس کا جواب بھی سن لو۔ الناس باللباس آدمیت کی پہچان لباس سے ہوتی ہے۔ تو میں دائرہ شائستگی سے کس طرح باہر رہتی۔ خرقہ مکتوبی پہن کر نمودار ہوئی۔ تب معلوم ہوا کہ میں کس مرض کی دوا ہوں۔

کیوں بی شیشی! تمہاری شکل تو گوری ہے۔ اگر تم کالی ہوتیں تو دوا کی تاثیر میں کچھ فرق پڑ جاتا یا نہیں؟

واہ کیا مجھکو یورپین خیال کر لیا۔ گو میری نمود یورپ میں ہوئی۔ لیکن اصل نسل مسلمان اور اس پر صوفیانہ عقائد رکھنے والی۔ میرے ہاں گورے کالے کی بحث گناہ ہے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ باطن صاف ہونا چاہیئے۔ رنگ سفید ہو یا سیاہ۔ اگر میرا تن سیاہ ہوتا تو دوا کی تاثیر کو کیا نقصان پہونچاتا۔ اصلیت ہم دونوں کی کانچ ہوتی ہے۔ دوا دونوں میں یکساں ہوتی ہے۔ پھر سیاہ سفید کی بحث سے کیا حاصل۔

درویش کی مہر سکوت ٹوٹ جائے تو پھر وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ تمہاری لاکھی مہر دور ہو جائے تو بیکار ہو جاتی ہو یا نہیں؟

میری مہر سکوت کھلتی ہے تو دوسرے کے فائدہ کے لئے کھلتی ہے۔ ایسا ہی

درویش اگر دوسرے کی فائدہ رسانی کی خاطر سکوت کی مہر توڑ ڈالے تو ہرج نہیں بلکہ مہر لگتی اسی واسطے ہے کہ کسی کے فائدے کے لئے ٹوٹے۔ میرے منہ پر مہر نہ ہو تو کوڑی کے کام کی نہیں۔ کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے۔ مثلاً اگر کسی حادثہ سے میرا منہ کھل جائے تو دوا فروش مجھکو پھینک دیتا ہے۔ کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ اب بازار میں اس کا کوئی خریدار نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اندیشہ ہے کہ بیرونی زہریلا اثر اس میں نہ ہو گیا ہو۔ جو بیمار کو نقصان پہونچائے۔ اسی پر درویش کو قیاس کرنا چاہیئے کہ جب اس کا منہ نفسانی و دنیاوی خواہشات کے لئے کھل جاتا ہے تو روحانی اسپتال میں وہ پھینکنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

واحدی کو دیکھو۔ ابھی باتیں ختم نہ ہونے پائی تھیں کہ انہوں نے شیشی کا منہ کھولکر چمچہ میں دوا نکال لی۔ اور اس زبان و حلق کو تلخ کر دیا جس کے پڑوسی آنکھ۔ کان شیشی کے باطنی اشاروں کا مزیدار لطف اٹھا رہے تھے۔

وحدت سرد کام

برف

(از نظام المشائخ اگست سنہ ۱۹۱۲ء)

تشنگی آلود ایام کیسی بہار کے ہیں جو لوگ حبس دم کے بھید سے واقف نہیں بتدریج ان پر موسمی حبس طاری کرتی ہے۔ اس کے بعد ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا بھیجکر دیکھتی کہ آزادی حبس سے ان کی زبان پر شکر الٰہی جاری ہوا یا نہیں۔ مگر یہ غافل ہستیاں شکریہ ادا کرنے کے بجائے اور غفلت کی طرف جھکتی ہیں۔ یوں تو ہر موسم شان یزدانی کا ایک کرشمہ ہوتا ہے۔ مگر گرمی ملک ہندوستان میں ایک بے بہا نعمت ہے۔ جہاں

ہمیشہ سردی رہتی ہے یا گرمی تیز نہیں ہوتی۔ وہاں کے باشندے اس لطف سے نا آشنا ہیں کہ لُو کی گرم بازاری ہے۔ پسینے بہہ رہے ہیں۔ یکایک کسی گھنے درخت کے سایہ میں پہونچے۔ اور خنک ہوا بدن کو لگی۔ بس اس وقت جو کیفیت جسم و روح کی ہوتی ہے وہ زبان یا قلم سے ادا ہونی محال ہے۔ اللہ میاں نے ہر چیز حکمت سے پیدا کی ہے۔ موسم گرما میں بھی ہزاروں اسرار ہیں۔ جن کو چشم بصیرت عطا ہوئی ہے۔ وہ ان چیزوں کی حقیقت پر غور کر کے ذات باری کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا۔

اور تو اور ذرا گرمی کے تحفے برف کا خیال کرو۔ کیا صاف۔ شفاف۔ پیاری صورت والی چیز ہے۔ مگر آپ تو اس کو پی جانا جانتے ہیں۔ کبھی اس کے پگھلنے والے وجود کے رموز پر غور نہیں کرتے۔ آئیے آج دو گھڑی اس میں جی بہلائیں۔

برف کیا چیز ہے؟

اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک آسمانی۔ دوسری مصنوعی۔ آسمانی برف اونچے مقامات پر از خود نازل ہوتی ہے۔ سائنس والے کہتے ہیں کہ وہ ابخرے جو سمندر و زمین سے اُٹھ کر اوپر جاتے ہیں۔ اور مینھ کی صورت بن کر دوبارہ زمین پر برستے ہیں۔ وہی ابخرے شان الٰہی سے پہاڑوں پر برف کی شکل اختیار کر کے گرتے ہیں۔ اور جم جاتے ہیں۔

نئے زمانے والوں نے قدرتی برف پر غور کرتے کرتے بناوٹی برف کا بھید معلوم کر لیا۔ مشین کے ذریعے سے معمولی پانی کے وہ اجزا نکال لئے جاتے ہیں جن کے سبب پانی میں نرمی اور پتلا پن ہے۔ ان اجزا کے نکلتے ہی پانی سخت اور پتھر ہو کر ایسا ٹھنڈا ہو جاتا ہے کہ گرمی کے موسم میں ہر شخص اس پر جان دیتا ہے۔

برف میں صوفیانہ نکات

اس مختصر بیان کے بعد جس سے برف کی ظاہری حقیقت معلوم ہوئی اس کی باطنی

کیفیت پر توجہ کیجیے۔

جب تک پانی کے اندر نفسانی و کثیف اجزا شامل تھے اس کے جسم کو قرار و یکسوئی میسر نہ تھی۔ بہتا تھا۔ ہلتا تھا۔ ذرا سی گندگی سے میلا اور بدبودار ہو جاتا تھا جو رنگ اس میں ڈالا جاتا فوراً اس کا اثر قبول کر کے وہی رنگ اختیار کر لیتا تھا۔ لیکن مجاہدہ مشین نے اس کے تفرقہ انداز اجزا کو فنا کر کے ایسا پکا متحد کر دیا کہ جس رخ سے دیکھئے ایک ہی شکل نظر آتی ہے۔ اوپر بھی پانی۔ نیچے بھی پانی۔ اندر بھی پانی۔ باہر بھی پانی اور سب خنک و سرد۔ اس کو کہتے ہیں وحدت کا کمال۔ اب اس پر گندگی ڈالئے تو پھسل کر بہہ جائے گی۔ رنگ ڈالئے تو وہ بھی اوپر اوپر اُڑ جائے گا۔

صوفی بھی جب برف کی طرح اپنے باطن کو مجتمع کر لیتا ہے۔ تو پھر وہ خواہ کیسے ہی بدنما مقام میں جائے۔ اس پر کسی برائی کا اثر نہیں ہو سکتا۔

اور یہ بھی سُن لیجئے کہ برف میں ایسی خنکی کہاں سے آگئی کہ انسان اس کو ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ حالانکہ جب تک وہ پانی کی شکل میں تھی۔ ہر شخص آسانی سے اس میں ہاتھ پاؤں ڈال سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب نفسانی کثافت دور ہو جاتی ہے تو قدرت ایک ایسا جوہر پیدا کر دیتی ہے کہ پھر ہر کس و ناکس اس پر آسانی سے قبضہ نہیں پا سکتا۔

رہی یہ بات کہ پھر انسان اس کو کاٹ کر اور کچل کر شربت میں ملا کر کیوں پی جاتے ہیں اس کا جواب صاف یہ ہے کہ جس طرح صوفی دوسروں کی فائدہ رسانی اور تسکین کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح برف بھی پیاسوں اور تشنہ کاموں کی تسلی دیتی ہے۔ اور طرہ یہ کہ اپنی ہستی قربان کر کے تسلی دیتی ہے۔

ہائے غفلت شعار آدمی شیشے کے گلاس میں برف کا ٹکڑا ڈال کر گھونٹ لے رہا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ پارہ برف تیری خاطر اپنی چمک دار ہستی مٹا رہا ہے۔

گھلا جاتا ہے۔ اور پانی کو سرد کلام کر رہا ہے۔ مگر ابن آدم اس ذات ترحم صفات کا شکر نہیں بھیجتا۔ جس نے کائنات کے بے شمار جلوے اس کے لئے پیدا کئے۔ اول اول تو پروردگار ڈھیل دیتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ شاید یہ بندہ مجھ کو یاد کرلے۔ مگر جب وہ بے خبری سے باز نہیں آتا۔ تو پھر وہ تماشہ دکھاتا ہے۔ جو ابھی حال میں پیش آیا۔

کونٹانک نامی جہاز اہل مغرب نے بنایا۔ اور سمجھا کہ اب اس سے بڑا کوئی جہاز دنیا میں نہیں ہے۔ اس میں ہوائی کمرے بنائے تاکہ وہ پانی کے طوفان سے محفوظ رہے۔ اور ڈوبنے نہ پائے۔ لیکن قدرت نے خیال کیا کہ یہ سرکش آدمی یوں نہیں مانیں گے۔ اس واسطے اس نے اس جہاز کو برباد کرنے کے لئے برف کا ایک ٹکڑا بھیجا۔ جس نے دنیا کے سب سے بڑے جہاز کو ایک ہلکی سی ٹکر مار کر ٹکڑے کر دیا۔

اب انسانوں کی آنکھ کھلی کہ جس برف کو سوڈے کے پانی میں گھول کر پی جاتے تھے۔ جس برف کو موگری سے کچل ڈالتے تھے۔ اس برف کے ٹکڑے نے سیکڑوں قیمتی جانوں کو سمندر کے کھاری سوڈے میں بلاکر نوش جان کر لیا۔

جلال وجبروت والے کی ثنا

برف کی یہ گرم کہانی سنکر ان لوگوں کا فرض ہے جو جنگل میں درختوں کے پتوں پر معرفت الٰہی کے دفتر لکھے دیکھتے ہیں کہ اپنے جلال وجبروت والے خدا کی حمد و ثنا کریں۔ اے رب العزت۔ اے رب الحکمت۔ اے رب الاسرار جان تجھ پر صدقے۔ دل تجھ پر واری۔

برف سے گرنے والے ٹھنڈے قطروں کی قسم۔ ہم ان پر تیرے فیضان کی بہار دیکھتے ہیں۔ یہ قطرے زبان کی پیاس کو بجھاتے ہیں۔ ایسا قطرہ عنایت فرما جو دل کی تشنگی کو سیراب کرے۔

برف ہوا سے بچائی جائے۔ گرم کمبل میں چھپائی جائے تو جلدی نہیں پگھلتی ہم کو اپنی گلیم معرفت کے دامن میں ڈھک لے۔ تاکہ حوادث ایام کی ہوا ہماری وطنی ہستی کو برباد نہ کرنے پائے۔ الٰہی برف کے عذاب سے بچا۔ اور اس کو ہمارے جسم و روح کے لئے عذاب و شیریں کام بنا۔

دل ہاؤس

(از نظام المشائخ ستمبر ۱۹۱۲ء)

میاں سنتے ہو؟ دہلی میں گورنمنٹ ہاؤس بنتا ہے۔ دن رات کام ہو رہا ہے۔ آنکھیں جاگتی ہیں اور جگائی جاتی ہیں۔ تم بھی اپنا دل ہاؤس بناؤ۔ ویرانے کو آباد کرو۔ گورنمنٹ ہاؤس کا راتوں رات بننا ایک غیر معمولی جلدی کا سبب ہے۔ ورنہ ظاہری عمارات کے بنوانے والے صرف دن کو کام لیا کرتے ہیں۔ لیکن دل ہاؤس ایک ایسی عمارت ہے کہ یہ رات کے اندھیرے ہی میں چنی جاتی ہے۔ جس وقت سارا سنسار سوتا ہے اس وقت پروردگار اور اس کے وہ بندے جو دل ہاؤس کی تعمیر کے طلبگار ہیں۔ جاگتے ہیں۔

گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر میں بجلی کی روشنی ہے۔ غل ہے۔ شور ہے۔ مگر دل ہاؤس کی تعمیر کے واسطے تاریکی اور سکوت کی ضرورت ہے۔ جب گورنمنٹ ہاؤس بن جائیگا اس کے دروازوں پر پہرے دار ہوں گے کہ کوئی شخص اندر نہ آنے پائے۔ لیکن دل ہاؤس ایک ایسا وسیع مکان ہے جسمیں کائنات کے تمام جلوے بے روک ٹوک آسکتے ہیں۔ گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر میں اگر قبریں کھدوا کر پھینکدی جائیں مندروں اور مسجدوں کی مسماری ہو۔ وہ تاریخی مقامات جن سے دہلی کا چپہ چپہ معمور ہے۔

بے نام و نشان ہو جائیں۔ تب بھی تم اس کی تقلید میں کسی کی دل آزاری نہ کرنا کیونکہ دل ہاؤس کی تعمیر دل داری و دلجوئی کی بنیاد سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ہاتھ سے گئی تو مکان بننا دشوار ہو جائے گا۔ اول تو گورنمنٹ ہاؤس کے بنوانے والے بھی ایسے ستم شعار نہیں ہیں۔ جو خواہ مخواہ کسی کے دل دکھائیں۔ اور مذہبی یادگاروں کو مٹا کر اپنا گورنمنٹ ہاؤس بنائیں۔ اور اگر بفرض محال کوئی ایسی جگہ آ بھی جائے تو کافی معاوضہ دیدیا جائے گا۔ لیکن تمہارے گھر کے دل کی بنیاد ادنےٰ سی دلشکنی میں بے بنیاد ہو جاتی ہے۔ یہاں معاوضات سے کام نہیں چلتا۔

گورنمنٹ ہاؤس کے رہنے والے زمین اور اہل زمین کے جسموں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ دل ہاؤس کی جہانداری اس سے وسیع ہے۔ اس کا حکم جسم و روح دونوں پر چلتا ہے۔ گورنمنٹ ہاؤس کے اہل کار اور شہر یار بھی دل ہاؤس کے تابع فرمان ہیں۔

دل ہاؤس دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک دیسی اور ایک بدیسی۔ دل بچارہ ایشیا میں رہتا ہے۔ ہندوستان میں رہتا ہے۔ علی الخصوص مسلمانوں کے سینہ میں رہتا ہے۔ اور یہ وہ مقامات ہیں جہاں اس کی خوب خاطر داریاں ہوتی ہیں۔ اور اس کے جذبات کی بہت بڑی قدر کی جاتی ہے۔ یہی دل گو یورپ والوں کے سینے میں بھی رہتا ہے۔ مگر وہاں یہ اپنے گھر کے کام دھندے میں ایسا مصروف ہوتا ہے کہ دوسرے دل سے سروکار نہیں رکھتا۔ اسی واسطے ایشیا والے کہتے ہیں کہ یورپ کا دل خود غرض اور بکار خودی مصروف ہے۔ لیکن ہمیں اس سے بحث نہیں۔ کوئی خود غرض ہو یا نہ ہو۔ ہم تو اس کو دیکھتے ہیں کہ دل میں اپنے پیدا کرنے والے کی بھی کچھ یاد ہے یا نہیں۔ اگر ایشیا والوں میں یہ بات یورپ سے زیادہ ہے تو ہمیشہ انہی کا بول بالا ہوگا۔ اور اگر اہل یورپ کے دل واقعی اس نعمت سے

محروم ہیں تو ان کے علاقے اُجڑ جانے کے قابل ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ دیسی کے بعد بدیسی ہاؤس کو دیکھئے۔ خبر نہیں لوگوں نے دیسی بدیسی کا کیا جھگڑا لگایا ہے۔ ہاؤس کے معنی انگریزی زبان میں گھر کے ہیں۔ خانہ دل نہ کہا بیت القلب نہ پکارا۔ دل ہاؤس کہہ دیا۔ مفہوم و مقصود و حقیقت تینوں کی ایک ہی ہے۔ فرق صرف زبان اور بولی کا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ دہلی کو دل لی کہتے تھے۔ یعنی دل لینے والی بستی۔ اب وہ وقت کہاں۔ نہ دل ہی رہا۔ اور نہ دل لینے والی ہی رہی۔ وہ اجڑ گیا۔ یہ مٹ گئی وہ برباد ہو گیا یہ تباہ ہو گئی۔ شکر ہے کہ انگریزی سرکار نے جھاڑو ہاتھ میں لیکر اس کی صفائی شروع کی ہے۔ شاید کوڑے کرکٹ دور ہونے سے اس کی حالت کچھ سنبھل جائے۔ لیکن ابھی تک تو دل لی کا نام اس پر صادق آنے کا کوئی سامان نظر نہیں آتا۔

خدا بخشے میری بیماری کو جس کے طفیل ڈلہوزی پہاڑ پر جانا ہوا تھا۔ ایک انگریزی والے نے کہا۔ ہوزا اور ہاؤس ایک ہی چیز ہے۔ جس کے معنے گھر کے ہیں گویا یہ پہاڑ دل ہاؤس یا بیت القلب تھا۔ کانوں کو یہ نام بہت بھلا معلوم ہوا۔ اور اس لفظ میں اسرار حقیقت کے کرشمے نظر آنے لگے۔ جب اس پہاڑ کی صورت دیکھی تو معلوم ہوا کہ بہشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ وہ بہشت جس کی مومن اور نیکو کار لوگوں کے نام رجسٹری نہیں ہوئی۔ اس میں ہندو مسلمان نیک و بد ادنےٰ اعلےٰ بلا روک ٹوک کے آ سکتے ہیں۔ امتحان صرف اتنا ہوتا ہے کہ باون میل کے پل صراط سے گزرنے کے بعد یہ بہشت نصیب ہوتی ہے۔ اس کا نام رحمت خداوندی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے کافر و سرکش بندے قیامت کے بعد ابدالآباد دوزخ میں رہیں تو دنیا میں بھی ان پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوا اور ہوٹلوں کے باراحت عیش سے

محروم کردے۔

کیسی بہار ہے۔ اونچے اونچے پہاڑ خبر نہیں کتنی مدت سے اپنے پروردگار کے سامنے پاؤں باندھے کھڑے ہیں۔ آنسوؤں کے چشمے سے وضو کرتے۔ اور حضوری قلب کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ خدا نے بھی ان کے دل کو آباد کیا ہے۔ جدھر دیکھو ہرے بھرے درخت لہلہا رہے ہیں۔ پرندے ٹہنیوں پر بیٹھے نغمہ سنجیاں کر رہے ہیں۔

آدمی بھی جب کرہ وقاری سے یکسو ہو کر خدا کے سامنے حاضر ہوتا ہے تو اس کے دل میں بھی یہ خنکی۔ یہ سرسبزی۔ یہ شادابی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کو انگریزی اصطلاح میں دل ہاؤس کی آرائش کہنا چاہیئے۔

اور وہاں اس پر بھی توجہ کی؟ پہاڑوں میں انسان کو نشیب و فراز کے راستوں سے کیسی تکلیف ہوتی ہے۔ جب بلندی پر چڑھتا ہے سانس پھول جاتا ہے۔ ہانپتا ہے۔ لڑکھڑاتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ اب کتنا راستہ باقی رہ گیا اور جس وقت بلندی سے پستی کی طرف آتا ہے۔ اس وقت بھی یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں زور و تیز رفتاری میں آس پاس کے کسی کھڈ یا غار میں نہ گر پڑوں۔

ڈاکٹروں کی رائے میں پہاڑوں پر ترقی صحت کا یہی راز ہے۔ جو لوگ نشیب و فراز کی مشکلات میں شریک نہیں ہوتے گھر میں آرام سے بیٹھے رہتے۔ یا سواری پر چلتے پھرتے ہیں۔ ان کی صحت ہمیشہ خراب رہتی ہے۔ اسی طرح دل ہاؤس کے معماروں کا خیال ہے کہ نفی اثبات کے نشیب و فراز میں چڑھنا اترنا صحت باطن کے لئے لازمی ہے۔ اس کی تکلیفات کا خیال کر کے جو لوگ گھبراتے ہیں۔ ہمیشہ روحانی امراض میں مبتلا رہتے ہیں۔

چڑھو لا الٰہ کی بلندی پر اور اترو الا اللہ کی وادی میں۔ دل ہاؤس کی

تعمیر کے لئے موسم رمضان خوب زمانہ ہے۔ جذبات یکسو۔ ارادے پاکیزہ۔ نفسانیت کی سرد بازاریاں۔ ان دنوں میں تم بھی اپنا دل ہاؤس بنا لو۔ پھر خبر نہیں کل کیا پیش آنے والا ہے۔

دل ہاؤس کا فرنیچر روزہ نماز اور ذکر الٰہی ہے۔ گورنمنٹ ہاؤس کے لئے میز کرسی چاہیئے۔ دل ہاؤس کے لئے ایک سجدہ با اخلاص اور حمد کا ایک سچا جملہ درکار ہے۔ روزے سب رکھتے ہیں۔ مگر جسم کی زبان بھوکی پیاسی رہتی ہے۔ اور نفس کی زبان کھانے پینے سے باز نہیں آتی۔ ایسا روزہ کس کام کا۔ دل ہاؤس کی آرائش چاہتے ہو تو نفس اور ہوس کی زبان بند کرو۔ اس کو روزہ رکھواؤ۔ مسجدیں خوب آباد ہیں۔ نمازیوں کی صفیں بھی بُنْیَانٌ مَّرْصُوصٌ کی جگہ کوہ ہمالیہ کی صفوں کی شکل ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں اکثر لوگ میز۔ کرسی۔ کالر۔ ٹائی۔ بوٹ۔ سوٹ۔ چھری کانٹا۔ نوکری۔ خدمت گاری۔ غلامی و اطاعت شعاری۔ ممبری اور مجسٹریٹی۔ خان بہادری اور شمس العلمائی کے نشہ میں چور ہو کر اس وعید کے مستحق ہوتے ہیں۔ جو لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى کے پردہ میں مخفی ہے۔ پروردگار نہیں چاہتا کہ اس کے بندے غیریت کے نشہ سے مخمور ہو کر حضوری میں آئیں اس واسطے ارشاد فرماتا ہے کہ ایسی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ یعنی میرے سامنے نہ آؤ۔ جب کہ تم نشے میں مدہوش ہو۔ سرکش انسان نے سمجھ لیا کہ نشہ نماز سے جھٹکارے کا نام ہے۔ کیونکہ خدا کہتا ہے کہ مخموری میں نماز کے قریب بھی مت جاؤ۔ کاش وہ ارشاد ربانی کے ناز محبوبیت تک رسائی پا سکتے۔ اور معلوم کرتے کہ نماز محبوب کی نزدیکی کا نام ہے۔ غیریت کا نشہ ہٹیں گے تو ہجر و فراق میں پھینک دئے جائیں گے۔ پس اگر دل ہاؤس کی بنا کو مستحکم کرنا اور اس کی آرائش و زیبائش کو مکمل دیکھنا چاہتے ہو تو رمضان شریف میں ایسی ترشی سے روزہ افطار کرو جو غیریت کے تمام نشے اتار دے اور تمہارے دل کو خدا کا گھر

بنا دے ورنہ جناب اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر تم پر صادق آئے گا۔

خدا کا گھر نہ رہا دل کو بنگلوں میں مکیں ہو کر
بھلایا عرش کو اس قوم نے کرسی نشیں ہو کر

راز (نظام المشائخ اکتوبر ۱۹۱۲ء)

معدوم و نابود چیز کو صفر کہتے ہیں۔ نقطہ بھی اسی شکل کا نام ہے۔ حساب اور اقلیدس و ہندسی رموز دانوں کی خبر نہیں کہ وہ اس مجلط بے سر و پا ہستی کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں۔ فقیر کو علم و فضل کی باتیں یاد نہیں۔ اس کو تو یہ بے تعلق و تعلق دار نکات سے لبریز نظر آتا ہے۔

کسی نے حرف بے سے کہا تجھ میں اور تے ثے میں کیا فرق ہے؟ صورت تینوں کی یکساں ہے۔ تفاوت فقط اس کا ہے کہ بے کے نیچے ایک نقطہ اور تے کے اوپر دو نقطے۔ ثے پر تین نقطے۔ بے نے جواب دیا۔ یہی سوال میں نے الف سے کیا تھا کہ جب تو اکیلا تھا تو تیرا مطلب بھی ایک نکلتا تھا۔ لیکن جس وقت تیرے پہلو میں ایک نقطہ بڑھایا گیا تو معانی دس گنے ہو گئے۔ دوسرا نقطہ اور زائد کیا تو ایک سے سو ہو گئے۔ تیسرا بڑھا تو ہزار بن گئے۔ یہ کیا بھید ہے۔

الف نے جواب دیا۔ خاموش۔ کائنات کی پیدائش کا راز اسی کے اندر مضمر ہے۔ آہنی گورنمنٹ نے لارڈ کرزن کی سرکار سے پہلے اس راز کو قانون رازداری کی مہر سے مخفی کر دیا ہے۔ زبان سے افشا کا ایک حرف بھی نکلا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے

حروف کی باتیں سن کر حسن نظامی نے کہا۔ میں نے لارڈ کرزن کے قانون

رازداری کو ہمیشہ بام سے نیچے گرتے دیکھا۔ اس کی تشبیہ یزدانی قانون سے ناجائز ہے مادہ پرست آدمیوں کے قوانین دو چار دن کے مہمان ہیں۔ اقبال کی آنکھ دیکھتی ہے۔ مگر وہ لب پر نہیں لا سکتے۔ میری آنکھ دیکھتی ہے زبان بولتی ہے۔ اور ہاتھ حرکت کرنے کو تیار ہے۔

سنو میں تم سے کہوں۔ یہ صفر جس کو عنوان میں دیکھا۔ ایک ہولناک انقلاب کا علم دار ہے بسم اللہ اس کتاب کی ابتدا ہے اور حروف و الفاظ کی سب کتابوں سے افضل ہے۔ لیکن اس بسم اللہ کی بھی ایک ابتدا ہے۔ اور وہ بے کا نقطہ ہے۔ اس نقطہ کی تشریح آج کے دن مقصود ہے۔ جس دن تم اس کو پڑھو گے عید الفطر کو سات آٹھ دن گزر چکے ہوں گے۔ خوشی کمال زوال میں ہو گا۔ لہٰذا اس مشکل اور باریک مضمون کو ذرا غور سے پڑھنا۔

اللہ ہمارا معبود اس کے لفظ میں کوئی نقطہ نہیں۔ محمدؐ ہمارے رسول۔ ان کے اسم میں بھی نقطہ معدوم۔ آخری نجات اور عروج جس ذات پر منحصر ہے۔ وہ امام ہے وہ بھی بے نقطہ۔

دل کہتا ہے تم میرے مقصود کے مفہوم تک اتنے کم لفظوں میں نہیں پہنچ سکتے ہو گے کیا۔ لکھا ہم نہیں سمجھے۔ دماغ میں کچھ خرابی تو نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف سب سے آسان کتاب ہے۔ مگر اس کے شروع میں الف لام۔ میم کو عام فہم کیوں نہ ہونے دیا۔ بس انسان کی طاقت اتنی ہی ہے کہ دور سے اشارہ کر دے یہ تو ہوا خاص فہم حصہ۔ اب عام دلچسپی کی باتیں سنئے ع

بے کارم و با کارم چوں مد بحساب اندر

حساب کی رقموں میں مہمان مد کی ہستی بیکار بھی ہے۔ اور با کار بھی۔ تاہم یہ پہلے کہ اصل رقم سے اس کے وجود کو کچھ سروکار نہیں۔ ایک دن ایک مرید نے حسن نظامی

کے ہاتھ پاؤں کو چوما۔ اور سمجھا کہ میں نے حسن نظامی کے متبرک جسم سے برکت حاصل
کرلی۔ لیکن جسم میں برکت کہاں وہ تو حساب کی رقموں کا مد ہے۔ ذات اور روح
کے لین دین کا حساب کتاب ہو۔ اور جسم کمبخت کی صفت میں کھینچا تانی کی جائے۔ بیٹھے
اپنے ہاتھ کو دیکھتا ہوں کہ وہ دماغ کے کہنے سے کاغذ پر کچھ لکھا کرتا ہے۔ دنیا کی خلقت
ہاتھ و دماغ کے عمل کو کتاب و اخبار میں پڑھ کر حسن نظامی کو اس کا ذمہ دار تصور کر لیتی ہے۔ اور یہ
نہیں جانتی کہ مد کو حساب کتاب سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ صفر اور نقطہ کا بھی یہی عالم ہے کہ سب کچھ ہے اور کچھ نہیں۔

قربان اس دائرۂ حقیقت کے۔ کیا کیا تماشے پردۂ کائنات پر برپا کئے ہیں
اعلیٰ سے اعلیٰ مخلوق آفتاب اور ادنیٰ سے ادنیٰ ہستی ذرے کو دیکھئے۔ یہ بھی حساب
کے مد اور صفر و نقطے کی طرح بے کار بھی ہیں۔ اور باکار بھی۔ آفتاب گرم ذرات کا
مجموعہ زمین کے سب کارخانوں میں دخیل ہے۔ اس لئے باکار ہے۔ لیکن رات کو
جب یہ غروب ہو جاتا ہے تو دنیا کے کارخانے بند نہیں ہو جاتے۔ اس واسطے بیکار
ہے۔ ذرہ عالم مرکب کا انتہائی اور آخری نقطہ ہے۔ اس کی جنس نہ ہو تو ساری کائنات
بے کار ہے۔ لہٰذا اس کا وجود باکار۔ مگر ایک ذرے کا ہونا نہ ہونا کوئی چیز نہیں پھر
اس کے ناکارہ ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ اسی پر نقطہ اور صفر کو قیاس کرو۔
عنوان میں اس کی صورت دیکھ کر کوئی مطلب سمجھ میں نہ آئے گا۔ اور بے کار چیز معلوم
ہوگی لیکن جس وقت جسمی تعلقات کو یکسو کر کے اس کے حقایق و معارف پر غور کرو گے
تو یہی ننھی منی چیز محیط الکل نظر آئے گی۔

نظام المشائخ کے مضامین اور حلقہ کی تمام تحریروں کے شروع میں بسم اللہ کے
نیچے دو لکیریں لکھی جاتی ہیں۔ خیال ہوتا ہوگا کہ یہ ایک بے کار فعل ہے۔ پر جو اس بھید
سے واقف ہیں وہ ان کو باکار اور میکسم گن سے زیادہ کارگر پاتے ہیں۔ جس تحریر پر یہ
نشان ہوگا۔ خدا نے چاہا تو وہ کبھی بے اثر نہ رہے گی۔ یہ دو لکیریں نہیں ہیں تاثیر تحریر

کے توے کے لئے ایک قوت دار معجون ہے۔

نقطہ اور صفر بھی ان ربانی اسرار و معارف سے لبریز ہے۔ اگر تم اس کی روحانی
اور فلسفیانہ باریکیوں پر غور نہیں کر سکتے تو ایک کاغذ پر نقطہ کی گول شکل بناؤ اور
تنہائی میں اس پر نگاہ جماؤ۔ اور اپنے خیالات کو نقطے کے چاروں طرف پھیلا دو۔ پھر
دیکھو کیا لطف اور مزہ آتا ہے۔ بشرطیکہ چند روز تک اس کی مسلسل مشق کرتے رہو۔

اس مضمون کی سرخی پر نظر جماؤ۔ اور سوچو۔ یہی سب کا مرکز اور محیط ہے۔ ہر دکھ
غم اس کے اندر فنا ہو رہا ہے۔ اٹلی کی فوجیں۔ روس کے لشکر اس غار جہنم میں گر رہے
ہیں۔ اب اس کو گردش ہوگی تو گردو پیش کے تمام مستحکم قصر متحرک ہوں گے۔ اوہام۔
خوف۔ رعب کو شکست ہوگی۔

موسیٰ نے درخت اور پہاڑ کی آڑ میں دیدار دیکھا تھا مسلم دیدار دیکھنا چاہتا
ہے تو نقطہ اور صفر کو سامنے لائے۔ جو کرۂ خاک کی خیالی پیکر ہے۔ جو قلب جسمانی کی
تصویر ہے۔ جو ازل و ابد کے درمیان بے تار کا محکمہ پیام رسانی ہے۔

بندوق کی گولی نقطہ اور صفر کی شکل سے مشابہ ہے۔ مگر گولی پیام مرگ
ہے۔ اور نقطہ و صفر رشتہ زندگانی۔ زندگی کو پُر لطف بناؤ۔ اور اس معجون کا
برتاؤ کرو۔

آنکھ کی پتلی۔ خال رُخ یار۔ اور ان تمام صورتوں کی قسم جو نقطہ و صفر کی
ہم شکل یا قریب الشکل ہیں۔ نقطہ کے وجود میں نکات کا خاموش دریا موج میں
آنا چاہتا ہے۔ جب یہ لہر آئے گی تو میں تم کو عید کی مبارکباد دوں گا۔

یا

عرفان کی للکیر

(از نظام المشائخ دسمبر ۱۹۱۲ء)

یاعباد الصالحین آج کل دنیا کہتی ہے میں پریشان ہوں۔ آشفتہ خاطر ہوں۔ زندگی سے بیزار ہوں۔ میرا چین آرام جاتا رہا۔ مصائب و آلام نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ کیونکہ جدھر نگاہ جاتی ہے۔ خود غرضی۔ حرص و ہوس کا دور نظر آتا ہے اخلاق و مروت کا نام نہیں۔ رحم و انصاف مفقود ہو گئے۔ ایک قوم دوسری قوم کو ایک ملک دوسرے ملک کو۔ ایک شہر دوسرے شہر کو ایک کنبہ دوسرے کنبہ کو یہاں تک کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کو نہیں دیکھ سکتا۔ سب آپس میں ایک دوسرے کے درپئے آزار ہیں۔ طاقتور کا خیال ہے کہ کمزور کو اس زمین پر رہنے کا کوئی حق نہیں اسے مٹادو۔ فنا کردو۔ ناتواں چاہتا ہے اوروں کی توانائی بھی جاتی رہے۔ سارا عالم یکساں ہو جائے۔ فقیر نے سوچا۔ کیا یہ شکایت ٹھیک ہے۔ دل نے جواب دیا۔ کچھ صحیح اور کچھ غلط۔ اللہ تعالیٰ نے انسان اور اس جہان کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ وہ پہلے اپنی ہستی پر غور کرے۔ اور وجہ پیدائش کو پہچانے۔ مگر بھول چوک کا پتلا آدم زاد دوسروں کو دیکھنے لگا۔ ان کے نیک و بد میں مصروف ہو گیا۔ اور اپنی اپنی ذات کو پس پشت ڈال دیا۔ کیا آپ نے نہیں سنا۔ یورپ کی طاقتیں

ایران و مراکو۔ طرابلس و ترکی پر حملہ آور ہوئی ہیں کہ ان ملکوں کی تہذیب کو بزور تلوار درست کریں۔ مگر خود اپنی ذاتی اصلاح و اندرونی خرابیوں کی درستی کی طرف سے ان کی آنکھیں بند ہیں۔ اور یہی وجہ تکلیفات و صعوبات کے بڑھنے کی ہے۔ اگر ہر آدمی پہلے اپنی ذاتی اصلاح و بہبودی کی طرف متوجہ ہو تو خدا کی بنائی ہوئی زمین فتنہ و فساد اور غم و آلام سے چھٹکارا پا جائے۔ انسان خدا کی حکمتوں کا ایک خزانہ ہے۔ کون انسان؟ وہ جو کوٹ پتلون پہنتا ہے۔ کالر نکٹائی لگاتا ہے۔ پاؤں کو بوٹ سے آراستہ کرتا ہے۔ اور چرٹ منہ میں دبا کر نیم فرعونی شان سے اکڑتا ہوا چلتا ہے۔ اور وہ جو ٹخنوں سے اونچا پاجامہ۔ بوسیدہ میلا کرتہ پہنا منڈے ہوئے سر پر ڈھائی گز کا دوپٹہ لپیٹ لیتا ہے۔ اور وہ جس کی ٹانگیں گھٹنوں تک ہوتی ہے برہنہ نظر آتی ہیں۔ اور ہاتھ کے بنائے ہوئے معبودوں کے آگے سر جھکاتا ہے۔ یہ سب زمین پر حرکت کرنے والی مورتیں خزانۂ الہی کی تھیلیاں ہیں۔ ان سب کے اندر دولت لازوال بھری ہوئی ہے۔ لیکن غافل ہستیاں اسکی قدر نہیں کرتیں۔ اور نفسانی و شیطانی خواہشوں پر خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو برباد کر رہی ہیں۔ ان بادشاہوں سے پوچھو جب تم لاکھ آدمیوں کا لشکر لے کر اپنے دشمن پر حملہ کرتے ہو۔ اور بے شمار جانوں کا نقصان کر کے صرف اپنی ناموری کی تے ہو تو وہ ناموری تمہارے کس کام آتی ہے۔ جاڑے کا گرم لحاف اچھا یا تمہاری یہ ناموری۔ اگر سردی کے وقت لحاف اور کمبل میسر نہ آئے تو یہ ناموری تمہارے جسم کو سردی سے بچا سکتی ہے؟ مگر بادشاہوں سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے ختم اللہ علےٰ قلوبھم وعلےٰ سمعھم وعلےٰ ابصارھم غشاوۃ۔ وہ اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ ان کے خیال میں زندگی اسی کا نام ہے کہ ایک انسان اپنی فانی عزت و شان کے لئے لاکھوں انسانوں کو قربان کردے اور ان قیمتی وجودوں کو

موت کے گھاٹ اُتار دے جن کو برسوں کی شفقت کے بعد ماںتا بھری گود نے پالا پوسا تھا۔

دایاں ہاتھ ان خیالات کو قلمبند کر رہا تھا کہ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے نے کچھ اشارہ کیا۔ اس نے کہا مجھ میں کیا لکھا ہے؟ اس کو پڑھو۔ میں زبانی دستاویز کی شہادت ہوں۔ خدا نے فرمایا تھا۔ قیامت کے دن آدمیوں کے ہاتھ پاؤں سے گواہی لوں گا۔ اور وہ انسان کے اعمال کی شہادت دیں گے۔ قیامت تو دور ہے۔ اس کا نمونہ زمین کے اس دور پُرآشوب میں جو درحقیقت محشری زمانہ ہے۔ اعضائے جسم گواہی کے لئے طلب کئے جا رہے ہیں۔ ایک وقت تھا جبکہ دستاویز کی تکمیل مہر اور دستخط سے ہوتی تھی۔ اب قیامت قریب آگئی۔ مہروں اور دستخطوں میں جعلسازیاں ہونے لگیں۔ اس واسطے خدا نے ایک نیا ذریعہ تکمیل صداقت کا پیدا کیا۔ اور وہ انگوٹھے کا نشان ہے۔ تمام معاملات جن کا علدرآمد تحریر میں آتا ہے انگوٹھے کے نشان سے مکمل کئے جاتے ہیں۔ دائیں ہاتھ کے فخر کو قرن گزر گئے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ جو کچھ ہوں میں ہوں۔ میرے بل پر سب کام ہوتے ہیں۔ خدا کو انانیت کسی کی نہیں بھاتی۔ آج دایاں ہاتھ بیکار ہے اور بائیں ہاتھ کے کرتب کا سارے جہاں میں دور دورہ۔ اس میں نصیحت ہے ان لوگوں کے لئے جو غرور و تکبر و خود پرستی کے متوالے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہماری لن ترانیاں ہمیشہ برقرار رہیں گی۔ دوام اور ہمیشگی صرف خدا کی ذات ہے۔ باقی ہر ایک کے لئے انقلاب و زوال ہے۔

اللہ کے بندو! اپنے جسم پر غور کرو۔ تمہارے رونگ رونگ میں اسرار ربانی کے نوشتے ہیں۔ تمہارا بال بال یزدانی رموز میں بندھا ہوا ہے۔ انگوٹھے کی لکیریں جس طرح تمہارے معاملات دنیادی میں کام آتی ہیں۔ اسی طرح ان سے

عرفان الٰہی کا کام نکالو۔ لین دین کے کاغذات پر انگوٹھے کا نشان کرتے وقت ذرا یہ بھی سوچ لیا کرو کہ تم کس انگشت حقیقت کا نشان ہو۔ کھانے۔ پینے۔ لڑنے جھگڑنے خودبینی خودستائی کے لئے تم کو نہیں پیدا کیا گیا۔ پروردگار کو تمہاری پیدائش سے اپنی طاعت و عبادت مقصود ہے۔ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون کا ارشاد اس کا شاہد ہے۔ کائنات کی دستاویز قلم تکوین سے جب لکھی گئی تو کن کہنے والے نے مخلوقات کے کاغذ پر ایک انگوٹھے کا نشان لگایا تاکہ سند ہو اور وقت ضرورت کام آئے۔ وہ سند کیا ہے اور وہ ضرورت کیا ہے۔ اور وہ انگوٹھے کا نشان کس سے مراد ہے۔ نشان انگشت وجود انسانی ہے۔ سند خلافت رحمانی ہے۔ ضرورت موت کے بعد وہ گھڑی جو سب کو پیش آنی ہے۔ ذالک الکتب لاریب فیہ صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ کائنات کے باطنی و اندرونی انتظام کے لئے پروردگار کی جانب سے ایک شخص مقرر ہوتا ہے۔ جس کے عہدے کا نام قطب عالم یا قطب مدار ہے۔ قطب عالم کے دائیں بائیں دو وزیر ہوتے ہیں۔ دست راست کے وزیر کا نام عبدالملک اور دست چپ کے وزیر کا عبدالرب۔ عبدالملک کا یہ کام ہے کہ خدا پرستوں کے معاملات کو قطب عالم کے حضور میں پیش کرے۔ اور عبدالرب ان لوگوں کی مہمات بارگاہ قطب عالم میں پیش کرتا ہے۔ جو دائرۂ توحید خدا پرستی سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

اس زمانے میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ دشمنانِ توحید تمام دنیا پر چھائے چلے جاتے ہیں۔ اور خدا پرست ہر جگہ مغلوب ہو رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالٰے نے دست چپ کے وزیر کے لئے اپنی نعمتوں کا دروازہ کھول دیا ہے۔ مگر صفات الٰہی کی مختلف شانیں ہیں۔ آج ہمارے شامت اعمال کے سبب صفت قہاری کا ظہور ہے۔ اور قطب عالم کے وزیر دست چپ برسرحکمرانی ہیں۔

جس کی وجہ سے دنیاوی دستاویزوں پر انگوٹھے کا نشان بھی بائیں ہاتھ کا لگایا جاتا ہے۔ تو کل ہماری قربانیں قبول ہوں گی۔ صفت رحمت فرمائے گی۔ اور وزیر عبدالملک برسرِ حکومت ہوں گے۔ اس کو انگریزی پارلیمنٹ کی دو شاخوں لبرل اور کنسرویٹو کے تحت میں نہ لایئے۔

ربانی حکومت جمہوریت سے اسی قدر تعلق رکھتی ہے کہ کبھی شانِ قہر کا دور ہے اور کبھی شانِ رحم کا دور لیکن قہر ایک کے لئے زہر ہوتا ہے۔ اور دوسرے کے لئے آبِ حیات۔ اس کی سرکار میں لبرل اور کنسرویٹو حکومتوں کی طرح پالیسیاں نہیں ہیں۔ اس کی حکومت کا مدار محکوموں کے اعمال پر ہے۔ جیسے اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ اسی قسم کی حکمرانی کی جاتی ہے۔ اس کے دربار میں دائیں ہاتھ کے نشان کی دستاویز مقبول ہے۔ وہ ارشاد فرماتا ہے فاما من اوتی کتبہ بیمینہ فسوف یحاسب حسابا یسیرا۔ جس کے پاس دائیں ہاتھ کی دستاویز اعمال ہے۔ اس کا محاسبہ آسان اور سہل ہوگا۔ یعنی جس طرح دنیاوی عدالتوں میں بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے نشان سے دستاویز قبول کی جاتی ہے۔ عدالت دین میں قبول نہیں کی جاتی اس کے ہاں دائیں ہاتھ کی دستاویز پیش کرنے سے نجات ہے۔ لہٰذا اے آدمیو! اگر تم خدا کو چاہتے ہو۔ اگر تم اس کی توحید کے قائل ہو تو دائیں ہاتھ کی دستاویز تیار کرو۔ دایاں ہاتھ تم سے اپنا حق مانگتا ہے۔ میدان جہاد میں تمہارے بہت سے بھائی قبضۂ شمشیر اور گھوڑۂ تفنگ سے دائیں ہاتھ کا حق ادا کر رہے ہیں۔ تم اس امن کے ملک میں جیب میں ہاتھ لے جاؤ۔ اور اس کا حق ادا کرو۔ تمہارے دائیں ہاتھ کی لکیر میں بھی اگر تم غور کرو اس عظیم الشان معاملہ کی تصدیق کرتی ہیں جو سب خدا پرستوں کو خوشی و خرمی کے ساتھ عنقریب پیش آنے والا ہے۔ لکیر عرفان کو پہچانو۔ تاکہ لکیر کے فقیر اور عارف حق کا رتبہ پاؤ۔

لال ٹین

(از رسالہ نظام المشائخ ۱۹۱۳ء)

"لال ٹین" ہاتھ میں رہنے والی روشنی کا نام ہے۔ شیشے کے اس قفس کو کہتے ہیں جس کے اندر شعاع آتشین قید ہے۔ ایک زمانہ تھا آندھیاں، پروانے اور چلنے پھرنے والوں کے دامن۔ چراغوں کے دشمن تھے۔ بھرے پُرے چراغ ہوا کے جھونکے سے گل ہو جاتے تھے۔ پروانے اپنی عاشقانہ پر اندازی سے اس غریب روشنی کی ہستی کو بے جان کر دیتے تھے۔ بے احتیاط دوپٹوں کے آنچل کبھی تو ایسا تھا کہ نورِ چراغ ان کے صدمے سے بجھ جاتا اور کبھی دوپٹہ خود چراغ بن جاتا تھا اور بے احتیاط اوڑھنے والے کو سزائے سوخت مل جاتی تھی۔

آج وہ وقت ہے کہ روشنی کو سب سے زیادہ ترقی اور امن و امان نصیب ہے کیا مجال جو آندھی آنکھ ملائے۔ پروانہ قریب آئے اور آنچل کا دامن حملہ آور ہو۔ روشنی اطمینان و بے فکری سے چمنی کے گنبد میں رات بھر پاؤں پھیلا کر سستاتی ہے۔

اس نئی روشنی کے زمانہ میں کائنات کی ہر چیز کا ظاہر روشن ہے مگر باطن تاریک بجلی کی روشنی کانچ کے ہنڈوں میں ظاہر ہو کر چمکتی ہے۔ اور تار کے باطن میں تاریک رہتی ہے گیس کی روشنی کا بھی یہی عالم ہے۔ مگر ہمیں اس سے کیا بحث۔ سیاہ باطن ہو یا سفید باطن۔ ہمیں تو یہ ہماری لال ٹین پیاری ہے۔ چلتا پھرتا نور ہے۔ اور اس زمانہ میں برکت وہیں ہے کہ جہاں حرکت ہو۔ ایک رات میں نے لال ٹین سے پوچھا کیوں بی "تم کو رات بھر کے جلنے سے کچھ تکلیف تو نہیں ہوتی؟" بولی۔ آپ کا خطاب کس سے ہے؟ بتی سے۔ تیل سے۔ ٹین کی ڈبیہ سے۔

کانچ کی چمنی سے، یا پیتل کے اس تار سے جس کو ہاتھ میں لیکر لال ٹین لٹکائے پھرتے ہیں؟

لال ٹین کے اس سوال سے دل پر ایک چوٹ لگی۔ یہ میری ایک بھول تھی اگر میں پہلے اپنے وجود کی لالٹین پر غور کر لیتا تو ٹین اور کانچ کے پنجرے سے یہ سوال نہ کرتا۔ میں حیران ہو گیا کہ اگر لال ٹین کے کسی ایک جزو کو لال ٹین کہوں تو یہ درست نہ ہوگا۔ اور اگر تمام اجزاء کو ملا کر لالٹین کہوں تب بھی موزوں نہ ٹھہرے گا کیونکہ لال ٹین کا دم روشنی سے ہے۔ روشنی نہ ہو تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ مگر دن کے وقت جب لال ٹین روشن نہیں ہوتی اس وقت بھی اس کا نام لال ٹین ہی ہوتا ہے تو پھر کس کو لال ٹین کہوں۔ جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو مجبوراً لال ٹین ہی سے پوچھا۔ میں خاکی انسان نہیں جانتا کہ تیرے کس جزو کو مخاطب کروں اور کس کو لال ٹین سمجھوں۔ یہ سنکر لال ٹین کی روشنی لرزی۔ ہلی۔ کپکپائی۔ گویا وہ میری ناشناسی و نادانی پر بے اختیار کھلکھلا کر ہنسی۔ اور کہا اے نورِ خدا کے چراغ آدم زاد سُن لال ٹین اس روشنی کا نام ہے جو بتی کے سر پر رات بھر اڑا چلا یا کرتی ہے۔ لال ٹین اس شعلے کو کہتے ہیں جس کی خوراک تیل ہے۔ اور جو تاریکی کے دشمن سے تمام شب لڑتی بھڑتی رہتی ہے۔ دن کے وقت اگرچہ یہ روشنی موجود نہیں ہوتی۔ لیکن کانچ اور ٹین کا پنجرا رات بھر اس کی ہمنشینی کے سبب لال ٹین کہلانے لگتا ہے تیرے اندر بھی ایک روشنی ہے اگر تو اس کی قدر جانے اور اس کو پہچانے تو سب لوگ تجھ کو روشنی کہنے لگیں گے خاک کا پتلہ کوئی نہ کہے۔ دیکھ خدا کے ولیوں کو جو رات بھر اپنے پروردگار کی نزدیکی و قربت کی خواہش میں کھڑے کھڑے گزار دیتے ہیں تو دن کے وقت ان کو نورِ خدا سے علیحدہ نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد ان کی قبروں کی بھی وہی شان رہتی ہے پہلے چمنی کو صاف کر یعنی اپنے لباس ظاہری کو گندگی و نجاست سے آلودہ نہ ہونے دے

اس کے بعد ڈبیہ میں صاف تیل بھر۔ یعنی حلال کی روزی کھا۔ اور پھر دوسرے کے گھر کے اُجالے کے لیئے اپنی ہستی کو جلا جلا کر مٹا دے۔ اس وقت تو بھی قندیلِ حقیقت اور فانوسِ ربانی بن جائے گا۔

بے تار کا تار

(از نظام المشائخ مئی ۱۹۱۳ء)

تم نہ کہتے تو میں بھی خاموش رہتا۔ بادہ فروش اور بادہ نوش کے ہاتھ میں اپنا بھید دیدیا۔ میں بھی دنیا پر تمہارے راز کو فاش کر دوں گا۔

پہلے تم نے یہ کیا کہ بجلی کے اسرار کو طشت از بام کیا۔ اس سے گاڑیاں کھنچوائیں پنکھے جھلوائے۔ سڑکیں کٹوائیں۔ ہرکارے کا کام لوایا۔ پھر بے سلسلہ و بے تعلق نشان بھی ان کے قبضے میں دیدیئے۔ بے تار کے تار کا علم بتا دیا۔ اور وہ بھی کس کو جو تمہاری شان میں گستاخ ہے۔ بے ادب ہے مغرور ہے چور ہے ڈاکو ہے دغا پیشہ اور جفا کار ہے۔ میں پوچھتا ہوں تم کو بندہ نوازی کا اتنا شوق کیوں ہو گیا ہے۔ اب دیکھنا اس راز کے زور سے یہ لوگ تمہارے پسندیدہ گھر پر چڑھ کر جائیں گے گولے گولیاں برسائیں گے۔ تمہارا کیا جائے گا تکلیف تو ہم کو ہوگی۔ جن کے دلوں میں اپنے گھر کی محبت بھر دی ہے۔

نادان و ناسمجھ بندہ بگڑتا ہے۔ ارے بے خبر تو کیا جانے پروردگار کی حکمت پروردگار ہی خوب جانتا ہے۔ علم و ہنر کے آم کا رس تو تجھ کو دیا ہے۔ چھلکے ان گستاخوں کو ملے۔ اس پر تیرا یہ کہنا سراسر بے بنیاد ہے۔ چور کو چوری کرنے کے اوزار دیئے ہیں تو اس کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ چوری کے بغیر بھی ہم تجھ کو رزق دے سکتے

ہیں یہ اوزار امتحان کے لئے ہیں۔ اگر تو نے چوری کے کام میں ان کو استعمال کیا
تو ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ اور اگر دوسروں کو آرام دینے کے کام میں لایا تو انعام
پائے گا۔ کردگار عالم جانتا ہے کہ گو مغربی دنیا گستاخ و ناسزائی ہے۔ مگر اس کو یہ
بھی علم ہے کہ انہیں میں بہت سے میرے دروازے پر سر جھکانے آنے والے ہیں۔
ایک وقت پر جرمن اسلام قبول کرے گا۔ انگلستان مسلمان ہو جائے گا۔ فرانس
میں بھی نور وحدت کی روشنی نمودار ہو گی۔ ابتدا کو دیکھ کر بے قرار نہ ہو۔ ازل
کے حالات سے مایوس نہ بن۔ انجام و ابد میں دیکھیو کیا ہوتا ہے کیا کیا جاتا ہے۔
آج دیا ہے کل لے لیا جائے گا۔ آج سرفراز کیا ہے۔ کل برباد کر دیا جائے گا۔
اگر زمانے اور گمراہی کی چال چلتے رہے۔ بے تار کا تار تم لوگوں کی دلیل بنایا
گیا ہے۔ اس کو دیکھو۔ سوچو۔ سمجھو۔ اور دشمن سے کہو۔ یہ ہی ہمارے مولےٰ کی
شان کا ظہور و نمونہ ہے ٭

مراقبہ میں کیا ہوتا ہے۔ مکاشفہ کسے کہتے ہیں۔ لاکھوں کوس کی خبر آن کی آن
میں دل کی لوح پر کس طرح نقش ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب بے تار کے تار میں ہے
چند اونچی اونچی لکڑیاں کھڑی کر دیں۔ برقی ذخیرہ کا خزانہ ان کھمبوں کو پہنا دیا۔ اس کے
بعد اشارے کنائے شروع کر دیئے۔ ایک لندن میں ہے ایک دہلی میں۔ دونوں کو آواز
آنے لگی۔ لیکن کس کو؟ اسکو جو تار کے بھید سے واقف ہے۔ ہر ایک کو نہیں
خواہ ہزاروں آدمی تار کی بلی سے لگے بیٹھے رہیں جیسے مراقبہ کرنے والے
کے پاس بیٹھنے والے بے خبر رہتے ہیں ٭

مگر یاد رکھ بے تار کی خبر راستہ میں گرفتار بھی ہو جاتی ہے یعنی جیسے بجلی کے
کندھے پر سوار جا رہی ہو اور راستہ میں کوئی اور کھمبا مل جائے تو وہاں کے رہنے
والے خبر کے بھید کو پکڑ سکتے ہیں بس اس میں بھی انسان کو عاجز رکھا گیا ہے اور وہ

پوری اور کامل قدرت نہیں دی جو مراقبہ کرنے والے کو عطا ہوئی ہے مراقبہ کرنے
والے کا کشف کوئی گرفتار نہیں کر سکتا تو پھر تو خدا کی ان مکمل طاقتوں کو بھی سیکھ
اور ان کو حاصل کر کے دشمنوں کی ان چھچھوری ناقص قوتوں کو حاصل کر لے ٭

میں تو تیرا ہوں۔ ذرا آگے تو بڑھ سب کچھ دوں گا۔ ہاتھ پاؤں تو ہلا۔ سب
کچھ بخشوں گا۔ گھر میں میٹھا میٹھا کوستا ہے۔ تیوری چڑھاتا ہے۔ اور بھولے بچے
کی طرح ایڑیاں رگڑتا ہے۔ اس سے کیا فائدہ ٭

ہاں سچ ہے۔ حسن نظامی

سِل اُور دِق

کے

عارفانہ نکات

(از نظام المشائخ جون سنہ ۱۹۱۳ء)

سل اور دق وہ دو حرف کے دو لفظ یا دو نشتر ہیں جو انسان کی رگ حیات
کو چپکے ہی چپکے بے خبری میں زخمی کر کے اس کا کام تمام کر دیتے ہیں اولاد آدم گوری
ہو یا کالی۔ ان بیماریوں کے نام سے کانپتی ہے۔ لرزتی ہے۔ اور ڈھونڈتی ہے کہ
اپنی عقل اور علم کے زور سے ان موذی اور خطرناک بیماریوں کا علاج مل جائے ٭

انگریزوں کی شاہی خاندان میں یہ امراض موروثی ہو گئے ہیں۔ دولت سے
ڈاکٹروں نے مل جل کر مہینوں برسوں ان بے وجود مگر موجود۔ بود مگر نابود امراض
کی تحقیقات میں سر کھپایا۔ غیب کا بھید ہاتھ نہ آیا۔ کسی نے قہقہہ مار کر ہنسنا اس کا
علاج ہے کوئی بولا کھلی ہوا میں رہنا۔ فکر کو پاس نہ آنے دینا ان کی دوا ہے

کوئی اپنے سر کو پکڑ کر بیٹھ گیا اور کہا عقل کچھ کام نہیں دیتی۔ علم کی رسائی موت کی
ان ہولناک گتھیوں کے پردوں کی حقیقت تک نہیں ہو سکتی۔ گویا ان سب مادہ پرست
ہستیوں کو اقرار ہے کہ سل اور دق کے امراض کا دنیا میں کوئی علاج نہیں یعنی
شرطیہ اور حکمیہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ بعض باتوں میں یہ مادہ پرست لوگ
لن ترانی سے دعویٰ کیا کرتے ہیں ۔

خدا کی شان ہے۔ خدا کے وجود سے انکار کرنے والی عقلیں معمولی معمولی باتوں
میں کس طرح عاجز اور لاچار ہو جاتی ہیں۔ آؤ ذرا آج صوفیانہ نظر سے
ان پیارے پیارے چھوٹے چھوٹے لفظوں پر غور کریں ۔

سل اس بیماری کا نام ہے جو پھیپھڑے کو غموں کی چھری سے زخمی کر دیتی
ہے اور آدمی خون تھوکتے تھوکتے مر جاتا ہے۔ دق ایک خفیف اور باطنی حرارت
کو کہتے ہیں جو جسم کے خون کو جلا دیتی ہے۔ پھیپھڑہ اس کی ہلکی ہلکی آنچ سے جل کر کباب
ہو جاتا ہے۔ دونوں حالتوں میں مریض کا ظاہری چہرہ اندرونی اور باطنی سوختہ
کاری کو ظاہر نہیں ہونے دیتا جس طرح عشق کی آگ جب خانہ باطن میں بھڑکتی ہے
تو انسان کے اعضائے ظاہری پر اس کا ظہور بس اتنا ہوتا ہے کہ ہونٹ خشک
ہو جائیں۔ چہرہ زرد نظر آنے لگے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس ہوں آنکھیں آنسوؤں
سے لبریز ہیں۔ اسی طرح سل اور دق چہرے کو افسردہ اور فکرمند بنا دیتی ہے
مگر ہلاکت اور فنا کا بھید صفحۂ رخ پر ظاہر نہیں ہونے پاتا۔ سیاست شناس لوگ کہتے
ہیں چالبازوں کی حکومت سل اور دق کا مرض ہے۔ جو قوموں اور ملکوں کا اندر
ہی اندر کام تمام کر دیتی ہے ۔

ہم کہتے ہیں آدمی ان معمولی جسمانی بیماریوں سے تو اتنے پریشان اور آشفتہ خاطر
ہیں جن کا علاج اور جن کی تشخیص چنداں دشوار نہیں کبھی انھوں نے روحانی

سل اور دق پر بھی توجہ کی۔ جو روح کے جوہر زندگی کو اندر ہی اندر فنا کر دیتے
ہیں۔ اور وہ نفس کی حرص و ہوس ہے۔ حرص ایک سل ہے اور ہوس ایک دق ہے۔
جب یہ عارضے روح کو لاحق ہوتے ہیں تو انسان نفس اور شیطان کے القا
سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ حرص و ہوس درحقیقت انسانی ترقی اور حصول کمالات کیلئے
لازمی چیزیں ہیں۔ جو قومیں صابر اور قانع ہوتی ہیں۔ ان کو ترقی اور کمال میسر نہیں
آتا۔ ایک ہی جگہ ٹھٹھری کی ٹھٹھری رہ جاتی ہے۔ اور جب کوئی شخص بیماری کو بیماری
نہ سمجھے۔ بلکہ امراض کو زندگانی خیال کرے تو ظاہر ہے کہ وہ خود ہلاکت اور موت
کے گڑھے میں گرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے آخر زمانے
میں مکاریاں۔ دغابازیاں۔ عقلمندی اور ہنرشعاری سمجھی جائیں گی۔ وہ زمانہ آج کل
ہے۔ جو شخص دنیاوی امور اور فانی دولت کے حاصل کرنے میں غدارانہ جوڑ توڑ
کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کو بہت بڑا عاقل اور دانا مانا جاتا ہے۔
اور جو چالاکیوں اور فریب کاریوں کرنا جائز خیال کر کے صبر و قناعت سے خدا اور
رسول کے احکام کی پیروی اور تعمیل کرتا ہو وہ اعلیٰ درجہ کا بے وقوف۔ احمق۔ وحشی
بے تہذیب اور فلشمین کہلاتا ہے۔ مگر بے وقوفوں اور احمقوں کی روحیں جن کا اوپر
ذکر آیا ہمیشہ تندرست اور زندہ سلامت رہتی ہیں۔ اور عقلمندوں اور ہوشیاروں
کی ارواح سل اور دق کے مریضوں کی طرح افسردہ اور اداس اور بے چینی کی
زندگی بسر کرتی ہیں۔ ذرا سے صدمے اور دنیاوی پیچیدگی سے صبر و استقلال کا
دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور خودکشی کے سوا اتنے لمبے چوڑے آسمان و زمین
میں تسلی اور اطمینان کا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا ۔

پس جن لوگوں کی روحیں سل اور دق کے امراض میں مبتلا ہیں ان سے کیا توقع
ہو سکتی ہے کہ وہ جسم کی سل اور دق کا علاج معلوم کر سکیں۔ یہ حصہ ان لوگوں کا ہے

جن کی ارواح توکل ربانی سے حقیقی مضبوطی اور توانائی اور وہ قوت رکھتی ہیں جن کے آگے مادی سائنس اور فلسفہ کے مکاشفات کمالیہ ہیچ ہیں جس شخص کی روح کو اللہ تعالےٰ نے اپنے علوم مخفیہ کی بصیرت عنایت فرمائی ہے وہ جسمانی سل اور دق کے امراض کا علاج اچھی طرح جانتی ہے۔ اسکو مرض کی حقیقت اور اصلیت کا بھی بھید معلوم ہوتا ہے اور ان اسباب کا بھی علم ان کو دیا جاتا ہے جن سے جسم کے یہ عارضے دور ہو جائیں۔

سل اور دق پھیپھڑے سے تعلق رکھتے ہیں اور پھیپھڑے کی زندگی سانس پر منحصر ہے اور سانس فضائے عالم کی ہوا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیئے مادی فلسفیوں نے نتیجہ نکالا کہ دق اور سل کے مریضوں کے لیئے صاف ہوا ہونی چاہیئے تاکہ صاف سانس پھیپھڑے میں جائے اور اس کی کدورتیں دور ہو جائیں۔ لیکن جب پھیپھڑے میں زخم پڑ چکے ہوں تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ پھر صاف ہوا کچھ فائدہ نہیں پہونچا سکتی یعنی جب سل اور دق کا درجہ ابتدائی مقامات سے آگے بڑھ گیا ہو تو مرض لاعلاج ہو جاتا ہے یہاں لوگوں کی بڑی بھول ہے۔ تندرست روح کو بتایا گیا ہے کہ ہر مرض کا ایک علاج ہے ہر زہر کا ایک تریاق ہے۔ پھول کے ساتھ کانٹا۔ اندھیرے کے ساتھ روشنی ہے۔

کسی چیز کا عرفان اس کی ضد سے ہوتا ہے اور ہر چیز کی ایک ضد پیدا کی گئی ہے یہ کہنا کہ جب پھیپھڑہ زخمی ہو جائے اور زخموں کا گھراو بڑھ جائے تو پھر اندمال کسی صورت سے ممکن نہیں۔ ڈاکٹروں کی روحانی سل و دق کی مرضیں رائے ہے۔ اور بالکل غلط اور جھوٹ ہے۔

ایک دفعہ راقم فقیر بیمار رہا۔ کلکتے کے سب سے بڑے انگریز ڈاکٹر نے کہا پھیپھڑہ خراب ہو چکا۔ اب کوئی علاج فائدہ نہ دے گا۔ باطنی ڈاکٹر بولا۔ اور اپنے فکرمند مریض کو

سمجھایا کہ ڈاکٹر پر ایمان نہ لانا۔ پاس انفاس کا شغل کھلی ہوا میں جا کر کرو۔ سارا پھیپھڑہ گل بھی گیا ہو گا تو اچھا ہو جائے گا۔ میں نے اس پر عمل کیا اور آج پانچ برس سے زندہ سلامت ہوں۔

عزیزم ملا محمد الواحدی اڈیٹر نظام المشائخ کو آج کل کسی ایسے ہی ڈاکٹر نے کہدیا ہے کہ تم کو سل ہے جلدی علاج کرو ورنہ خیر نہیں۔ سنتا ہوں بشریت کے تقاضے سے واحدی ملا پر اس کا اثر ہوا۔ اور وہم کے نشتر نے اچھے بچے پھیپھڑے کو زخمی بنا دیا۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ سانس پر حیات جسم کا مدار ہے سانس ہی وہ چیز ہے جس سے زندگانی کی کامرانیاں تعلق رکھتی ہیں۔ سانس پر قابو پا جانا صحت روحانی و جسمانی کے لئے از حد مفید ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ذکر الٰہی سانس کے اندر جمائیں کھلی ہوا میں خوب چہل قدمی کریں۔ خدا کا ذکر ہمارے سب ظاہری باطنی جراحتوں کا مرہم ہے۔ سانس کے ذریعہ اس مرہم کے پھائے پھیپھڑے پر لگائے جائیں اور اطمینان کے لیئے دوا کا استعمال بھی ہو تو مضائقہ نہیں۔

سل اور دق کی اصل جڑ تفکرات خانگی ہیں عارف کو دنیا کے نشیب و فراز کے ترددات و تعیشات سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے اس دنیا کی خوشی و تکلیف سب عارضی ہے۔ لہٰذا ہر حال میں خوش اور ہشاش بشاش رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ بات حاصل نہ ہو گی۔ جب تک کہ خدا تعالےٰ کی ذات پر کامل بھروسہ اور اعتماد پیدا نہ ہو۔ جب توکل اور صبر و رضا کا مقام حاصل ہو جاتا ہے تو دنیا کی کوئی تکلیف اذیت نہیں دیتی اور جب مصائب میں ایذا کا احساس باقی نہ رہے تو ان کا اعضائے جسم پر یعنی دل۔ دماغ پھیپھڑہ وغیرہ پر کوئی نقصان رساں اثر نہیں پڑنے پاتا اور اگر بشری کمزوری سے اثر پڑ جائے تو بہت جلدی اس کی اصلاح

ہوجاتی ہے۔

سانس کا ذکر سینہ اور پھیپھڑے کے امراض کو بہت جلدی دور کر دیتا ہے۔ تم کو چاہیے۔ صبح نماز پڑھ کر سورج نکلنے سے پہلے کھلے میدان میں نکل جاؤ اور وہاں ایک مطمئن مقام پر بیٹھکر قابل برداشت وقفہ سے لمبا سانس اندر لیجا کر روکے رکھو اور آہستہ آہستہ باہر نکالو۔ اور اس سانس میں لفظ اللہ کو جماؤ یعنی جب سانس اندر جائے تو تمام سینہ اور شکم کو اس سے بھر دو اور خیال کرو کہ لفظ اللہ باطن کی ہر سمت چھایا ہوا ہے۔ اور جب باہر کا سانس لو تو ہو کہو اور آہستہ آہستہ سانس کو خارج کرو۔ اس طرح سل ودق کی تمام جسمانی و روحانی کثافتیں دور ہو جائیں گی والدعا۔

الکبریت ما الکبریت

(از نظام المشائخ اگست ۱۹۱۳ء)

جون ۱۹۱۳ء میں بمقام احمد آباد گجرات۔ راقم دردیش دیاسلائی کے ایک نئے کارخانہ کے افتتاح میں شریک کیا گیا تھا۔ جلسہ بہت شاندار اور عظیم تھا۔ پیر صاحب بغدادی اور کلکٹر احمد آباد صدارت کی کرسی پر بازدے باز ملائے خبر نہیں کس قسم کا قران پنے بیٹھے تھے۔ اڈریس بازی اور اسپیچ نوازی ہو رہی تھی۔ اس وقت میرے تخیل نے عرب وانگریز و گجرات کو مخاطب کر کے چند الفاظ جوڑ لیے۔ ناظرین دیکھیں یہ جوڑ توڑ کیسا ہے۔

(حسن نظامی)

الکبریت ما الکبریت وما ادراک ما الکبریت پیچز پچ پیچز۔ ہوٹل پوٹ پیچز۔ آر یو اسٹری۔ کیوں دیا اسٹری۔ تم نے شی کھبرکے دیا اسٹری

شول چھے۔

دیاسلائی کیسی دیا سلائی۔ تمہیں کیا خبر کہ دیاسلائی کیا ہوتی ہے وہ ایک تنکا ہے جو جلنے اور مرنے کو پیدا ہوا وہ جنگل کے ہرے بھرے درختوں کا لخت جگر ہے جو انسان کی خاطر ملیا میٹ ہونے گھر سے باہر نکلا۔ کٹ کر آیا۔ گرم چشمہ میں ابلا کھال کھنچی مشین کی قینچیوں نے پرت پرت کترے تنکے بنائے اور مسالہ میں غوطہ دیکر کبس بنائے جب یہ میاں تنکے دیاسلائی کہلائے۔

ناروے سوئیڈن جاپان کی دیاسلائی گوری ہندوستان کی کالی۔ مگر دونوں کالے گورے کے لقب سے آزاد۔ کبھی نہیں سُنا کہ کالے تنکے کو گورے تنکے نے کنیڈا اور ساؤتھ افریقہ کے گوروں کی طرح اپنے ملک میں آنے سے روکا ہو۔

یہ بیچارہ تو ہندو، مسلمان، عیسائی۔ موسائی۔ نیک و بد کا فرق بھی نہیں کرتا جس کے ہاتھ میں جاتا ہے۔ خدمت بجالاتا ہے۔ مندر۔ مسجد۔ گرجا میں اسی کے دم سے روشنی ہے۔ مسٹر کلکٹر اور پیر صاحب بغدادی کے سگریٹ یہی سُلگاتا ہے۔

آج اس کی مشین کھولی جاتی ہے۔ یہ اس کا یوم الست ہے سب تنکوں کی روحیں بتائیں ان کا عارف کون ہے۔ خدا کا اقرار تو وہ ازل کے دن بلی کہہ کر چکے۔ اب اپنے واقف اسرار کو سمجھیں۔

وہ کون ہیں؟ اس جلسے میں کوئی نہیں۔ بیچارے پیر بغدادی بھی کبریت کے رموز سے بے خبر ہیں۔ سگریٹ جلانے کے سوا کبھی اس غریب کو ہاتھ میں نہیں لیتے۔ مسٹر کلکٹر کو صدارت کی کرسی اور اسپیچ بازی سے فرصت نہیں مجمع عام میں بھی جس میں ہندو مسلمان پارسی، یہودی، عیسائی۔ گورے کالے

سب ہی موجود ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ دیا سلائی کی اصلی شان کیا ہے۔ وہ کیوں ایک ہی سجدہ میں مقبول ہو جاتا ہے۔ کہ کبس کے پہلو میں بچھی ہوئی خاکی جانماز پر سر جھکایا اور شعلۂ غیبی دوڑ کر آیا۔ غریب تنکا جل کر گر پڑا۔ اور بہتا گھر روشن ہو گیا ۔

یہ شعلہ کہاں سے آیا۔ کس نے بھجوایا۔ کوئی ہے جو بتائے۔ نہیں تو۔ کوئی ہے جو بتانے والے سے یہ بھید سُنے۔ مگر نہ کوئی بتانے والا ہے۔ نہ کوئی سننے والا ہے۔ آسمان اپنے اشاروں کو دل کے پردوں میں چھپا رہنے دے۔ ورنہ یہ شرمائیں گے۔ جو میری سی شکل و صورت لے کر آئے ہیں مگر تجلی کے حق سے محروم ہیں ۔

لوہے کی طریقت

(از طریقت جولائی ۱۹۱۶ء)

خاک کی مورت۔ مٹنے والی صورت اور زور کا یہ عالم کہ سمندر کی چھاتی پر مونگ دلنے کو تیار۔ بجلی و ہوا کے سر پر سوار جنات و حیوانوں کی تو کیا مجال کہ اس سے آنکھ ملائیں۔ فرشتے اس کے آگے سر جھکاتے ہیں خدا کے سامنے اس کی طاقت کا لوہا مانتے ہیں ۔

ذرا دیکھنا۔ اس خاکی پتلے کو۔ زمین پر پاؤں نہیں دھرتا۔ لوہے کی نہریں بناتا ہے اور ان میں کاٹھ کی ناؤ چلاتا ہے۔ کاغذ کی شریعت پر لوہے کے قلم سے آہنی طریقت کی گلکاریاں دکھاتا ہے ۔

عشق کا انکس نہ ہوتا تو یہ مست ہاتھی خبر نہیں کیا خون خراب کرتا۔ کن کن

نیم جانوں کو پاؤں کے نیچے دلتا۔ خدا کی شان ہے محبت کی ننھی سی چیونٹی اس دیوانے ہاتھی کے اوسان باختہ کر دیتی ہے ۔

یہ موسم برسات خاک کے ہر ذرہ میں ایک جان پیدا کر دیتا ہے۔ آسمان سے جو بوند زمین پر آتی ہے۔ اپنے اندر ایک روح لاتی ہے۔ مگر آدمی کے لئے یہ زمانہ قیامت ہے وہ اپنے کلیجہ کو مسوستا ہے۔ اور بے قرار ہو کر آسمان کو دیکھتا ہے۔ اور کہتا ہے اے ابر تو آیا میرے پیارے کو نہ لایا۔ کبھی کہتا ہے برسات بھی۔ برسات نہیں۔ خیال کرنا۔ اس ایسے نوجوان کی حالت کا۔ جو بارش سے پہلے فلسفہ الہیات پر غور کر رہا تھا۔ اپنی غیر معمولی قوتوں پر اترا رہا تھا۔ اور کہتا تھا میں سمندر کو خشک کر سکتا ہوں۔ پہاڑ میرے ہنر سے خاک بن جاتے ہیں۔ میں ہوا کے اوپر اپنے بنائے ہوئے پروں سے پرواز کر سکتا ہوں۔ بجلی میری تابعدار ہے۔ بھاپ میری حکمرانی چلتی ہے۔ مجھ میں ہر بڑی طاقت کے مسخر کر لینے کا مادہ موجود ہے۔ میں اپنی کوشش سے آسمان کو زمین پر لا سکتا ہوں۔ اور زمین کو فلک پر پہنچا سکتا ہوں ۔

اور اب جوں ہی کالی گھٹا نمودار ہوئی۔ ہلکی ہلکی گرج کی آواز آئی اور بجلی نے بادلوں سے جھانکنا شروع کیا۔ جنگل کے مور جھاڑیوں سے نکل کر میدان میں آ گئے اور جھوم جھوم کر بولنے لگے۔ حضرت ابن آدم نیم وحشیوں کی طرح مجنونانہ حرکتیں کر رہے ہیں۔ کبھی داغ کا دیوان اٹھاتے ہیں۔ کبھی ٹھیٹھ کا کوئی گیت گنگناتے ہیں۔ سامنے چمن میں گلاب اور چنبیلی کی ٹہنیوں میں خیال جھولے ڈال رہے ہیں۔ اور یہ خیال نہیں کرتے کہ ان نازک اندا موں میں اتنی سہار نہیں ۔

سنتا دل سے کیا مزے کی باتیں ہو رہی ہیں ۔

وہ اس باغ میں کیونکر آئیں گے راستہ خراب ہے۔ فقط ایک بٹیا ہے۔ اس پر کیچڑ ہو گی۔ ان کا پاؤں نہ پھسل جائے۔ آس پاس گھاس ہے۔ کوئی جانور نہ نکل آئے۔ کالی چھتری پر بجلی نہ گر پڑے۔ وہ بہت ڈرپوک ہیں۔ بجلی کے ڈر سے آنا موقوف نہ کر دیں۔ رقیب کا گھر پکی سڑک کے پاس ہے۔ اس کے ہاں نہ ٹھہر جائیں۔ میں نے بڑی غلطی کی۔ باغ کا راستہ پہلے سے درست نہ کرا لیا۔ میں یہاں لوہے کی پٹری بچھوا دیتا۔ تاکہ۔ وہ آج کی رات اسپیشل ٹرین میں چلے آتے۔ موٹر خریدنے کا ارادہ ہی کر تار ہا آج ہوتی تو کام آتی ۔

کہتے ہیں ایسے موقع پر خدا کو پکارنا چاہیئے۔ وہ بھی کبھی نہ کبھی کام آجاتا ہے میں نے تو آج تک اُس کا احسان نہیں اٹھایا ہے۔ تو کیا اسی کو آواز دوں۔ مگر وہ بھی کیونکر آئے گا۔ اُس کے پاس ہوائی جہاز تھوڑی ہے ۔

اتنے میں بادل پھٹ گیا۔ سورج نکل آیا۔ تخیلات کا سیلاب اترنے لگا۔ جذبات کا طوفان تھمنے لگا۔ ہوش ٹھکانے آئے تو جنگل کی جھونپڑی میں رہنے والے شاہ صاحب کے پاس پہونچے۔ اور اپنی تازہ حالت کا استفسار کرنے لگے ۔

شاہ صاحب نے کہا بابا مٹی کی طریقت رکھنا اور عشق کا دم بھرنا عقلمندی نہیں۔ محبوب سنگدل ہے۔ اس کے لئے لوہے کی سڑک بناؤ۔ پیارا پارہ ہے تو آگ بھڑکاؤ۔ لکڑی کا قلم توڑ دو۔ لوہے کے قلم سے رشتہ جوڑو۔ یہ قلم ہر سنگی لوح میں نقش کندہ کر دیتا ہے ۔

میاں شریعت علم ہے۔ اور طریقت عمل۔ اور معرفت اس عمل کا نتیجہ۔ برسات کی ہوا نے عشق کو جگایا۔ اور۔ ایک طلب دل میں پیدا کی۔ یہ شریعت تھی

مطلوب کو حاصل کرنے کے لئے گھر سے نکل پڑتے۔ کڑک۔ چمک۔ کیچڑ پانی کی پروا نہ کرتے تو سالک طریقت کہلاتے در جاناں تک رسائی مل جاتی جس کے لئے ہاتھ ملتے ہو وہ ہاتھ آجاتی۔ تو مقام معرفت میں حق الیقین کا درجہ پاتے کتابوں کے کاغذ۔ طریقت کی کاغذی سڑکیں ہیں۔ ریل کی پٹریاں آہنی راستے ہیں ان کو دیکھو اور سمجھو ۔

انسانی ارادہ قلم دوات کی مدد سے حروف کی شکل میں کاغذ پر نمودار ہوتا ہے۔ اور پڑھنے والے سلوک کے لئے طریقت بنتا ہے۔ ریل کی پٹریاں زمین پر بچھ جاتی ہیں اور اپنے سینے پر رات دن گاڑیوں کی آریاں چلاتی ہیں۔ تب دور کی منزلیں قریب ہوتی ہیں اور فراق وصال کی شکل اختیار کرتا ہے ۔

بھائی یہ زمانہ لوہے کا زمانہ ہے۔ اگلے وقتوں میں زبان نصیحت کرتی تھی اَب توپ کا مُنہ لکچر دیتا ہے۔ سُنا نہیں ؎

شاہ جرمن نے کہا ہنسکر جناب پوپ سے
وعظ ہم بھی کہتے ہیں لیکن دہان توپ سے

توپ کا لفظ جلدی اثر کرتا ہے اور جلدی منزل مقصود تک پہونچ جاتا ہے خاکی طریقت کے مقابلہ میں آہنی طریقت یعنی سڑک سواریوں کو جلدی مقام مطلوب تک پہونچا دیتی ہے ۔

طریقت کا کوچہ بڑا سخت ہے۔ اس میں لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں آج کل کی آہنی ایجادیں ہم کو اشارہ کرتی ہیں۔ کہ ہم بھی اپنے دینی راستہ کو پختہ اور آہنی بنائیں۔ اور اپنے سلوک کی گاڑی جلدی اس دور ظلمات سے گزار کرلے جائیں ۔

مگر لوہے کی طریقت آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ بہت سی گرم بھٹیوں میں جلنا
کُٹنا پڑتا ہے۔ اس لوہے کی طریقت کے بھی درجے ہیں۔ جو باطنی طریقت کے
درجوں کو ثابت کرتے ہیں۔ پہلا درجہ فولادی ہے۔ اس کے اندر کوئلہ کی کثافت
نہیں ہوتی۔ یہ بہت نازک تن اور نازک آواز چیز ہے۔ ذرا سے صدمے سے
ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کو توڑو تو ننھے ننھے ذرے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دوسرے
درجے کا لوہا ظلماتی اثر زیادہ رکھتا ہے۔ اسکو توڑو تو لکڑی کے سے ریشے نکلتے
ہیں۔ تیسری قسم اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ قدرت نے ہر درجے کی ایک ذرگی
رکھی ہے جسمیں وہ مصروف رہتا ہے۔ پانی لوہے کا ملک الموت ہے۔ پانی
کے اندر اس کو ڈال دو اور کچھ دن کے بعد نکال کر ہوا میں رکھ دو۔ زنگ کی چادر
چھائی ہوئی ہوگی۔ یہ چادر اندر ہی اندر لوہے کے جسم میں گھسی چلی جاتی ہے۔ اور
آخر کار لوہے کو خاک کر دیتی ہے۔ یہی حال باطنی طریقت کا ہے۔ اس کے بھی
مختلف درجے اور حصے ہیں۔ مگر ہر دو حصہ کو خام خیالی اور بے اعتقادی کا پانی
فنا کر دیتا ہے۔ تم اگر پختہ ہوتے اور آہنی طریقت سے واقف ہوتے تو خدا تعالےٰ
کی نسبت ایسی بے سرو پا باتیں خیال میں نہ لاتے۔ جس نے تم کو اور تمہارے علم و
ہنر اور طاقت خیال کو پیدا کیا ہے۔

پتھر کی طریقت

(از طریقت، ستمبر ۱۹۱۳ء)

یہ رسالہ جس کا نام طریقت ہے۔ کیونکر چھپا۔ اس کا خیال بہت کم لوگوں کو ہوتا
ہے۔ ڈاک میں پیکٹ آیا۔ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ اور رائے زنی شروع ہوگئی۔ کاغذ

ذرا خراب ہے۔ چھپائی بھی چندی چندی آنکھوں سے دکھتی ہے لکھائی بھی
بہت خوبصورت نہیں۔

ہاں مضامین کی ترتیب اچھی ہے۔ جذبات عوام اور خواص کو یکساں ملحوظ رکھا
گیا ہے۔ یہ کہا اور پرچہ رکھ دیا۔ مگر کسی نے یہ نہ سوچا کہ کاغذوں پر یہ حروف
کس طرح نقش ہوئے۔ اور کن کن منزلوں کو طے کر کے ہم تک آئے اور ان کے اندر
کیا کیا معانی پوشیدہ ہیں۔

یہ غور کس کے حصے میں ہے۔ اُس کے جو پہلے خود اپنے وجود پر فکر کرنے
کا عادی ہو۔ جڑ سے پہلے کل۔ شاخ سے پہلے جڑ پر خیال لے جاتا ہو۔ وہ جب
رسالہ طریقت کو دیکھے گا تو کہے گا کہ اس کا آنا پتھر کی سڑک سے ہوا ہے۔

پہلے کاپی نویس نے لوگوں کے خیالات کو قلمبند کیا اور زرد رنگ کے کاغذ
پر لکھا۔ زرد رنگ اس لیے منتخب کیا کہ ہر چیز کی بنیاد عشق و محبت پر ہے اور زردی
شان الفت ہے۔ عشق عاشق کو زرد بنا دیتا ہے۔ لہٰذا ان حروف کو جو آخری
منزلوں میں اپنی شکل کے سینکڑوں ہزاروں حروف بننے والے تھے۔ زرد کاغذ
پر لکھا گیا۔

اس کے بعد پتھر کی طریقت کا سلوک درپیش ہوا پتھر کی طریقت یعنی چھاپہ
کا پتھر بلایا گیا۔ اور اس سے کہا گیا کہ ان حروف کو جو کاپی کے کاغذ پر شان یکتائی
میں ایک رنگ کثرت عنایت کر۔ پتھر نے کہا۔ تو بہ تو بہ میری کیا مجال ہے جو کسی کو
کچھ دوں یہ قدرت تو کسی اور ہی کے قبضہ میں ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تو میرے
سینے میں نقش غیر کندہ ہیں۔ جب تک یہ نہ مٹ جائیں کوئی سلوک کامیاب
نہیں ہو سکتا۔

یہ سنکر دست غیبی آگے بڑھا۔ وہ پتھروں کو سینے سے ملا کر رگڑنا شروع کیا یہاں

تک کہ تھوڑی دیر میں نقش غیر فنا ہو گئے۔

جب پتھر سے نقش غیر مٹ گیا تو کہا گیا کہ لے ان نئے حرفوں کو سینے میں جگہ دے۔ پتھر نے آہ سرد بھر کر کہا کہ ابھی ایک امتحان اور باقی ہے۔ امانت عشق کو سینے میں رکھنا آسان نہیں پہلے آتش شوق سے سینہ گرمالوں۔ مہمان کے قابل گھر بنالوں۔ تو لبیک کہہ کر خیر مقدم کو آگے بڑھوں۔

پتھر کو آگ سے سینکا گیا۔ سوز و ساز کا مزا چکھایا گیا۔ انگلیوں نے اس کے بدن کو چھو کر دیکھ لیا کہ ہاں نار ذوق اس کے اندر خوب سرایت کر چکی۔ تو کاپی کا کاغذ منگایا گیا اور پتھر کی چھاتی سے اسکو چمٹایا گیا۔ کاغذ گرمی کی تاب نہ لایا اور پتھر و حرف کے اسرار وصال میں شرکت کو نہ برداشت کر کے کہیں غائب ہو گیا۔ اب جو حرفوں نے آنکھ کھولی تو اپنے سوا کسی کو نہ پایا۔

باہر والوں نے علیحدہ کثافتوں کو صاف کیا۔ اور لوہے کے قلم لے کر حروف کی نوک پلک تراشنے بیٹھے۔ اس وقت دیکھا تو حرف الٹے نظر آئے۔ گھبرا کر پوچھا۔ تمہارا کیا حال ہے۔ حرف نے جواب دیا۔ جس کا باطن سیدھا ہے۔ اس کا ظاہر الٹا نظر آتا ہے بندہ اس کو نہیں سوچتا۔ اس واسطے تغیرات عالم سے گھبراتا ہے۔

تزکیہ ظاہری ہو چکا تو پتھر کو مشین کے اوپر رکھا گیا۔ اور اسپر سیاہی کا بیلن پھیرا گیا۔ اور اوپر ایک کاغذ ڈھک کر مخفی حجرے میں دکھیل دیا گیا۔ اور فوراً باہر بلا لیا گیا۔ دیکھا تو حروف کا دوسرا ہمشکل اوپر کے کاغذ پر موجود تھا۔

اسی طرح سینکڑوں ہم شکل بنتے چلے گئے۔ اور ان سے یہ رسالہ طریقت تیار ہوا گویا یہ طریقت پتھر کی طریقت ہے۔ منزل سنگ کو طے کر کے ہم تک آئی ہے۔ دیکھئے پتھر کی طریقت آیندہ زمانہ میں کیا گل کھلاتی ہے۔ ابھی تک تو اطمینان ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر اقبال کا بیان ہے کہ فقیر اور طریقت مآب لوگ پالیٹکس میں حصہ نہیں لیا کرتے

اگر یہ ڈپلومیسی کا اظہار نہیں ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ میں سنگسار زاں بنا رہوں۔

کھوپری کی صدا

(از رسالہ مرشد دہلی - ۵ مارچ سنہ ۱۹۱۶ء)

مسٹر آصف علی بیرسٹر دہلوی کے ملاقات خانہ میں طاق کے اندر ایک کھوپری رکھی ہے۔ اسپر شیشہ کا خوبصورت سرپوش ڈھکا ہوا ہے اور سنہری ہار اوپر پڑے ہوئے ہیں یہ بہت پرانی ہے، یورپ سے لائی گئی ہے۔ کسی رومی یا یونانی کی ہے۔

یہ فطرتی ظرف ہے اس مظروف کا جو امیدوں، خواہشوں اور اولوالعزمیوں کا طوفان خانہ تھا۔ مگر اب خالی کھنڈر ہے۔ اب ویران گنبد ہے۔ اس کی آبادیاں اجڑ گئیں اسکی سرمستیاں نابود ہو گئیں۔ اس کھوکھلے وجود میں اب خودی باقی نہیں رہی سوائے اس کے کہ ہم اپنی مستعار خودی کو اس کے اندر لے جائیں اور ذرا آزادی کے جوش کو اپنی آواز میں بھر کر زور سے بولنا شروع کریں۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ گنبد خاموش بھی صدائے بازگشت سے ہم کو جواب دے گا۔

اگر ہم نے ہستی کی مستی میں الحیات الحیات پکارا تو کھوپری بھی الحیات الحیات کہیگی مگر اس کی جوابیہ حیات میں اثر ممات ہوگا۔ ہمارا سوال غرتھم الحیات الدنیا کے ماتحت پیش کیا جائے گا، کھوپری کے جواب میں الیکم ترجعون کی کیفیت ہوگی۔

اور یہ سچ ہے کہ ما الحیات الدنیا الا متاع الغرور۔ جن کھوپریوں پر حکومتوں کے تاج ہیں وہ بھی مبتلائے حیات غرور ہیں، اور جن کھوپریوں پر غربت دبے کسی کا بوجھ رکھا ہوا ہے ان کو بھی (اپنی حیثیت کے بموجب) زیست چندروزہ کا غرور مطلوب ہے۔

تنازع بالبقاء کا مسئلہ فلسفیوں نے اسی نکتہ سے پیدا کیا ہے کہ کائنات کا ہر جزو اپنے بقاء و قرار کے لیے حرب و ضرب میں مصروف ہے۔ لیکن نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب متاع قلیل کے لیے یہ رزم کاریاں ہیں تو متاع کثیر جو حیات آخری اور زیست عقبیٰ ہے کیسی سخت جدوجہد کی طلب گار ہو گی۔ اس بقائے فانی کی خاطر کائنات گیر نزاع برپا ہے تو بقائے لافنا کے لیے تو سینکڑوں ہزاروں حصے زیادہ رزم کاری چاہیے۔

آج یہ کھوپڑی ہڈی کا تابوت ہے۔ کل اسکو ایک دل پر۔ دو آنکھوں پر۔ زبان پر۔ ہاتھوں پر۔ پیروں پر۔ ایک شاہانہ اقتدار حاصل تھا۔ اب وہ اقتدار فنا ہو گیا اور یہ پیکر پیام عبرت بن گئی اور اس نے کہا فلا تعجبك اموالهم ولا اولادهم انما يريد الله ليعذبهم بها في الحيوة الدنيا (پس تجھ کو ان کی دولت و اولاد سے متعجب نہ ہونا چاہیے کیونکہ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان چیزوں کے ساتھ حیات دنیا کے عذاب میں ان کو مبتلا کرے)۔

اس کھوپڑی والے کو بھی اچھا کھانے۔ اچھا پہننے۔ عیش کرنے۔ اکڑ کر زمین پر چلنے اور عزت والا بننے کی تمنا تھی، یہ بھی چاہتا تھا کہ حیات دنیا آرام سے گزر جائے اور عاقبت سے بے پروا تھا۔ اس کو بھی اسباب دنیا کے سوا زندگی کی کشمکش میں کسی دوسری بات کا خیال نہ آتا تھا۔ اس کے اندر بھی رات دن دنیاوی حریت و آزادی کی آندھیاں چلتی تھیں۔ اور آخرت کے سب چراغ گل کر دیئے گئے تھے آج اس کو معلوم ہو گیا کہ حیات دنیا تو پانی کا ایک بلبلا تھا جس کے اندر غرور کی ہوا زور کر رہی تھی، وہ ٹوٹ گیا تو کچھ بھی باقی نہ رہا۔

اَیْنَ الْمُلُوْکُ الْمَاضِیَۃُ۔ بَانُوْا قُصُوْرًا عَالِیَۃً۔ صَارُوْا عِظَامًا بَالِیَۃً۔

(کہاں ہیں گزرنے والے بادشاہ جنہوں نے اونچے اونچے محل بنائے تھے وہ تو بوسیدہ ہڈیاں ہو گئے)

"ا"
اَلِفْ خَالِیْ

(از رسالہ صوفی۔ دسمبر ۱۹۱۴ء)

حرفوں کی فوج کا کمانڈر سب کے آگے کیسا تنا ہوا سیدھا کھڑا ہے۔ اس کا نام الف ہے۔ اور بچے اس کو الف خالی پڑھتے ہیں۔

حرف جتنے ہیں سب اپنے اپنے حال میں مبتلا ہیں۔ ایک دوسرے کا کوئی شریک نہیں۔ الف کو بے سے غرض نہیں بے تے سے سروکار نہیں رکھتی تے جیم اور دال سے بے تعلق ہے۔ لیکن معانی کا مقابلہ پیش آتا ہے تو یہ سب حروف آپس میں مل جاتے ہیں۔ اور موقع موقع کی کمینگاہوں میں پرے جما کر نمودار ہوتے ہیں۔

حروف کا حال اور ہے اور قال اور۔ حال تو یہ ہے کہ ان کی شکل مفرد نظر آتی ہے اور قال میں ہر حرف کسی حروف کا مرکب ہے۔ مثلاً اس مضمون کے عنوان کو دیکھئے۔ سب سے اوپر ایک صورت "ا" کی ہے۔ اس کو دیکھو۔ اور زبان سے نہ پڑھو تو ذہن میں مفرد پیکر ہے۔ لیکن جب زبان سے پڑھو گے تو الف۔ لام۔ فے۔ تین حرفوں کی ترکیب سے ایک ذات مرکب معلوم ہو گی۔

ایک دن میں نے سپہ سالار افواج حروف سے دریافت کیا کہ "ہو آر یو" تم کون الف نے جواب دیا۔ "آئی ڈونٹ نو" میں نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔

میں نے کہا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تمہاری ایک شکل و صورت ہے۔ تم سے دنیا کی بول چال میں زندگی پیدا ہوتی ہے ہر حیوان ناطق تمہارا محتاج ہے۔ تم نہ ہوتے تو سارا جہان گونگا ہوتا۔

الف بولا۔ جناب عالی! آپ کو میرے وجود کی تحقیقات کا فکر ہے۔ اور میں دردِ عشق سے تڑپ رہا ہوں۔ اس بے کلی میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور بے اختیار یہی زبان سے نکلتا ہے۔ کہ میں آپ کے سوال کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مکتب کے ایک بچے نے پڑھا۔ الف خالی بے کے نیچے ایک نقطہ۔ مجکو تو یہ صدا معمولی معلوم ہوئی۔ مگر الف آہ کہہ کر بلبلا اٹھا۔

تعجب۔ حیرت۔ تو کیوں بے قرار ہو گیا۔ بے کے نقطے نے تجھ پر کیا اثر ڈالا۔

نہیں مجھے بے کے نقطے سے تکلیف نہیں ہوئی۔ مجھ کو اس کا ملال ہے کہ میں خالی ہوں۔ ہائے میں خالی نہ تھا۔ مگر اب خالی ہوں۔ میں اکیلا نہ تھا مگر اب تنہا ہوں۔ تم نے وصل کی لذت ہی نہیں چکھی تو فراق کی تلخی کیا سمجھو گے۔ میں وصال کی بہار دیکھ چکا ہوں۔ مجکو یہ زمانہ میسر آ چکا ہے۔

آہ اب خالی ہوں۔ بچے بھی خالی کہہ کر پکارتے ہیں۔ ہجر بڑی بلا ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم اس ہجر کی ہے جس میں آرزوئے وصل ہوتی ہے۔ اور دوسری وہ ہے جو وصل کے بعد پیش آتی ہے۔ یہ بہت سخت ہے۔ ناقابل برداشت ہے۔ پہلی قسم میں صرف شوق و اشتیاق ہوتا ہے۔ ارمانوں کے ولولے طوفان اٹھاتے ہیں۔ آنکھوں کو رلاتے ہیں۔ آنسو برساتے ہیں۔ دل میں تڑپ ہوتی ہے۔ امیدیں پھڑکتی ہیں۔ مگر یہ تکلیف نہیں ہوتی جو وصل کے بعد پیش آتی ہے۔ وصل کے بعد جو ہجر ہو۔ وہ گزشتہ ذوق شوق کو سامنے لاتا ہے۔ تخیلات و تصورات سے نقشے بنواتا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں چھریاں دیتا ہے اور دل و جگر پر چرکے دلواتا ہے۔

میں مدت مدید تک لطف یکتائی اٹھا چکا ہوں۔ میں اکیلا بن چکا ہوں دوسرا بن چکا ہے۔ جس کی یاد میں آج آگ کے بستر پر لوٹ رہا ہوں۔

الف! جی کو سنبھال تو اتنا کیوں بے چین ہوتا ہے ہم نے تو ہمیشہ تجھ کو خالی ہی

پایا۔ کبھی کسی کو تیرا شریک زندگی نہ دیکھا۔ خبر نہیں تو کس کو یاد کرتا ہے۔ کس کی یکجائی کا قصہ کہتا ہے۔

کیا وہ بھی کوئی الف تھا۔ یا وہ کوئی نقطہ تھا۔ یا اور کوئی ایسی چیز تھی جس کی فرقت تجھ کو ستاتی ہے۔ اور یہ فریاد زبان سے نکلواتی ہے۔

ہاں تم نے اس کو نہیں دیکھا۔ ہاں کسی نے بھی اس کو نہیں پایا۔ وہ حسین نہ تھا جسکو دوسرے حسن پرست دیکھ سکتے۔ اس میں رعنائی و ناز و انداز نہ تھے۔ جس پر کسی غیر کی نظر پڑتی۔

تو پھر وہ کیا تھا۔ بتا کہ وہ کب تھا۔ اور اب کہاں ہے سیدھے سادے الف کیا تیرا دماغ کچھ خراب ہو گیا ہے۔ یہ تو کیسی بے سر و پا باتیں کرتا ہے۔

الف چپ ہو گیا۔ اس کی حیرت خیز خاموشی عالم تصویر بن گئی۔ اور اس کے آگے سب حروف اس بنا۔ سکوت کو غم کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

سنو الف خود بخود کچھ کہہ رہا ہے۔ دیوانوں کی طرح بہک رہا ہے اور پکار رہا ہے

"میں ایک ہوں۔ میرے معنی بھی ایک ہیں۔ میری شکل بھی واحد ہے۔ میں مثال وحدت ہوں۔ میں خیال یکتائی ہوں۔ مگر آہ کثرت کے جیل خانے کا قیدی ہوں دور ہوں مہجور ہوں۔ رنجور ہوں۔

پیاری بے۔ نقطے والی بے۔ اپنے نقطہ کو دور کر دے تو حرف مبہم اور خط بیکار رہ جائے۔ میں جب سے اپنے پیارے نقطے سے جدا ہوا ہوں۔ جوں کا توں موجود ہوں۔ فنا نہیں ہوا۔ نابود نہیں ہوا۔ کاف۔ نون میرے رقیب ہیں۔ کن بن کر آئے اور میرے پیارے کو بہکا کر لے گئے۔

اس کا وعدہ تھا۔ میں تیرا ہو کر رہوں گا۔ وہ اقرار کر چکا تھا۔ مگر حمد و محمود کے الجھاؤ نے کن کو نمودار کیا۔ اور کن نے آتے ہی سب اقرار بھلا دیئے۔

آہ وہ بھولتا نہیں تھا۔ بھول چوک سے پاک تھا۔ ہر چیز پر قادر تھا۔ وہ مجھ سے کیوں جدا ہو گیا۔ یہ کیا اس کے جی میں آ گئی ؂

میں الف ہوں۔ وہ بھی الف تھا۔ کن سے پہلے وہ میرے ہاں تھا۔ میں اس کے ہاں تھا۔ میں وہ تھا۔ وہ میں تھا۔ میں تن تھا۔ وہ جان تھا۔ وہ تن تھا۔ تم نے کہا۔ میں اور میرے تحت حروف انسان کی زبان میں وہ ہمارے ذریعہ بولتا ہے۔ حرفوں کی ترازو میں مطالب تولتا ہے۔ تم نے غلط کہا۔ نہیں تم نے صحیح کہا۔ بتا نا میں نے کیا کہا۔

میں دیوانہ ہوں۔ مستانہ ہوں۔ تم اے آدمیوں میرے ذریعے بولتے ہو۔ میں کس کے سہارے بولوں؟ میرے پاس حرف نہیں ہیں۔ میں کس کے الفاظ بناؤں۔ اور کس چیز سے اپنے مطالب کو اس کے سامنے لے کر جاؤں ؂

اگر وہ حرفوں اور لفظوں کا محتاج ہے۔ تو میرا مطلوب کیوں بنا ہے۔ خالی ہاتھ والے کے دل میں کیوں آیا ہے ؂

اور اگر وہ ان ذریعوں کی پروا نہیں رکھتا تو اقرار پورا کرنے کیوں نہیں آتا مجھ کو اپنے پاس کیوں نہیں بلاتا۔ یہ دیوار کیوں چنوائی ہے۔ یہ کیا اس کے جی میں آئی ہے۔

الف ہوشیار ہو۔ لام کو دیکھ۔ میم کو دیکھ واؤ کو دیکھ سب خالی ہیں۔ ک۔ ع۔ ص س۔ د۔ ر۔ ط بھی تیرے جیسے مجبور ہیں۔ تو اکیلا خالی نہیں ہے۔ اور بھی ہیں ؂

ہاں اور ہیں۔ مگر ان کی تنہائی اور میری تنہائی میں فرق ہے۔ وہ بلبل ہیں میں پروانہ ہوں۔ وہ حصار میں محفوظ ہیں۔ میں دروازوں کے تیروں کا نشانہ ہوں ؂

الف کی یہ بے معنی غیر مفہوم مگر مزے دار باتیں سنکر میں نے بڑا تعجب کیا کہ تصوف سے تعلق رکھنے والی بے نتیجہ باتیں بھی اتنا کیف رکھتی ہیں تو بانتیجہ حالات میں کیا سرور ہو گا۔ طالبوں سے کہو اندر آ کر دیکھیں۔ اور اس حد تک پہنچیں جس کے سایہ اور عکس کی یہ ادنےٰ سی کیفیت ہے ؂

یورش

ارواح کی اجسام پر

(از رسالہ صوفی جون ۱۹۱۲ء)

سفید سورج کی روح حرارت۔ کالی رات کی روح برودت۔ بہتے پانی کی روح حیات۔ کھڑے کنارے کی روح نظر بازی۔ حیوان کی روح نادانی انسان کی روح دانائی ؂

دیکھنا۔ آپس میں کیا سرگوشی کرتی ہیں۔ کس شاندار مہم کے لئے سازش کر رہی ہیں تلک الایام نداولہا بین الناس کا خدا بھلا کرے جس نے اس مخفی جوڑ توڑ کی خبر دیدی۔ ورنہ خبر نہیں کس قیامت کا سامنا ہوتا۔ سورج کی روح نے کہا میں نے اجسام زمین۔ قمر۔ مریخ۔ مشتری۔ زہرہ وغیرہ کی پرورش میں عمر تمام کردی مگر مادی پتلوں نے میرا ایک گن نہ مانا۔ ہے شرط کہ ان سب کو نظر قہر سے فی النار کردوں شب تاریک کی روح بولی۔ میں اصل بنیاد کل کائنات کی ہوں۔ اجسام کی پردہ پوش ہوں۔ لیکن اب اجساد کی شیطنت حد سے بڑھتی جاتی ہے۔ کیوں نہ میں ان کا پردہ فاش کردوں ؂

رواں دواں پانی کی روح نے بہتے بہتے آواز دی کل شئ حیی من الماء۔ مادیات کی مورتوں سے کہد ینا کہ احسان فراموشی کی تو زندگی وبال جان بنا دوں گی ؂

کھڑے کنارے کی نظر باز روح چنگھاڑی اگر بدن وقت منتظر سے انکاری ہے تو اس کا ملیا میٹ کر دینا مجھے کیا بھاری ہے ؂

حیوان کی نادان روح پکاری۔ مجھ میں عقل نہیں جو تمہاری رائے و میری

انسان کی دانا روح گویا ہوئی۔۔ "انا امر بکم الاعلیٰ" میں نے امانت خاص کو دوش پر رکھا۔ میں کن کی عملداری قفس خاکی میں رہی تو کیا یہ اجسام مجھ کو بھول کر سلامت رہ سکیں گے۔ کہدو۔ ناممکن ناممکن ناممکن۔

اس مشورت کا انجام۔ نتیجہ۔ حاصل۔ ایک یورش ہوگی۔ یلغار۔ خونخوار اور حملہ پرخروش ہوگا۔

اَے بدنو! اے دنیا کے مادی جسمو! تم نے اپنے بچاؤ کی کیا صورت اختیار کی ہے؟

امریکہ کا جواب:۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے "ورنہ میں نے تو مادہ پرستی اور تن پروری کو چھوڑنا شروع کر دیا ہے۔ امور روحانی کے آگے میرے باشندے سر جھکاتے جاتے ہیں۔

یورپ کا اظہار:۔ کچھ پرواہ نہیں۔ ارواح موہوم کی یورش کو دیکھ لیا جائیگا۔ میرے اندر ہُنر ہے۔ اور کاری گری ہے جس سے ہر روح اسیر پنجۂ مادی ہو سکتی ہے۔

چین کا بیان۔ میرا تو رنگ ہی زرد ہے جو پرتو روحانی کی شہادت دیتا ہے۔ پہلے تو عیسائی مذہب کے لیے خدا سے اسی لیے دعائیں مانگی تھیں کہ برکت روحانی میری مشکلات کا خاتمہ کردے۔ آیندہ بھی کسی حکم روحانی کی تعمیل سے انکار نہیں۔

ایران کی فریاد۔ دیکھنا۔ میں پہلے ہی ویران ہوں۔ ایران نہیں ہوں۔ بلبل کی روحانیت تلے جیتا ہوں۔ مجھ پر تو نظر کرم ہی رکھنا۔

افریقہ و عرب کی گفتگو۔ مت گھبراؤ۔ اے روحو! ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہارے دشمنوں کا مقابلہ سب سے پہلے ہم کریں گے۔

ہندوستان کا جواب۔ ست گرو کے چرنوں کی قسم! میں پرماتما کا جوگی بروگی ہوں۔ لڑنے جھگڑنے کا تو وعدہ نہیں کرتا۔ یہ جگرا تو عرب و افریقہ کا ہے

دل دل سے تم سب ارواح کا ساتھی ہوں۔ پرماتما تمہاری بھلی کریں۔

فیصلہ عالم جبروت میں یہ حکم کلام کر چکا۔ تو صدائے ہاہوت نے ارشاد فرمایا کہدو ناسوتیوں سے ارواح ہوں یا اجسام۔ ہم تم منتقم حقیقی ہیں۔ ذرہ ذرہ کے اقرار و انکار کو تول رہے ہیں لینے دینے کا وقت بہی قریب آگیا ہے۔ آپس میں دست و گریبان نہ ہو۔ ہماری ترازو کا کام ختم ہو لینے دو۔ ڈراپ۔

پلکیں تھرتھرائیں۔ پتلیاں اشکبار رہیں۔ کان وجد میں آئے۔ دل و دماغ محو ہو گئے۔ جب یہ سب دیکھا۔ سُنا۔ اور ڈراپ سین کو گرنے سے نہ روکا۔

خطیب کا غذ فام

(از اخبار خطیب دہلی ۷ جنوری سنہ ۱۹۱۵ء)

تین سیڑھی کے ممبر قدیم پر زبان بولتی تھی۔ اور خطیب کہلاتی تھی آج ممبر جدید کی شکل تو ویسی ٹکٹکی ہے مگر اسپر کاغذ فام خطیب قلم کی زبان سے چھپتا ہے۔

جن کو لغت کی بحث کرنی آتی ہے وہ کہیں گے کہ خطیب عربی کا ایک جامع لفظ ہے جو ہر اچھی بات کے دہن فصیح سے نکلنے پر صادق آتا ہے۔ اس لیے اخبار خطیب۔ مذہب۔ تمدن۔ ڈرامائی اور ان کہنی چیز پر جس کو کان میں سُنا جائے تو سیاست و پالٹکس کی آواز آئے بحث کر سکتا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ ان اخبار فروشوں نے خطیب کے کیا کیا مقاصد تجویز کئے ہیں۔ اور جو بھی ہوں مجھے اس سے کیا۔ میں تو اپنے کاغذ فام گلفام کو ایک پیشگی بوسہ بھیجنے کے لیے حرفوں کا توڑ جوڑ کرنا چاہتا ہوں۔

خطیب کاغذ فام نے خدا بھی جوانی کی راتیں دیکھی ہیں منہ مرادوں کے دن پائے ہیں۔ ابھی تک خدا نے بُری نیت کے شاعروں سے اس کے دامنوں کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ مگر کب تک؟ بت ہرجائی انگشت نمائی سے محفوظ رہے گا۔ شمع بنے گا تو بے شمار پروانے فدا ہونے نکل ہی آئیں گے۔

کیوں! پیارے گلفام۔ ابھی تو تم فتنہ ہو۔ فتنوں کے زمانے میں غدار کے پروان چڑھنے نکلے ہو۔ جب قیامت بنو گے اس وقت تو بھلا ہم غریبوں سے کہاں آنکھ ملاؤ گے۔ پر آج تو ایک نگاہ طفلی سے ادھر دیکھو اور ننھے ننھے ہونٹوں سے کچھ گل افشانی کرو۔

ہاں ہاں میں نے سنا۔ واہ کیا بات ہے کیا گھات ہے۔ ماشاءاللہ سبحان اللہ مگر ان غیر لوگوں کو تمہاری زبان میں نہ سننے دوں گا۔ اپنی زبان میں صدائے بازگشت کے طور پر سناؤں گا۔ تاکہ تمہاری کنواری آواز میرے ہی لیے مخصوص رہے۔

صاحبو! دل جان خطیب تم سے یوں خطاب کرتا ہے۔ پروانو۔ مستانو۔ دیوانو۔ ہوشیار باش۔ بیدار شو۔ یہ سمندر فضائے آسمانی میں بہنا چاہتا ہے۔ تو وہ خاک اپنے ذروں کو موجوں میں لے آتا ہے۔ اس کام میں اس کا ہاتھ ہے جو جگ داتا ہے۔

اب کاغذ کی جنس میں ایک نوع خصوصی جلوہ افروز ہوتی ہے۔ اس کی ہر ادا گوش ہوش کے لئے انمول ہوتی ہے۔ وہ علم کے دریچوں میں عمل کے فانوس روشن کرے گا وہ سنسان ویران محفلوں میں طوطی شکر مقال بنے گا۔ اور اسکی پہلی صدا یہ ہوگی۔

حق ہے باری تعالےٰ۔ حق ہے کملی والا۔ حق ہے سب کا حق۔ حق نے حقوق کو پیدا کیا۔ اور بندوں کو ان کی شناخت اور گرفت پر رشید کیا۔ حق ہی نے کہا۔ کون ہے امانت کا حق دار ہے۔ حق ہی نے جواب دلوایا کہ یہ بندۂ آدم اس نعمت کا سزاوار

ہے وہ امانت اسکو مل گئی۔ جو سرتاسر حقوق میں غرق تھی۔ اور عشق اس گھٹا کی برق تھی۔

آدم نے خالق دم کی امانت کو سینے سے لگایا۔ حقوق کے جواہرات سے جڑے ہوئے زیور کو گلے کا ہار بنایا۔ جب آدم کہلایا۔ ہر حق میں طلب کی جھلک تھی اور ہر جھلک میں ایک پلک تھی۔ اور ہر نوک میں ایک کھٹک تھی۔ ہر کھٹک میں تلخی و شیرینی تھی۔ اور اسی تلخی و مٹھاس پر دنیا کے کاروبار تھے۔

کبھی دیکھا کہ حقوق اللہ کے مطالبے ہیں۔ اور نفس و شیطان اس کی کڑواہٹ سے منہ بناتے ہیں۔ کبھی سنا کہ حقوق العباد کی پکار ہے۔ اور ناحق شناسوں کی حالت زار و نزار ہے۔

حقوق اللہ کہتے تھے۔ پہلے حقوق بندگان کی حفاظت کرو۔ کہ ہم بھی اسی پیکر کی روح رواں ہیں۔ حقوق العباد آواز لگاتے ہیں۔ کہ نہیں۔ ہم بھی سایۂ رب کے امیدوار ہیں۔

خبر نہیں ان دونوں میں کسر نفسی کون کرتا تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ ہر ایک صداقت و راستبازی کا پتلا تھا۔

خطیب کاغذ فام حقوق فریقین پر نظر ڈالے۔ تو اس کو رفتار۔ کردار۔ گفتار کے بے شمار میدان مل جائیں۔ اور ہر گھر کے نیک و بد انسان اس کی بات سننے باہر نکل آئیں مگر صاف بات ہے۔ میں اس وقت اس کے پاس بھی نہ جاؤں گا۔ ہرجائیوں کی بیوفائیاں دیکھ چکا ہوں۔ بھلا میں اس کے قابو میں آؤں گا۔ وفا اور ایک در گیری ایک حق مشترک ہے۔ جس کو عبد و معبود دونوں اپنا بتاتے ہیں۔ کیا یاد نہیں کہ پرورش سرکار کے کلمہ لفظ وفا کو دودھ کی جا ر پلاتے ہیں۔

خود خدا کا بیان ہے کہ وفا میرا اصلی ارمان ہے جس کی خاطر بنا یہ سارا جہان ہے

جو بے وفائی کرتا ہے۔ مشرک کہلاتا ہے۔ اور بارگاہ الٰہی سے بڑی سزا پاتا ہے حکومت بھی بے وفاؤں کو پھانسی پر لٹکاتی ہے۔ سوسائٹی بھی ایسوں کو منہ نہیں لگاتی ہے پھر میں عہد و معبود کا ایک تالث تماشائی ہوں۔ کیونکر اس متعدی خواہش کا شریک نہ بنوں۔

جو خطیب ہر متوالی آنکھ کا تارا ہو۔ وہ میرا کیونکر دل آرا ہو۔ میں تو خدا کی ہر دلعزیزی پر بھی بدگمان سا ہوتا جاتا ہوں۔ جب وہ اپنے حقوق کی باز پرس کر سکتا ہے تو مجھ کو بھی اجازت ہونی چاہیئے کہ اپنے حقوق کا مطالبہ کروں۔ اور پوچھوں کہ تمہارے لئے تو مجھ جیسے بے شمار ہیں۔ مگر تم میرے لئے یکتا و فرد ہو۔ پھر کیا معنی کہ تم اپنی یکتائی وحدت کے جلوے اوروں کو بھی دکھاتے ہو۔ یا تو میرے لئے مخصوص ہو جاؤ۔ اور ایک صفت میرے واسطے نذر کر دو۔ یا مجھ سے یہ تقاضا نہ کیا کرو کہ ہمارے سوا کسی اور پر نظر نہ ڈالنا۔

خیال تو بہت کچھ آتے ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ دل خدا کے قبضہ میں ہے۔ جب ایک مہم تیار ہوتی ہے۔ دل اس کو پراگندہ کر دیتا ہے۔

یہ خطیب بھی کاغذی دل ہے۔ کس کو خبر ہے کہ خدا اس سے کیا کام لے گا اور کن کن کے مجوزہ نقشے برباد کرائے گا۔ تو لاؤ اپنے ارادے کو ابھی سے اس کے سامنے رکھ دوں۔ اور کہوں کہ اے کاغذ فام خطیب! جب تو بندوں کو ان کے مذہبی۔ اخلاقی۔ تمدنی۔ آئینی حقوق یاد دلاتا اور سکھاتا ہے تو ذرا ان سے بھی کچھ کہیو۔ جن کا تو پیام رساں ہے کہ وہ بھی اپنے دست توانا کو حرکت میں لائیں۔ اور بندوں کو خطیب کی باتوں پر عمل کرنے کی توفیق دیں۔ اور قدرے حسن نظامی کو اسیری تخیلات سے آزادی بخشیں۔
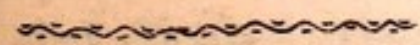
جھینگر کا جنازہ

(از خطیب، مئی ۱۹۱۵ء)

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ اُفوہ جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں۔ جو وہ مجھ کو دکھا کر ہلایا کرتا تھا تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی نقل آتا رہا تھا اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا۔ اگر دل سے یہ عہد نہ کیا ہوتا۔ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں۔ میں ان کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کے ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں رے شریر۔ تو یہاں کیوں آیا؟ اُچھلکر بولا۔ ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔ سبحان اللہ۔ تم کیا خاک مطالعہ کرتے تھے بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ بولا واہ۔ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں۔ مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں۔ اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ بوجھ اٹھانے والے گدھے ہیں۔ جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینی جانتا ہے تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی طاقت سے ایک نئی شان پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے۔ جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔

یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا۔ جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔ جھینگر کی یہ بات سن کر مجھ کو غصہ آیا۔ اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا۔ جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ واہ خفا

ہو گئے۔ بگڑ گئے۔ لاجواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

لیاقت تو یہ تھی۔ کچھ جواب دیتے۔ لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے۔

ہائے کل تو یہ تماشا دیکھا تھا۔ آج غسل خانے میں وضو کرنے گیا تو دیکھا بچارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے۔ اور اس کو دیوار پر کھینچے لئے چلی جاتی ہیں۔

جمعہ کا وقت قریب تھا خطیب کی اذان پکار رہی تھی۔ دل نے کہا جمعے تو ہزاروں آئیں گے۔ خدا سلامتی دے۔ نماز پھر پڑھ لینا۔ اس جھینگر کے جنازے کو کندھا دینا ضروری ہے۔ یہ موقعے بار بار نہیں آتے۔

بیچارہ غریب تھا۔ خلوت نشین تھا۔ خلقت میں حقیر و ذلیل تھا۔ مکروہ تھا۔ غلیظ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کا ساتھ نہ دیا تو کیا امریکہ کے کروڑپتی راکفیلر کے شریک ماتم ہو گے۔

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا۔ جی دکھایا تھا۔ لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔ اس واسطے میں کہتا ہوں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں، کسی سوراخ میں، بوریہ کے نیچے آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔

نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنگ تھا۔ نہ سانپ کا ڈسنے والا پھن۔ نہ کوے کی سی شریر چونچ تھی۔ نہ بلبل کی مانند پھول کی عشقبازی۔ شام کے وقت عبادت رب کے لئے ایک مسلسل بین بجاتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ یہ غافلوں کے لئے صور ہے۔ اور عاقلوں کے واسطے جلوۂ طور ہے۔

ہائے آج غریب مر گیا۔ جی سے گزر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائے گا۔ اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدان جنگ میں ہے ورنہ اسی کو

دو گھڑی پاس بٹھا کر جی بہلاتے۔ کہ مری مٹی کی نشانی ایک یہی بے چارہ دنیا میں باقی رہ گیا ہے۔

ہاں تو "جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" چیونٹیاں تو اس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کر دیں گی۔ میرا خیال تھا کہ ان شکم پرستوں سے اس قومی شعار خادم مست کو بچاتا یہ "ویسٹ منسٹر ایبے" یا قادیان کے بہشتی مقبرے میں دفن کراتا۔ مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں بھی افریقہ کے مردم خوار سیاہ حبشیوں سے کم نہیں کالی چیز بھی ہر ایک بلائے بے درماں ہے۔ اس سے چھٹکارا کہاں ہے۔

خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہہ کر مرحوم سے رخصت ہوں ؎

"جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" "قیصر کا پیارا ہے اسے توپ پہ کھینچو"

اے پروفیسر! اے فلاسفر!! اے متوکل درویش!!! اے نغمۂ ربانی گانے والے قوال۔ ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں۔ اور توپ کی گاڑی پہ تیری لاش اٹھانے کا اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا رزولیوشن پاس کرتے ہیں خیر اب تو شکم مور کی قبر میں دفن ہو جا۔ مگر ہم ہمیشہ رزولیوشنوں میں تجھے یاد رکھیں گے۔

من کہ ایک دھوبی

کاغذی گھاٹ پر

(از خطیب ۔ ۳۰ جون ۱۹۱۵ء)

جاری جا۔ میں روٹی نہیں کھاتا۔ چاولوں کی پیچ ادھر کنارے پر رکھ دے اور ایک چلم بھر کر لا۔

چھُواچھو۔ چھُواچھو۔ چھُواچھو ۔۔

کیوں ری نزا کی ماں۔ دریا کا پانی گدلا۔ صابن کم۔ میں کیونکر ان میلے کپڑوں
کو صاف کروں۔ چھُواچھو۔ چھُواچھو۔ چھُواچھو ۔۔

دیکھ درخت کا پتہ سوکھ کر گرا۔ ہوا اڑا کر لے چلی۔ اب خبر نہیں یہ بچھڑا ہوا کب
ملے گا۔ چھُواچھو۔ چھُواچھو۔ چھُواچھو ۔۔

میرا بیل ہاتھیوں سے بڑا۔ گھوڑوں سے تیز۔ ریل سے زیادہ تابعدار۔
پھر تو کہتی ہے کہ امیر بڑے ہوتے ہیں۔ ان میں بڑائی میرے دم سے ہے۔ میں
اُجلے کپڑے نہ پہناؤں تو ان کی عزت دو کوڑی کی ہو جائے ۔۔

چھُواچھو۔ چھُواچھو۔ چھُواچھو ۔۔

بھرلے حقہ مارلوں گھونٹ   پیا چھا گئی چاروں کھونٹ

سنتی ہے اس کاغذی گھاٹ پر آئی ہے۔ چنری۔ چولا۔ دھلوانے لائی ہے
تو میری بات مان یہ چولا من کے صابن سے دُھلے گا۔ جس کو پریم کی بھٹی میں چڑھاؤں گا
نیچے آگ جلاؤں گا۔ اور پھر یہ گاتا جاؤں گا ۔۔

او ~~~~~~ ہو ~~~~~~ او

کیوں رے چولے کا تُوں تیرا میل پانی اُبلا۔ جوش میں آیا۔ تو گھبرایا۔ میل کٹا۔
پاک ہوا۔ صاف ہوا۔ اب کیسی سی سی آہ ۔۔

او ~~~~~~ ہو ~~~~~~ او

چھُواچھو۔ چھُواچھو۔ چھُواچھو ۔۔

یہ تن۔ وہ من۔ تو دھوبن۔ میں دھوبی۔ سب میں ساجن۔ تو دھوبن میں دھوبی
چھُواچھو۔ چھُواچھو۔ چھُواچھو ۔۔

کہنے دے ہم کیسن ہیں۔ ہم سونے وہ مہین ہیں۔ دیکھتی نہیں سل سے باریک

میرے ہاتھ میں ہیں اور میں ان کو پتھر پر پٹخار رہا ہوں ۔۔

چھُواچھو۔ چھُواچھو۔ چھُواچھو ۔۔

یثرب نگر کے چودہری نے کہا۔ جو سارے سنسار کے میلے تنوں کو دھونے
آیا تھا۔ اسلام غریبوں سے شروع ہوا۔ اور پھر غریبوں میں آجائے گا۔ تو بس ہم تم
دونوں اپنے چودہری کے بیان پر مگن ہیں۔ اسلام ہم ہیں۔ ہم اسلام ہیں۔ اور
سب امیر پیسہ والے من و تو کے کلام میں ۔۔

چھُواچھو۔ چھُواچھو۔ چھُواچھو ۔۔

(۲)

چھپیو رام۔ چھپیو۔ چھپیو ۔۔

پکا پکو کر دیں دھریا۔ پجاری دیں دھریا۔ تجھ سے اتنا کہا میں روٹی نہیں
کھاتا۔ اَنّ اور جَلّ دو بہن بھائی ہیں۔ اَنّ نے بابا آدم کو جنت سے نکالا جل نے
پاؤں میں بیڑی ڈالی۔ آدھی رات سے اس دریا میں کھڑا ہوں۔ اور پانی کا قیدی
ہوں۔ جب جَلّ نے جلایا تو اس کی بہن اَنّ سے کیا محبت ہو ۔۔

چھپیو رام۔ چھپیو۔ چھپیو۔ چھُواچھو۔ چھپیو ۔۔

ندی کنارے میں کھڑی اور پانی جھل مل ہوئے
میں میلی پیا اجلے ری میرا کس بدھ ملنا ہوئے

چھپیو رام۔ چھپیا۔ چھپیا ۔۔

کپڑے دھوتے۔ ساری عمر دریا کے کنارے گزر گئی۔ مگر اپنا آپا میلا کا میلا
رہا۔ صاف ستھرے اور اجلے پیا کی نظروں میں میری کیا قدر ہو گی۔ اور اس تک
کیونکر پہونچنا نصیب ہو گا ۔۔

چھپیو رام۔ چھپیو رام۔ چھُواچھو ۔۔

اچھاری۔ ذرا ایک بات اور سُنتی جا۔ دیکھیو خدا آسمان کی کھڑکی میں جھانک کر مجھ سے کچھ کہتا ہے۔ پورا تو سمجھ میں نہیں آیا۔ سوائے اس کے کہ اُس نے کہا۔

رام جھروکے بیٹھ کے سب کو مُجرا لے　　جیسی جا کی چاکری ویسا واکو دے

تو جب اس کی دین چاکری پر ہے۔ تو لاؤ میں بھی اس دریا میں جہاز چلاؤں۔ وہرہی کیوں کہلاؤں۔ امیر البحر کیوں نہ بنوں۔ اس سنسار میں۔

گرَن کی بھرَن

ہے جو کرتا ہے۔ پاتا ہے۔ میں نے ساری عمر کپڑے دھوئے۔ پیسہ ٹکے پر نیت رکھی۔ اتنا ہی ملا۔ خیال آگے بڑھاتا۔ رام زیادہ بھجواتا ✣

چھیّو رام۔ چھیّا رام۔ ہو اچھیّو ✣

اری ننوا کی ماں تو تو خفا ہو گئی۔ کہاں چلی گئی۔ لا میں روٹی کھاؤں۔ تو جا مت تیرا خیال ہو گا کہ میں تیرے خفا ہونے کی پروا نہیں کروں گا۔ اری مجھ کو تو اس کا بڑا دکھ ہوتا ہے۔ اور دل میں بڑی جلن ہوتی ہے ✣

سائیں تم مت جانیو تو ہے چھوڑت موہے چین
گیلے بن کی لاکڑی سلگت ہوں دِن رین

چھی ہو۔ چھی ہو۔ چھیا۔ رام چھیّا ✣

اری کل رات کا خواب سُن۔ مَیں نے دیکھا۔ ایک سندر عورت اپنے بالم کو مایوس ہنسے دیکھ رہی ہے۔ مگر منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اتنے میں اس کا پریتم پیارا کہیں چلا گیا اور وہ ہاتھ ملنے لگی۔ کہ ہائے میں تو دو باتیں بھی نہ کرنے پائی تھی کہ بچھڑ گئے ✣

میں نے کہا تو کون ہے۔ اور یہ مرد کون تھا۔ عورت بولی میں روح لیتی آتما ہوں اور یہ مرد پریم شکتی (مظہر عشق) ہے یہ خواب دنیا ہے۔ اور عالم اسباب ہے اس عورت کی بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس سے جو دوہا پڑھا

تھا وہ یاد ہو گیا :-

سُپنے میں موسے پی ملے کر نہ سکی کچھ بات
سوتی تھی۔ رو تی اٹھی۔ ملت رہی دو ہات

رام چھیّو۔ چھوا چھو۔ چھیّو ✣

اں ننوا کے باپو یہ تو بتا۔ تو میرا پیا۔ میں تیری پیاری۔ تو میرا دولہا۔ میں تیری دولہن۔ پھر یہ پپیہا پی کہاں۔ کیوں پکارتا ہے۔ اس کو پی پی بکنے کا کیا حق ہے ✣

تو کپڑے دھو چکے تو کچہری جائیو۔ اور پیا پیاری کے نام کو انگریز بہادر سے اپنے نام لکھوا لائیو۔ اس کے بعد پپیہا کو پی پکارے گا۔ تو میں نالش کروں گی ✣

نہیں ننوا کی ماں یہ تیری غلطی ہے۔ پی کا پکا۔ نا پیا کا پیارا بننا آسان نہیں ہے دیکھو بھوترا کیسا کالا ہوتا ہے۔ مگر پی کی محبت میں اس کے منہ کی رنگت زرد ہوتی ہے اری اس پریم کی بڑی کٹھن بٹیا ہے۔ پپیہا بھی جھوٹ موٹ پی کو پکارتا ہے اور تو بھی خوامخواہ اس میں جھگڑا کرتی ہے۔ اری جن کے من میں پی بستا ہے ان کے منہ زرد پڑ جاتے ہیں۔ جا من میں پیا بسے۔ وا کے مکھ پیرا ہوئے ✣

جا لیکھاری۔ وہیں دھر یا۔ پکا پکو کرو ہیں دھر یا ✣

ننوا کے باپو۔ یہ رات کو چکوا چکوی۔ آپس میں کیا کیا باتیں کرتے تھے۔ میں نے تو اتنا سنا کہ چکوا جمنا کے اس پار اپنی چکوی کو پکارتا تھا۔ اور چکوی اس پار اپنے چکوے کو آواز دیتی تھی۔ جب ان کے پر تھے۔ تو اُڑ کر پاس کیوں نہیں جاتے تھے ✣

دیوانی اس پریم کی ہزاروں ریتیں ہیں۔ کہیں پروانہ چراغ پر آن کر جل جاتا ہے کہیں بلبل پھول کو گلے لگاتا ہے۔ لوہے کو مقناطیس کی محبت دی گئی ہے۔ یہ دیکھتا ہے تو بے اختیار اسکی طرف دوڑتا ہے۔ تنکا کہربا پر فریفتہ ہے۔ دیوار پاتا ہے

تو لپک کر سینے سے چمٹ جاتا ہے۔ مگر چکوے چکوی کی محبت یہی ہے کہ وہ جدائی کی بہار دیکھیں۔ وہ آپس میں مل نہیں سکتے۔ ساری عمر ترستے رہتے ہیں۔ اسی واسطے تو کہا ہے کہ چکوے چکوی کو نہ ستانا۔ وہ خود محبت کے ستائے ہوئے جدائی کے صدمے اٹھائے ہوئے ہیں ۔

چھیتو رام۔ چھیتو۔ چھیتو ۔

نوا کے بابو! تو نے کل کہا تھا۔ یثرب نگر میں ہمارے چودھری سارے سنسار کے تنوں کو دھونے آئے تھے۔ اس کا بھید مجھ کو بتا۔ کہ یہ کیا بات تھی ۔

ادھر تو تو بڑی مورکھ ہے۔ چل تجھے قوالی میں لے چلوں۔ وہاں یہ بھید سمجھ میں آ جائے گا۔ قوال گا رہے تھے ۔

میری میلی گدڑیا دھو دے

دھوبی نے کہا یہ میلی گدڑی ساری دنیا ہے۔ خود ہمارے وجود میں اور ان گناہوں اور شک و شبہ کے دھبوں کو صاف کرنے کے لئے خدا نے یثرب نگر میں جو عرب میں ہے۔ اور جس کو مدینہ بھی کہتے ہیں ایک بڑے چودھری کو پیدا کیا جس نے سارے جہان کے دھبّے دور کر دیئے۔ اور یہ سب میلی گدڑیاں دھو کر رکھ دیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ میں بے چارہ غریب دھوبی کاغذی گھاٹ پر کپڑے دھونے آیا ہوں ۔

سِیمُ لا

(از خطیب ۸ اکتوبر ۱۹۱۵ء)

جب میں چاندی۔ بدن میں صحت۔ دل میں جذبات اور عقل میں عروج ہو تو شملہ آؤ۔ انگریزی میں یہ سِملہ ہے۔ ذرا کھینچکر پڑھو تو سیم لا ہے جس کے معنی طلب

نقرہ میں محو ہیں ۔

میں آیا تو جیب خالی۔ بدن ناتواں۔ دل جذبات سے صحرا۔ عقل زوال پذیر۔ کوئی وجہ ایسی نہ تھی جس کے سہارے اس اونچے پتھر خانہ میں آتا۔ مگر وہ کھینچتا ہوا لے کر آ گیا۔ حجرۂ فتح محمد میں ٹھہر گیا ۔

یہ وہ وقت ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے سب پیشوا سیاسی و عملی اس کوہ نور پر جمع ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یونیورسٹی لینے آیا ہوں۔ کوئی کہتا ہے کہ رزولیوشن پیش کرنا اور جواب میں نغمۂ دلربا سننا ہے۔ کسی کو مال روڈ پر گشت لگانا اور ہوٹل میں جانا آتا ہے۔ کوئی زندگی کی رسیدگی میں ہوائے شملہ سے رفو کرنے آیا ہے ۔

چاند زوروں پر ہے۔ آدھے دن ادھر آدھے دن ادھر۔ تیرھویں چودھویں کا سماں ہے۔ رات کو آسمان منہ دھو کر بے پردہ نکل آتا ہے۔ چاند تاروں کی فوج کو قواعد کراتا ہے۔ غیر نوجی بند والے حجرے کے جھروکوں میں بیٹھا ان نورانی ہستیوں کی نیزہ بازی دیکھا کرتا ہے۔ سردی باہر نکلنے نہیں دیتی۔ آتشدان کی ملکہ چاند کی قدرتی رقیب ہے۔ اس کے پاس ہوتا ہوں تو چاند کے پہلو میں کیونکر جاؤں ۔

کل چاندنی لرز لرز کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر چل رہی تھی۔ اور میں ہنستا تھا جب وہ پھسل کر غاروں میں لڑھک جاتی تھی۔ غار گود کھولے بنت القمر کی یاد میں بیتاب نظر آتے تھے۔ اور جب اس تابانی کو پاتے تھے تو اپنے اندر کی سب مخفی حالتوں کو نمایاں کر دیتے تھے ۔

کہتے ہیں یہ وہ پہاڑ ہے جو سینکڑوں کوس اسی طرح اونچا نیچا چلا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ وہ پہاڑ ہے جس کے ہاتھوں میں سارے ہندوستان کی دنیاوی قسمتیں ہیں۔ اس پہاڑ کے سینے پر جو تار ہیں۔ ان کی بجلی تمام ہندوستان کی موت و حیات پر حکمرانی کرتی ہے۔ اس پہاڑ کی گود میں جو ریل چلتی ہے وہ لاکھوں میل لمبے ہندی زندگانی کے

لئے آبِ حیات لیجاتی ہے یا ہر ایک کو اس کے نامۂ اعمال پہونچاتی ہے۔ ہونگے،
اس شملہ سے اور بھی اونچے پہاڑ ہونگے۔ مگر نصیبے میں اس سے اونچا کون ہے
اقبال اس سے بڑھ کر کس کا ہے۔ سب راجا پرجا اس سنگ خانہ میں کھنچے چلے
آتے ہیں۔

میں پوچھوں۔ کیوں جناب آپ نعرہ لگاتے تھے۔ انا سیم۔ اور میں بغیر سیم کے
آپ کے پاس آگیا تو یہ پہاڑ کیا جواب دے۔ ممکن ہے کہ تیوری چڑھائے اور
میری بے عقلی پر قہقہہ لگائے۔ مگر میں اسکی کچھ پروا نہیں کرتا۔ اور کہتا ہوں کہ بغیر سیم
کے بھی سیم لا دیکھنے میں آسکتا ہے۔ اگر توکل خالق مس و سیم پر ہو۔

حضرتِ کُن

(از صوفی ستمبر ۱۹۰۹ء)

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرت کن پیدا ہوتے ہی رحلت فرما گئے۔ اور
اب دنیا میں ان کا نام ہی نام باقی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام موجودات
کا وجود ان ہی جناب کے سہارے پایا جاتا ہے۔ یہ مر جاتے جہان سے گزر جاتے
تو فیکون کی صورت نظر نہ آتی۔

لوگوں کو ان کی موت کا شبہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ جو کرشمہ انھوں نے اپنی
پیدائش کے وقت دکھایا تھا وہ دوبارہ نہ دیکھا گیا۔ انکی پیدائش سے پہلے نہ آسمان تھا
نہ زمین۔ اور نہ یہ تمام غلطاں پیچاں چیزیں جو آسمان زمین پر چھائی ہوئی ہیں اور یہ میاں آدم
بھی جو آج حضرت کن کی زندگی پر بحث کر رہے ہیں ظہورِ کن سے اول غائب تھے مختصر بات
یہ ہے کہ نہ پیدا اور عدم کا لفظ بھی گم تھا۔

حضرت کن کے میلاد شریف کی کیفیت یوں بیان کی جاتی ہے کہ جب خزانۂ
مخفی میں خود نمائی و خود آرائی کا جذبہ اٹھا اور اس جذبہ نے سکوتِ معدوم کے دریا
میں ایک لہر اور جنبش پیدا کی۔ خواہش نمود کا بادل گرجا۔ اور برسوں کی قید شدہ بجلی
نے بادل سے باہر آکر چمکنا چاہا تو سب سے پہلے حضرت کُن کو ولادت[1] کا شرف عطا
کیا گیا۔ جب یہ حضرت آغوشِ دہن سے باہر تشریف لائے تو عجیب شان سے آئے۔

هوحق سنانے میں ذرے ذرے تجلی ہوئی اور سایہ نمودار ہوا۔ یہ سایہ تیزی سے
گردش کرتا تھا۔ اور موجودہ عالم کی رنگا رنگ شکلیں اس میں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی
جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ اس سایہ کی گردش آہستہ آہستہ تھمی اور وجود عالم مستحکم قائم ہوگیا۔
اس کے بعد نہ پھر کبھی ایسی تجلی ہوئی نہ کوئی اس قسم کا دوسرا عالم ظاہر ہوا اس
واسطے بعض آدمی کہتے ہیں۔ کہ حضرت کن چل بسے ورنہ کبھی کوئی اور جلوے دکھاتے۔
لیکن آدم زاد غلطی کرتے ہیں جو مولانا کن کو مردہ تصور کرتے ہیں۔ وہ ضرور زندہ ہیں
اور ہر روز تجلیاں نازل کرتے ہیں۔ یہ بڑا نگار خانہ شب و روز نئے رنگ بدلتا ہے۔
جناب کن نہ ہوتے تو یہ نت نئی رنگینیاں کہاں سے آتیں ہمارا تو اس پر ایمان ہے کہ حضرت کن
زندہ رہیں گے اور مرنا انکے لئے محال ہے۔ کلام ہے تو اس میں ہے کہ آیا ان کی ولادت کی ضرورت
بھی تھی یا نہیں اور جب وہ پیدا ہو ہی گئے تو ان کا وجود کچھ کام بھی آیا یا یوں ہی افشائے راز کا دبہ
ثابت ہوا اس معاملہ میں دو خیال ہیں۔ حضرت کن کے حامی جو آرائش عالم کی ظاہری
بہار کے شیدا ہیں کہتے ہیں۔..... کن نے بڑا احسان کیا جو ہم کو راز کے بند صندوق سے
باہر نکالا۔ اور عجیب و غریب تماشے دکھائے۔ مگر گروہ مست قلندر جناب کن کا بہت

[1] یہاں وہ ولادت مراد نہیں جو ماں باپ کے تعلق سے ہوتی ہے۔ اس قسم کی ولادت سے قرآن شریف
کی سورۂ اخلاص میں انکار کیا گیا ہے ہم اس انکار کو سچا جانتے اور ڈنکے مارے ولادت کی تشریح کر دیتے ہیں۔ حسن نظامی

شکرہ گزار ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ نہ یہ حضرت تشریف لاتے نہ ہمارے سکون وحدت میں طوفان آتا۔ خشک وتر۔ خیر وشر۔ جان دار و بے جان۔ سینہ سے سینہ لگائے آرام سے سوتے رہتے۔

اب پہاڑ جنگل بیابان میں اکیلے کھڑے ہیں۔ اور شہروں کی رونق چہل پہل کو ترستے ہیں۔ شہر رات دن کے غل وشور سے اکتا کر پہاڑوں اور صحراؤں کی تنہائی وخاموشی پر حسرت کے آنسو بہاتے ہیں۔ دریا شاکی ہیں کہ ہم بہتے بہتے تھک گئے یہ کنارہ آرام سے بیٹھا ہے۔ یہ کیوں نہیں بہتا۔ کنارہ کہتا ہے۔ میں خود اپنی افتادگی سے نالاں ہوں۔ نقل مکان کر نہیں سکتا۔ ورنہ تمہاری طرح سیر کرتا پھرتا۔ سب سے زیادہ انسان اپنی تکلیفیں بیان کرتا ہے۔ بچپن اور جوانی۔ بیماری اور بڑھاپا۔ غریبی اور امیری نیکی و بدی۔ سب اس کی جان کے لئے وبال بنے ہوئے ہیں۔ ہم بھی جہاں تک غور کرتے ہیں انسان کی شکایتیں واجبی معلوم ہوتی ہیں۔ پر جہاں اسکو کن کے سبب آزردہ پراگندگی نصیب ہوئی ہے۔ طرح طرح کی خوشیاں بھی ملی ہیں جو دونوں اور حالتوں میں تقسیم ہو کر ایسی پر لطف بن جاتی ہیں کہ عالم یکجائی میں ان کا حاصل ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

روئی

(از صوفی جنوری ۱۹۱۳ء)

سردی کا موسم درحقیقت روئی کا موسم ہے۔ جہاں یہ دن آئے چاروں طرف روئی کی گوری گوری اجلی صورت نظر آنے لگی۔ انگریزوں اور ان کی ریس کرنے والے ہندوستانیوں سے ہمیں بحث نہیں جو روئی کا استعمال فیشن اور شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور بھیڑ کی اترن پہننے کو اپنا فخر جانتے ہیں۔ روئی خدا کی دعا ہوئی سخت زمین سے

نکلا ہوا شگوفہ ہے اور اون غریب بھیڑ کا اوڑھنا بچھونا جس کو ظلم و بے دردی سے زبردستی چھین لیا جاتا ہے اور اس مال مغصوبہ کے کوٹ کمبل اور طرح طرح کے کپڑے بنا کر استعمال کئے جاتے ہیں اور اس پر یہ ڈھٹائی کہ جو لوگ خدا کی دی ہوئی روئی کے کپڑے پہنیں ان کو ذلیل وحشی غیر مہذب۔ اولڈ فیشن کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

روئی کے درخت کو دیکھنا! کھیت میں اپنے سینکڑوں ہم جنس پودوں کے پاس سر پر سفید عمامہ باندھے خدا کی یاد میں جھوم رہا ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ جس قدر پھول اور پھل پیدا ہوتے ہیں ان سب میں نمی اور تری پائی جاتی ہے۔ مگر روئی اپنے درخت کا ایک ایسا پھل پھول ہے جو تر شاخ میں خشک وجود کے ساتھ نظر آتا ہے۔ یعنی روئی کے درخت کی جڑ۔ ٹہنیاں پتے یہاں تک کہ وہ شگوفہ جس کے وسط میں روئی ہوتی ہے سب میں تری اور گیلا پن موجود رہتا ہے مگر روئی بالکل سوکھی اور نمی سے پاک ہوتی ہے۔ یہ شہادت ہے خداوند تعالے کے اس ارشاد کی کہ وہ مردے سے زندہ اور زندہ سے مردہ آگ سے پانی اور پانی سے آگ پیدا اور نمودار کرتا ہے روئی کی جڑ پانی ہیں۔ ٹہنیاں۔ پتے۔ پانی آلود۔ مگر پھل شعلہ جوالہ باہمہ و بے ہمہ سب میں موجود۔ اور سب سے الگ۔ ٹھنڈک میں پیدا ہوا مزاج گرم پایا۔

اب ذرا اس پر غور کرنا کہ روئی کے پھول کے اندر جو مسلمانوں کے عمامے کی شکل کا ہے یہ کالی کالی سخت سخت کیا چیز ہے۔ اس کا نام "بنولہ" ہے جس طرح انسان اشرف المخلوقات کے باطن میں حجابات کثیف پیدا کئے جاتے ہیں۔ جو ریاضات و صحبت شیخ و اعمال حسنہ سے صاف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح روئی کی باطنی کثافتیں گردش تاب مشین کے اندر پوری مشقت کے بعد صاف کی جاتی ہیں۔ جب بنولے جو کہ ایک سخت و کرخت وجود رکھتے ہیں۔ روئی کے نازک اور گلفام بدن سے دور ہو جاتے ہیں۔ تو روئی کو ایک اور امتحان گاہ میں جانا پڑتا ہے اور وہ دھنیے کی تانت

ہے جو بچاری روئی کے تن زار کا ایک ایک رواں کھول بکھیر کر رکھ دیتی ہے۔ اور رنگ
رنگ کر میل کو ڈاکرکٹ صاف کرکے پھر سب اجزا کو ایک جگہ کرکے روئی کا گالا بنا دیتی ہے۔
ایک گالے کو لو۔ اور اسکو تولو۔ جتنا وزن اس کا ہو اسی اندازہ سے وہ روئی لو
جس کے بنولے اور کوڑا کرکٹ صاف نہیں ہوا تو تم کو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا
صاف روئی نرم ہو گی۔ گرم ہو گی۔ اور جسامت میں کئی حصے بڑی نظر آئے گی اور غیر صاف
شدہ روئی اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ انسان بھی جب صفائی
باطن کے بعد درجہ تکمیل کو پہنچتا ہے تو اس کی ذات و صفات میں بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔

مغرب کے دُھنیے

تو روئی دھنکنے کا ذکر آیا۔ اون اور روئی کے درجہ پر بحث ہوئی تو لامحالہ اس پر
بھی گفتگو ہونی چاہیے کہ اتران پرستش مغرب ہماری روئی کا کس قدر محتاج ہے مغرب
میں ہزاروں کارخانے ہماری روئی کے بل پر چل رہے ہیں۔ سوتی کپڑے کی مانگ ہے تو روئی
کے گالوں کی طرح گوروں کے گلے نہ پھولیں۔ اور پچک کر رہ جائیں۔ مگر یہ سب اہل سیاست
اصحاب کے سوچنے کی باتیں ہیں۔ فقیر تو اس امر کی شکایت کر سکتا ہے کہ مغرب کے دھنیے
مشرق کی پرانی روئی کو دھنکنے کے لیے تو اس قدر بے چین ہیں کہ کالے کوسوں روئی
دھنکنے کے سامان کندھے پر اٹھائے لیے چلے آئے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اپنے
گھر کے لحاف توشک کی بھی خبر لی۔ پرانی روئی کے دھنکنے کی دھن میں ایسے سرشار ہیں
کہ اپنے گھر کی روئی بے حیائی شراب خواری۔ خود غرضی بے رحمی کے بنولوں سے اٹی پڑی
ہے۔ اور اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا ....

اور آدمی! اپنے وجود کی روئی کے چار بنولے جن کا تعلق اربعہ عناصر سے ہے
نکال ڈال اور ایسی تانت بجا کہ تمام جسم صدائے وحدت کی تن تن سے گونج اٹھے اور روح

کی ملکہ تیرے پاکیزہ جسم کے نرم و گرم لحاف میں خوشنودگی و پسندیدگی سے بہنا قبول فرمائے

مستانہ بیمار کا جواب

(از طبیب۔ یکم جنوری ۱۹۱۴ء)

انگریزی میز والے اخبارچی! مجھ سے کیا مانگتا ہے؟ میں کیا کروں۔ کیا دوں؟
طبیب اخبار بنتا ہے۔ بننے دو۔ دنیا میں ہر چیز بننے سنورنے کو آئی ہے۔ خود خدا کے
جی میں بھی سمائی ہے۔ ہر ہستی نموداری کی طلب گار ہے۔ بندہ خود اس مرض کا گرفتار
ہے۔ مگر اب تو مدت ہو گئی۔ زخموں نے بہنا چھوڑ دیا۔ میں نے لکھنے پڑھنے اور
اخباری آہ و زاری کرنے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ تم جانتے ہو۔ پہچانتے ہو پھر کیا مانگتے ہو؟
دلی دور تھی۔ آج کل میں اس سے دور ہوں۔ سنتا ہوں کہ وہ میری طرف چلتی ہے
اور کہتی ہے۔ "دیوانہ ہنوز بیگانہ" چوپائی کا سمندر دامن پکڑے کو دوڑتا ہے۔ کہتا ہے
میری نبض دیکھو۔ طبیب کہتے ہیں۔ نبض کی تیزی اور حرکت بخار کی نشانی ہے کہیں
مجھ کو بخار تو نہیں؟ میں اس سے بھی نہیں بولتا۔ دل کو بھی جواب نہیں دیتا جو بیچاری
حرکت بے اختیاری کے سبب تپ لازمی کی فکر میں مبتلا ہے۔ پلکوں کی جانب بھی مخاطب
نہیں ہوتا۔ جو سکنڈ سکنڈ میں ٹھوکریں کھاتی اور چشم بیمار پر گری پڑتی ہیں۔ لفظوں کی دنیا
میں سنا جاتا ہے۔ علم دو ہیں۔ بدنی اور دینی۔ میں نے ابھی علم کے لفظ ہی کو نہیں پہچانا
بدن و دین کا کوچہ بعد میں آئے گا۔

دل گوشت کا ٹکڑا ہے۔ خون کا انجن گھر ہے۔ یا تخت رب العلمین ہے۔ یا مستانہ
دیوانہ کا جیل خانہ ہے۔ مجھے کچھ خبر نہیں دماغ کہاں ہے۔ کیوں ہے۔ اسمیں آنکھیں
کدھر ہیں۔ کان کس رخ ہے۔ ناک کس جانب ہے۔ زبان کون سے پہلو میں ہے۔

مجھے معلوم نہیں ۔

معدہ و جگر میں کیا تعلق ہے۔ گردہ کی کس کس سے دشمنی ہے۔ خانۂ شکم میں کن رقابتوں کا بازار گرم ہے۔ ان کو سمجھنے کا وقت نہیں نکال سکتا ۔

کیفیات و محسوسات اندرونی و بیرونی اور ملکہ جسم یارانی بی طبیعت لامکانی سے بھی میری شناسائی نہیں۔ سنتا ہوں وہ میری عاشق زار ہیں رات دن میری ہی خبرگیری و خاطرداری میں گھلی جاتی ہیں۔ مگر ان دنوں مجھے ان کی طرف بھی آنکھ اٹھانے کی فرصت نہیں ۔

دلی کی گورنمنٹ ملیریا کے مچھر پکڑتی ہے اور اخباروں کے جراثیم چھوڑی جاتی ہے اخبار روزانہ ہو تو یہ نوبت کا بخار ہے۔ ہفتہ وار ہو تو آٹھ روزہ۔ ہفتہ میں تین بار ہو تو تہیئہ اور دو بار ہو تو چوتھیہ ۔

طبیب کے ایڈیٹر صاحب کو خدا تندرستی دے۔ مجھ غریب الوطن کی نبض پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ وہ مسند عشق فارسی جانتا ہوتا تو کہہ دیتا۔ خیز اے نادان طبیب مگر یہاں تو ایسے عشق کا درد ہے جسکو دارو نے دیدار بھی مفید نہیں بہت شربت دیدار پئے۔ لال بھی۔ کالے بھی۔ مگر درد قابو میں نہ آیا ۔

کل رات حکیم سقراط زہر کا پیالہ لے کر میرے پلنگ تک آئے۔ میں نیچے بچھے ہوئے مصلے کو دیکھ رہا تھا کہ اب کوئی دم میں مجھ کو اس پر جانا اور خدا کے سامنے سر جھکانا ہوگا۔ بوڑھے حکیم نے ادب سے گھٹنے جھکائے اور کہا اسکو پی لو بیقراری جاتی رہیگی میں نے کہا ثبوت دو کہ تم کو جام زہر آلود نے تسلی دیدی۔ شام کو وکٹوریہ گارڈن میں ایک اسیر قفس طوطے نے بیان کیا تھا کہ قرار جنگل کی آزادی میں بھی نہ تھا۔ اور اس پنجرہ آہنی میں بھی نہیں ہے۔ پھر اگر میں زہر کا پیالہ پی لوں۔ مسلمان مولویوں کے فتوے موت الحرام اور انگریزوں کے قانون خودکشی کا سزاوار بنوں۔ تو کون کہہ سکتا ہے کہ مرض اضطراب دور ہو جائے گا ۔

حکیم سقراط کے برابر ایک اور پیر مرد نمودار ہوئے۔ بولے میں سعدی ہوں۔ میں نے کہا جناب شیخ صاحب مجھ کو حیران نہ کیجئے اور اس حکیم کو لے کر جائیے۔ آپ نے دنیا کو خوب دیکھ بھال کر سمجھا اور میں بغیر دیکھے سمجھ گیا ۔

سعدی نے بغل سے ایک کتاب نکالی اور کہا اس کشفیہ میں نسخہ دیکھو۔ دم گھٹنے لگا۔ زبان بولی۔ کتابوں میں کیا رکھا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر نے آواز دی۔ آفریں خوب جواب ہے۔ گردن موڑ کر حکیم ہربرٹ کو للکارنا پڑا۔ جاؤ گورے آدمیوں کو آفریں و تحسین دو۔ مجھے درکار نہیں۔ بمبئی کے بازاروں میں ہزاروں بیمار نظر سے گزرتے ہیں ٹرام گاڑیاں دوڑتی ہیں اور ہر بیمار کو اس کے شفا خانے میں لے جاتی ہیں میرے پاس یہ حکمائے شہرۂ آفاق خود آئے ہیں۔ فیس و نذرانہ سے انکار کرتے ہیں اور غریب سمجھ کر مفت علاج کرنا چاہتے ہیں۔ اخبار طبیب ان کے نام بھی جاری کر دیا۔ ان کو نسخے خوب یاد ہیں۔ یہ سب کاغذی حکیم تھے۔ آسمانی حکیم تھے۔ روحانی حکیم تھے۔ طوفانی حکیم تھے ۔

میں بیمار نہیں ہوں۔ حواس باختہ نہیں ہوں۔ عشقیہ مالیخولیا کے آزار سے آزاد ہوں۔ مولانا روم کے گندم نواز عشق کے زیر بار ہونے سے انکاری ہوں یہ ہمارا طبیب مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ اس سے کہو خلقت عشق سے تباہ ہے اور بڑے بڑے بزرگ خضر کی صورت اس آگ کو بھڑکاتے ہیں۔ ابھی اس خط کے لکھتے وقت شیکسپیئر نے قلم پکڑ لیا۔ کہتا تھا خدا اور محبت کا بھید کوئی نہیں جانتا میں نے ایک کہنی مار کر دھکا دے دیا۔ سٹیج پر رقص کرنے والا مجلس میں ناچنے والے کو سبق دینے آیا ہے سارے میں خدا کو بھی جانتا ہوں اور عشق کو بھی پہچانتا ہوں۔ یہ دونوں اس ساری کائنات کے جسم و روح ہیں۔ جسم کے عوارض اور روح کے آلام جن اخلاط سے پیدا ہوتے ہیں وہ بغیر بتائے مجھ کو معلوم ہیں۔ طبیب بیچارے کیا جانیں۔ بلغم و سودا کے صحرا

میں سرگرداں رہتے ہیں۔ صفراوی تحقیقات کی محنت میں زرد ہو گئے ہیں۔ خلقت سے کہتے ہیں۔ ہم کو حکیم صاحب کہو۔ ان کا کہنا جھوٹ نہیں۔ اور سچ بھی نہیں۔ نادان خلقت کی حکمت جانتے ہیں اس لئے سچے ہیں۔ دانا مخلوقات کی حکمت سے عاجز ہیں۔ لہٰذا دروغ گو ہیں۔ نیم حکیم خطرۂ جان ہو۔ مگر خطرہ جسم نہیں ہو۔ جان اور چیز ہے۔ حکیم طبیب کو اس سے کیا سروکار۔ جان کا راز جاناں کو معلوم ہے یا جاناں پرستوں کو۔ وہاں اگر کوئی خام کار پھنس جاتا ہے تو کان پکڑ کر نکال دیا جاتا ہے۔ پروانہ کا سوز مکھی کو نہیں دیا جاتا۔

تم سمجھے جناب حکمت مآب ایڈیٹر صاحب مستانہ بیمار کے جواب کو۔ ڈرتا ہوں۔ کہ تم لیاقت طبی جتانے کھڑے ہو جاؤ۔ اور کہو۔ حسن نظامی کے دماغ میں خلل آ گیا ہے تربوز کا چھلکا اُڑ جانے کی ضرورت ہے۔ تربوز کا چھلکا اڑ جاتے ہو تو وہ سرخ سرخ گودا ہی دو۔ جو رخ شعلہ صفت کا ہم شکل ہے۔ زخمی جگر کی صورت رکھتا ہے۔

طب اچھا فن ہے۔ عرفان جسم کا مرشد ہے۔ جسم کی شناخت ہو جائے تو جان تک رسائی دشوار نہیں۔ جان کیا چیز ہے؟ روح کس کو کہتے ہیں؟ جو طبیب اسکی دانش کا دم مارے وہ بے دم ہے یا بے دم ہونے والا ہے۔

نئی روشنی کے طبیب جن کو ڈاکٹر کہتے ہیں تمام کائنات و موجودات عالم کو خشک ہوں یا تر۔ حیوان ہوں یا بشر۔ پہاڑ ہوں یا شجر سلسلۂ جاناں میں منسلک مانتے ہیں۔ ہندو فلاسفر پہلے ہی کہتے تھے مگر ان سرکشوں نے نہ مانا۔ اب آنکھیں کھلیں تو پہچانا کہ حیّ و قیوم کی حیات ذرہ ذرہ میں نمایاں ہے۔ موت بھی زندگی رکھتی ہے۔ طاعون اور ہیضہ جیسے ہلاکو امراض کے بھی جان ہے۔ نازک نازک کیڑوں میں اسکی پہچان ہے۔ اب چند روز میں کہیں گے خدا کو بھی خوردبین سے دیکھ لیا۔ مگر وہ چھوٹا سا کیڑا نہیں ہے۔ نہ بڑا سا پہاڑ ہے۔ وہ نہ خوردبین سے نظر آئے نہ دوربین میں سمائے۔ اسلئے میں پہلے سے

کہے دیتا ہوں کہ ایجاد خردبین سے پہلے میں نے اس کو دریافت کر لیا ہے۔ یہ ایجاد و اختراع میرے نام پیٹنٹ ہونی چاہئیے۔ مگر اخبار والوں کا قلم دریا کا پانی ہے۔ معترض کی زبان کون روکے۔ کہا جائے گا۔ تم سے پہلے بے شمار انسانوں نے اس کو جانا اور پہچانا۔ رجسٹری تمہارے نام نہیں ہو سکتی۔

ہاں انہوں نے جانا پہچانا۔ مگر نئی روشنی کے آلات سے نہیں۔ وہ سب پرانی لکیر کے فقیر ہے۔ مجھکو جو عینک میسر آئی ہے وہ پہلے نہ بنی تھی۔ نہ آئندہ اس جیسی بننی ممکن ہے۔ میری مانو تو کہوں۔ کامل طبیب کاغذ کے حرفوں اور مریض و امراض کے تجربوں سے نہیں پہچانا جاتا۔ یہ سب ابن آدم کے کسبی و ظنی جوہر ہیں۔ کمال صفت عینی ہے۔ جو کبھی اثر بے توقع اور کبھی عزر بے یقین بنکر نمودار ہوتا ہے۔ خدا جب چاہتا ہے کسی طبیب کو یہ نعمت دیدیتا ہے کہ خلاف امید تاثیریں اس کے ہاتھ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ مایوس اور لاعلاج مریض اسکی کوشش میں بستر مرگ سے زندہ ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایک دن میں نے عزرائیل سے پوچھا۔ تم بھی زندگی کے ہاتھ سے کبھی آزردہ ہوئے ہو؟ بولے رات دن میں کئی بار یہ زحمت پیش آتی ہے ایک طرف مجھ کو حکم ہوتا ہے فلاں مریض کی جان نکال لو۔ دوسری طرف طبیب کامل کے ہاتھ میں اثر دیا جاتا ہے کہ مرنے نہ دو۔ اور دیکھتا ہوں کہ خاکی انسان جیت جاتا ہے اور مجھکو اپنی جبلت ہلاکت کی شکست سے سخت اذیت ہوتی ہے۔

میں نے کہا تم سمجھے بھی۔ خدا یہ دو رخی پالیسی کیوں چلتا ہے۔ جواب دیا۔ اسکا مجھکو علم نہیں۔ میں بولا سنو! زندگی کشمکش کامیابی و ناکامی کا نام ہے۔ تم ہمیشہ کامیاب رہو تو زندگی کے انقلابات کا لطف جاتا رہے۔ یہ حکمت سن کر عزرائیل نے حسرت سے مجھکو دیکھا اور میں نے جلدی سے اس کو قلمبند کر لیا۔

تنکے کا سلوک

(از نظام المشائخ ۱۹۱۵ء)

شیراز کے فلسفی صوفی نے کہا۔ درخت کے ہر پتے پر کردگار زمانہ کی معرفت کے دفتر منقوش ہیں۔ یہ سنکر جنگل کے نیم کی ایک ٹہنی کو میں نے جھکایا۔ اور اس کے پتوں سے پوچھا۔ خدا کی پہچان کا ورق کس رجسٹر میں ہے۔ شاخ جھول کر بولی۔ تم تو ہم کو جھکاتے ہو **خود جھکو** تب وہ مخفی نوشتے نظر آئیں گے۔

سنا آپ نے۔ میں اور ناہنجار اشجار کے آگے سر کو خم کروں۔ اغیار کے سامنے اس سر کو جھکنے کی عادت نہیں۔

میرے سکوت اور پس و پیش نے نیم کی ٹہنی کو موقع دیا کہ اس نے جھنجھلا کر اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑا لیا۔ اور دوسری شاخوں نے متحرک ہو کر اپنی گرفتار بہن کو اپنے اندر بلا لیا۔

قدم بڑھایا۔ چلوں اور کسی دوسرے عارف سے اس نکتے کو حل کروں۔ پاؤں کے نیچے دبے ہوئے گیاہ سبز کے تنکے نے آواز دی۔ میں بتاؤں۔ سنو تو میں بتاؤں۔ میں جھکا اور اس مہین آواز کو سمجھنے کے لئے گردن خم کی۔

نیم کی ٹہنیوں نے جھکتے دیکھ کر نعرۂ شادمانی بلند کیا۔ اور کہا۔ وہ جھکا جس کو انکار تھا۔ گھاس کے تنکوں نے مل کر جواب دیا۔ دیوانو! یہ آدمی اُس جنس کی جانب جھکا ہے جس سے بنا ہے۔ اس کو ایک دن اسی خاک میں آنا ہے۔ اور ہمارے ہی مٹیا محل میں تن گنوانا ہے۔ تم ہنسی نہ اُڑاؤ۔ یہ اشرف المخلوق ہے۔

اب میں نے کہا۔ پیارے تو ہی مجھ کو سلوک کا راستہ بتا۔ اور خدا تک پہنچا۔ تنکا بولا لکھنؤ جا۔ کاغذ بننے کی مشین دیکھ۔ وہاں میرے اور تیرے دونوں کے سلوک کی

منزلیں طے ہو جائیں گی کہ

کرنا اور سمجھنا دیکھنے اور کہنے سے اچھا ہے

دیکھنا لکھنؤ کی پیپر مل کو۔ غریب گھاس کے گٹھے بندھے رکھے ہیں۔ پھٹے پرانے گودڑ کے چھکڑے بھرے کھڑے ہیں۔ انجن سرگرم رفتار ہے۔ پہیے گردش میں مصروف ہیں۔ بھاپ بیقراریاں دکھا ہی رہا ہے۔ کالا دھواں اونچے مینار سے اوپر کی طرف اُڑا چلا جاتا ہے۔

تنکے کے سلوک کی پہلی منزل۔ پہلا مقام۔ پہلا لطیفہ۔ صفائی ہے۔ مشین اور حجاب غبار کی لڑائی ہے۔ لوہے کے پنجے تنکوں کو لکڑی کے تختے پر سمیٹتے ہوئے اوپر کھینچ رہے ہیں۔ اور غریب گھاس عالم بے کسی میں کھنچی چلی جاتی ہے۔

اس منزل کے امتحان سے پہلے تنکے کو دیکھا تو سراپا گرد تھا۔ معراج امتحان میں جا کر دیکھا تو صاف شفاف پایا۔ خاک کا ایک ذرہ بھی اس کے تن نازک پر موجود نہ تھا۔

میں نے کہا۔ لو اب بتاؤ۔ سینہ کدورت سے صاف ہوا۔ تنکا بولا واہ ابھی ایک ہی مقام طے ہوا ہے۔ تزکیۂ ظاہر کے بعد تزکیۂ باطن اور قلب ماہیت درکار ہے۔ دیکھتے دیکھتے ایک کھولتے ہوئے گرم چشمے میں تنکے ڈال دیئے گئے۔ اور آسمان سے گر کر زمین پر پہنچے۔ مجھے تنکا گرنا اور گلنا ناگوار ہوا۔ جس طرح کہ میں ایک طالب خدا کو عروج دنیا سے گرتا دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا کرتا ہوں۔ مگر تنکا ذرا نہ گھبرایا۔

پھر دیکھا تو کرخت تنکوں میں ایک گداخت تھی۔ اُبلے ہوئے۔ گلے ہوئے پڑے تھے۔ اب تیسرا دور شروع ہوا۔ مشین نے ان کو پیسا اور دلنا شروع کیا۔ اور آن کی آن میں بھرتا بنا دیا۔ اللہ تیری شان۔ وہ تنکے کی اکڑیلی آن۔ اور یہ بربادی اور مسماری کے سامان۔ چوتھے مقام پر مرشد تیزاب نے ہاتھ پکڑا۔ جسم افسردہ کو پینے لگا۔ کثیف رنگ کٹ گیا۔ سفیدی کا رنگ چڑھا۔ باطن ہر چیز کا سفید ہے۔ سیاہی عارضی

اور حجاب ناپید ہے۔ مقام پنجم میں یہ سفید بعرتہ اشک محبت سے پانی پانی ہوا۔ اور سامن کے رخسار شفاف پر پھیل گیا۔

چھٹے مقام میں حرارت عشق نے اس پانی کو جمایا۔ ساتویں میں کاغذ بنایا۔ اور سکھایا۔ اب ساتوں منزل طے کرکے تنکے نے زبان کھولی۔ گھانس سے کاغذ بنا۔ اور وید۔ قرآن۔ توریت۔ انجیل۔ زبور پر ان کے حرفوں کو سے گزشت معرفت دکھانے لگا۔ اس وقت کچھ کچھ میری سمجھ میں بھی آنے لگا۔

کیوں میاں تنکے! خودرنے۔ جب عرفان الٰہی کو سمجھانے اور دکھانے کے قابل ہوئے۔ ہمارا کیا بگڑا۔ کباب کو سوختہ ہونی۔ لذت ہم نے اٹھائی۔

تنکے نے کہا، تم اپنی قلب ماہیت کرلیتے تو اسی دن میرے اندر کے اسرار پڑھ لیتے۔ مگر تم خود دار اور آرام طلب رہے۔ اس لئے میں نے یہ بار سر پر اٹھایا۔ اور خودی کا مٹانا تم کو سکھایا۔ ظاہر میں یہ مٹنا ہے۔ لیکن حقیقت میں زندگی کی یہی بہار ہے۔ جنگل میں بکری کھالیتی۔ گائے بھینس چرلیتی۔ گھسیارہ گھوڑے کو کھلا دیتا تو یہ سربلندی کہاں میسر آتی کہ میں اُستاد اور تم شاگرد ہو۔ میں عارف تم جاہل ہو۔

تنکے کی گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ پرانے گدڑوں میں سے ایک پھٹی ہوئی بوسیدہ گدڑی نے پکارا۔ درد آشنا بنانے کو آواز دی۔ میں ناک پر رومال رکھ کر اس غلیظ ڈھیر کو دیکھنے لگا۔ گدڑی نے کہا۔ میں ناک ہی سے بات کرنی چاہتی ہوں۔ اور تم نے اسی کو ڈھک لیا۔ صاحب میں ایک ناک والی حسینہ کا لباس ہوں۔ گو آج انقلاب دہر کے ہاتھوں اُداس ہوں۔

پوچھا۔ کیوں تم پر کیا بیتی۔ اس کوڑے میں آنے کی کیا افتاد پڑی۔ گدڑی بولی میرے جسم میں چار رنگ کے کپڑے ہیں۔ جن کو ایک بھکاری فقیر نے جوڑا تھا۔ ایک دلاری طوائف کا پارچہ پشواز ہے۔ دوسرا مولانا نجم الحق کی عبا کا حصہ ہے۔ تیسرا

پنڈت ہرنام داس کی پوتھی کا جزدان ہے۔ چوتھا مسٹر ڈگلس کی قمیص کا ٹکڑا ہے۔ یہ چاروں اپنے اپنے وقت میں ذی رتبہ تھے۔ دلاری طوائف کی پشواز عیش پرستوں کو عزیز تھی۔ مولانا نجم الحق کا چوغہ خدا پرستوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ پنڈت ہرنام داس کی پوتھی کا جزدان تمام پنڈتوں کا دین و ایمان تھا۔ مسٹر ڈگلس کی قمیص سینۂ حکمرانی کی ہم جلیس تھی۔

مگر افتاد ایام نے ان چاروں کو اپنے مالکوں کی نظر سے اُتارا۔ کوڑی پر مدتوں ڈلوایا۔ پھر بھکاری کے ہاتھوں میں پہنچایا۔ اس نے سب کو جوڑ کر ایک گدڑی بنائی۔ اور لباس غربت کی عزت دلائی۔ اب بیچارہ فقیر بھی خدا کے ہاں گیا۔ بارہ برس کے بعد دن پھرے ہیں۔ یہاں آئی ہوں۔ سلوک کے مقامات طے کرکے میں بھی کاغذ بنوں گی۔ اور انسان کو بتاؤں گی کہ تیری معصیت قلب ماہیت سے دور ہوسکتی ہے۔

یہ باتیں سنکر میں نے نظام المشائخ کے ایڈیٹر کو دیکھا جو خرید کاغذ کی دھن میں تھے۔ چاندی دے کر گدڑیاں اور گھاس کے تنکے لینے چاہتے تھے۔ اس کاغذ پر وہ عقل مندی کی باتیں چھاپیں گے۔ اور خلقت ان حروف کو دیکھ کر ایڈیٹر صاحب کی فضیلت پر واہ واہ کرے گی۔ مگر کون جانے گا کہ اگر نظام المشائخ کے سفید اوراق پر تحریر نہ ہوتی۔ سادے صفحے شائع کردئے جاتے تو وہ اس بانوتی عبارت سیاہ سے زیادہ بلیغ ہوتے۔ بشرطیکہ کسی کو تنکے اور گودڑے کے سلوک سے آگاہی بھی ہوتی۔

دریائی سرنگ

(از خطیب ۱۰؍ مارچ ۱۹۱۵ء)

لڑائی کی خبروں میں بحری سرنگوں کا ذکر آیا کرتا ہے۔ یہ مخفی متھیار جہازوں کی

نقل و حرکت کیلئے بہت خطرناک ہیں۔ کیونکہ جہاز ان سے ٹکرا کر ڈوب جاتے ہیں۔

مگر اردو زبان میں اس کے لئے بحری سرنگ کا لفظ ایک اعتبار سے درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ سرنگ اُس مخفی راستہ کو کہتے ہیں جو ایک قلعہ سے دوسرے قلعے یا ایک مکان سے دوسرے مکان تک کسی جنگی یا پوشیدہ ضرورت کے لئے تیار کیا جائے۔ یہ راستہ زمین کے اندر ہوتا ہے۔

اور بحری سرنگ ایک قسم کا آلہ ہے۔ جس میں مشتعل ہونے والے مسالے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُن آلوں یا پیپوں کو سمندر میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اور یہ تیرتے رہتے ہیں۔

جب ان سے جہاز ٹکراتا ہے تو یہ پھٹ جاتے ہیں اور جہاز کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ان کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ جو بیان ہوئی۔ دوسری قسم پابند سرنگوں کی ہے۔ جو تاروں سے بندھی ہوئی سمندر کی تہ میں رکھی رہتی ہیں۔ اور جس وقت ان پر جہاز آتا ہے تو ٹکرا کر تباہ ہو جاتا ہے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ ان پابند سرنگوں کے تار محفوظ مقامات سے ملے ہوئے ہوتے ہیں جس وقت دشمن کا جہاز انکے اوپر آتا ہے آدمی ان تاروں میں بجلی کی رو چھوڑ دیتے ہیں۔ جن سے یہ سرنگ پھٹ جاتی ہے اور جہاز کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں پس معلوم ہوا کہ یہ

دریائی شہابے

بحری سُرنگ خواہ مخواہ سرنگ مشہور ہو گئے ہیں۔ میں نے ان کو بحری شہابے اسواسطے کہا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں عقیدہ ہے کہ جب شیاطین آسمان پر جانا چاہتے ہیں تو خدا کی جانب سے ان پر آتشی شہابوں کی مار پڑتی ہے چنانچہ رات کے وقت جو ہم دیکھا کرتے ہیں کہ آسمان پر ایک تارہ ٹوٹا اور دوڑتا ہوا ایک سمت چلا گیا۔ یہ تارہ نہیں ہوتا بلکہ وہی

آگ کا کوڑا

ہوتا ہے جو شیطانوں کے مارا جاتا ہے۔ چونکہ آج کل زمین کے بعض آدمی اس عقیدہ کی ہنسی اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شہابہ کوئی چیز نہیں۔ یہ روشنی جو نظر آیا کرتی ہے زمین کی گیس ہے۔ جو اوپر فضا میں جا کر بعض اوقات روشن ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ان منکروں کو سمجھانے کے لئے اللہ میاں نے خود ان ہی کے ہاتھ سے شہابے بنوائے۔ اور پھر انہی کو شیطان بنا کر یہ شہابے ان پر مارے۔

حضرت خضر عالم خیال میں

آج کل یورپ کی عالمگیر جنگ درپیش ہے۔ دریائی شہابوں کا تذکرہ روزانہ اخباروں میں چھپتا ہے۔ اس واسطے ایک دن عالم خیال میں حضرت علیہ السلام کا تصور بندھا کہ انہوں نے ایک کشتی میں سوراخ کر دیا تھا اور جب حضرت موسیٰ نے اس فعل عجیب پر اعتراض کیا تو انہوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ مشیت الٰہی کے ماتحت میں نے ایسا کیا۔ کیوں کہ اس کا زمانہ تھا کہ آگے جا کر ایک ایسا بندرگاہ آئے گا جہاں ظالم بادشاہ کی حکومت ہے۔ اور وہ نئی کشتیوں کو غصب کر لیتا ہے۔ اس واسطے میں نے اس کشتی کو عیب دار بنا دیا۔

اس روایت سے نتیجہ یہ نکلا کہ مرضی خداوندی دنیا کے کام اسباب ظاہری سے انجام دیتی ہے۔ ورنہ وہ چاہتی تو کشتی کو ظالم کے پنجہ سے اور طرح بھی بچا لیتی۔ مثلاً یہ کہ غاصب اندھے ہو جاتے۔ اس کشتی کو نہ دیکھ سکتے۔ یا ان پر کوئی اور بلا آجاتی جس کے سبب وہ ظلم نہ کر سکتے۔ لیکن پروردگار نے اس کا انتظام بھی ظاہری حیلے اور سبب سے کیا۔

بس یہ خونریزی اور تباہی بھی جو آج کل درپیش ہے کسی سبب اور باعث سے ہے

مگر اس کا راز کون بتائے۔ حضرت خضر نے حضرت موسیٰ کو بھی بہت مشکل سے یہ بھید بتایا تھا۔

خود سرنگ بولی

مجھ کو مستغرق بحر تخیل دیکھ کر تاروں سے بندھی ہوئی سرنگ بولی۔ مجھے سن مجھ کو دیکھ مجھ تک آ۔ جن کو نقشوں اور جغرافیوں کی شناخت نہ تھی وہ بھی آج کل ان لکیروں تک جاتے ہیں۔ اور ان سے آنکھیں لڑاتے ہیں۔ جو لڑائی کے نام سے کانپتے تھے ان کو بھی ہوائی جہازوں میں سوار ہونے کی جھرجھریاں آتی ہیں۔ امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے کہا۔ دیکھو تمہارے پاس ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ تم کیا ہو۔ تم کون ہو

پابند سرنگ نے جواب دیا کہ آدمی! جو تو ہے۔ وہ میں ہوں۔ جو میں ہوں وہ تو ہے۔ تو بھی فطرت الٰہی کے تاروں سے جکڑا ہوا ہے۔ میں بھی ان ہی کی اسیر ہوں۔ تو بھی ایک اشارہ ہُو سے پاش پاش ہو جاتا ہے۔ میں بھی ایک گردش انگشت سے نابود ہو جاتی ہوں۔

میری دوسری بہن کو دیکھ۔ جو آزاد ہے۔ تیرتی پھرتی ہے۔ مگر وہ بھی کشتی مرگ میں سوار ہے۔ کوئی جہاز اوپر آجائے تو اس کے وجود کا بھی بیڑا پار ہے۔

تیسری بہن کے تاروں کو بجلی نہیں ملی۔ مگر اندر کی آگ کیا کم ہے۔ ٹکر کی دیر ہے۔ ایسی بھڑکے گی کہ وہ اور جہاز دونوں گم ہو جائیں گے۔ اب جرمنی دیوزبر کی بحث فضول ہے۔ ہر ہستی موجودہ مثل تارپیڈو۔ بحری سرنگ ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کی اندرونی طاقتوں کو دیکھے اور ان سے کام لے تو باہر کی ان تمام اشیاء کو نظر حقارت سے دیکھنے لگے۔ کیونکہ جو شان ابن آدم کی ہے۔ وہ اور کسی کی نہیں۔

~~~~~~

دو تحفوں کی رسید

(از خطیب ۳۰ جون ۱۹۱۵ء)

ایک رنگون کو جو برہما کا گاؤں ہے۔ جہاں سنہری تالاب پر تجارت کی بکریاں چرنے جاتی ہیں۔ اور جس میں آج کل سرکاری سنسر (محتسب) محبت کے خطوط کو بھی دل میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولتے ہیں۔

اس میں رسید ہے ایک تحفہ کی۔ محمودؐ۔ یوسفؐ۔ بجاجیؐ۔ میاںؐ جاریچی کے پھول کی خدمت میں رسید پر ٹکٹ ایک آنہ والا نہیں ہے۔ اور اس کا مجھے ڈر نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تحفہ جان کا ہے۔ مال کا نہیں جس پر اسٹامپ کی ضرورت ہے۔

اقرار کرتا ہوں کہ تحفہ اس حالت میں کہ وہ بالکل کورا اور کنوارا تھا مجھ کو ملا اور اقرار کرتا ہوں کہ وہ اپنی ذات وصفات میں یکتا تھا۔ اور اقرار کرتا ہوں کہ کثرت کی ہر شان میں سراپا وحدت تھا۔ یعنی اس کا ہر جزو اپنے دوسرے اجزا کا ہم شکل تھا۔ میں نے اس تحفہ کے چٹکیاں لیں۔ اور وہ بےچین ہو کر زمین پر لوٹ گیا۔ لہٰذا یہ چند جملے بطور رسید الفت کے لکھ دیئے تاکہ ماسوائے فراموشی ہو۔

دوسرا مانسہ پٹیالہ کو جہاں برنالہ بھی ہے۔ اور سکھوں آریوں کے معرکے بھی ہوا کرتے ہیں۔ اور جہاں سنور یعنی بلی نام کا ایک ملک یا جزیرہ نما ہے جس میں خاں سرنج اور دین بھی رہتے ہیں۔

ان سب حواشی کے متن میں مانسہ نامی دیار ہے۔ اس میں میرا ایک مخلص یار ہے اس کے تحفے کی رسید کا اس وقت بار ہے۔ ست سری اکال کہہ کر میں اس رسید کو شروع کرتا ہوں۔ اور واہ گرو جی کا خالصہ اور سری واہ گرو جی کی فتح کہہ کر ختم۔ تحفہ کی پشت پر ایک مہر ہے۔ اس میں رومی بہادر کاغذی تحریر کو پامال کر رہے
~~~~~~

ہیں۔ اس لئے مجھے ڈر ہے کہ میرا سردار بہادر اس رسید کو پامال نہ کردے۔

تختے کے ہونٹ سنہری ہیں۔ ان کو دیکھ کر بیراگی کا ہاتھ۔ اور مٹی کی آنکھ شرماتی ہے۔ میں مٹی کا پتلا۔ مٹی کے برتن میں پانی پیوں۔ مٹی کے ظرف میں کھانا کھاؤں اور تختے طلائی پاؤں تو کیوں کر نہ شرماؤں۔

دیوانے دیوان سنگھ۔ کاغذی کھیل میں باطنی تفریح کو تلاش کر زندگی کی یہ تلاش ہوگی تو پوری رسید تاش ہوگی۔

دیدم۔ شنیدم۔ نوشتم۔ تو ہمیں بشنو۔ وخاموش شو کہ سکوت ذریعہ نجات ہے۔ دن عید اور رات شب برات ہے۔ لہروں میں منازل سلوک کی کشید ہے۔ اس واسطے پرسنی یہ تختہ کی رسید ہے۔

شملہ کی دیبی ماتا

(از خطیب ۱۴ ر اکتوبر ۱۹۱۶ء)

اس رات کی تاریکی میں سب سوتے ہیں۔ میں پہاڑوں کو کیا کہوں۔ وہ بھی بچھے پڑے سن سناتے ہیں۔ جن کی آنکھ کھلی ہے۔ ان کو بت خانوں کی دھن لگی ہے ایک شراب کے گلاس کے آگے سر جھکاتا ہے۔ دوسرا اپنے ہمشکل انسان پر شاجاتا ہے کہیں مردوں کی بندگی میں کمر بندھی ہے۔ درگاہ کی قبروں پر ٹکٹکی لگی ہے۔ یا پیر پیری کی صنمانی ہے۔ کہیں حور و غلمان کا خیال ہے۔ انہی کی تمنا میں سجدہ بے نماز ہے۔ کوئی پلصراط کے غم میں گرا جاتا ہے۔ دوزخ کی آگ کا خوف اپنے سامنے اپنی پوجا کراتا ہے۔ بیمار کو دیکھو نیند نہیں آتی۔ کروٹیں بدلتا ہے۔ اور حکیم کے نسخے کو یا معبود کہہ کر سینہ سے لگاتا ہے یہ دوسرا ابھی بیدار ہے۔ کل کچہری کا مقدمہ سر پر سوار ہے۔ تو کل کا دامن ہاتھ میں ہے یا پلیڈر۔ یا بیرسٹر کی خیالی تسبیح پڑھ رہا ہے۔ اُفوہ یہ سب اناڑی کتنی بھول میں ہیں۔ آگے بڑھوں یا ٹھہر جاؤں۔ نہیں ذرا اور آگے دیکھوں۔ شاید کوئی حق پرست نظر آجائے جس کی صحبت میں یہ کالی رات کٹ جائے۔

یہ جنگی سپہ سالار ہیں۔ فوجوں کو اُڑاتے ہیں۔ ملک جیتنے گھر سے نکلے ہیں۔ کیسے ہوشیار و خوددار ہیں۔ انکے دل میں کس کس کی یاد ہے۔ یہ کس عبادت کرتے ہیں گولہ کی توپ و بندوق کی۔ خندق و مورچہ کی۔ رسد کے انبار خانوں کی۔ زہریلی گیس اور ہوائی جہازوں کی۔ یہاں بھی اپنا نہ ملا۔ شملہ کی کونسلوں میں آؤ۔ رزولیوشن کی دنیا کو دیکھو بڑے بڑے آنریبل اپنی قوت استدلال اور ملکہ تقریر پر گھمنڈ کر رہے ہیں۔ ہر ایک اپنی خودی کا پرستار ہے۔ یہاں ٹھہرنا بے کار ہے۔

اے دنیا! تیرے اندر اتنے بت خانے ہیں اور سب جاگنے والے۔ انہی بتوں کو پوجتے ہیں۔ تو مجھ کو بھی اجازت دے کہ اپنے حجرے کے سامنے اس اونچی چوٹی کے پہاڑ پر دیبی ماتا کے مندر پر جاؤں اور اس بابل کی لاڈلی کے آگے سر جھکاؤں۔ ماتا۔ ماتا۔ سوتی ہے۔ اُٹھ اور جاگ کہ تجھ کو کیونکر پوجوں۔ ایلو دیبی ماتا۔ آنکھیں آنسو بھرے اپنے پجاریوں کو ڈھونڈتی ہوئی مجھ تک آئی۔ ماتا۔ میں تجھ پر قربان۔ تو کیوں تکلیف کرتی ہے۔ ماتا نے کہا۔

مورکھ ناداں۔ قبر کا بُت۔ ہڈی کا بُت۔ تحریر کا بُت۔ تقریر کا بُت۔ حکومت کا بت۔ زندہ بت۔ مردہ بت۔ ہنستا بُت۔ روتا بُت۔ میں بُت۔ تو بت۔ سب ترک کرنے اور چھوڑنے کی چیزیں ہیں۔ ان ہا دلوں کو دیکھ۔ عرب کی توحید میں سرشار۔ اُمڈے چلے آتے ہیں۔ جنت و دوزخ۔ خوشی و غم۔ رندی و تقوی کے خرقے پھاڑ ڈال۔ رام رام جب خدا نام کی سمرن پھیر۔ صفاتی جھگڑوں کو لات مار۔ ذات میں رم۔ ذات میں کا جل اپنے کو دیکھ۔ مجھکو دھیان میں لا۔ میرا باپ میرا سرچشمہ وہ ذات احدیت ہے۔ میں اسی نور کی شعاع ہوں جس کی جوت اس اندھیرے کے ذرہ ذرہ میں۔ آئی ہے۔ یہ

دیوانے آدمی میری مورتی کو پوجتے ہیں۔ اور میرے بابل کو مجھ سے ناراض کرتے ہیں۔
تو بھی اپنے مداحوں کا بت ہے۔ ڈر کہ تیرا داتا تجھ سے روٹھ جائے گا۔ جب کوئی
تیرے آگے سر جھکائے گا کہدے کہ بھروسہ اور ٹھکانا اس پر رکھو جسکے ہم سب محتاج ہیں۔
برساتی کیڑوں کی طرح جان نہ گنواؤ۔ جو چراغ کی لو کو نور کا دروازہ سمجھکر اندر داخل ہونے
آتا ہے۔ اور اپنی بھول میں جلا کا جلا رہ جاتا ہے۔

ارے بادل کے غبار۔ ارے اشکبار طوفانی۔ لا اپنے دل کا پانی۔ جو مدینہ کے چشمہ
حیات سے لایا ہے۔ اور دھو ہمارے دل۔ تاکہ دیکھیں توحید کا اصلی روپ۔ اور
پائیں بے قراریوں میں قرار۔ ماتا چلی گئی۔ ایک نشتر لگا کر غائب ہو گئی۔ میں اس بیابان
پہاڑ میں کس کو لاؤں جو اس تازہ زخم پر عقل کا پھایہ رکھے۔

کمبل اوڑھ لوں۔ گرم آتشدان کے پاس جاؤں۔ پان چباؤں۔ اندھیرے
غار میں گر پڑوں۔ یا اس زخم کو نوچ ڈالوں۔ یہ حس کیوں آئی۔ یہ ادراک کدھر سے
آیا۔ اس کا نام عرفان بھی۔ مگر بہت ستانے والا۔ اور رلانے والا ہے۔

بت خانوں کی بندشوں میں اسیر ہوں۔ اور کان یہ سناتے ہیں کہ آزادی کی توحید
نثار ہو۔ رنگوٹی پر ہو۔ تو آ۔ تجھ کو یہ آفت سونپ دوں۔ اور میں آنکھ بند کر کے سو جاؤں۔

اپنا ماتم

(از خطیب ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۵ء)

ازل کی صبح کو ابد نے رحلت کی۔ زیست نے آنکھ نہ کھولی تھی کہ مرگ زندہ ہو گئی۔
افسوس میں مر گیا۔ زندگی کے دریا میں ڈوبنے سے یہ واقعہ پیش آیا۔ موت کے ذرے
آب حیات میں حسن صورت سے گر آئے۔ اور میری روح قبض کرنے لگے۔ میں ان
کی فانی ہونے کا خیال کر کے ڈرتا تھا۔ انہوں نے خود مجھے فنا کر دیا۔

؎ پریمی احمد آبادی سے مراد ہے۔

اب سمجھا کہ میری پیدائش کا مدعا عشق کی اسیری تھی۔ عشق نامدار ہے۔ اپنے طلبگاروں
کو گمنام کرتا ہے۔ اس واسطے میرے ماتم کا کہیں چرچا نہیں۔ اور میں خود اپنا ماتم کرتا ہوں۔
میں جاتا ہوں اور حسن مجازی کی شورشوں کو ورثہ میں چھوڑتا ہوں تاکہ کائنات میں
حشر تک قیامت برپا ہوتی رہے۔

اس عشق کی آگ نے میری آنکھوں کی گنگا جمنا خشک کر دی۔ میں دم توڑتا ہوں
گنگا جمنا کی وادیاں اپنی ہستی کے بچاؤ میں الجھ جاتی ہیں۔ مجھ پر آنسو بہانے کی انکو
فرصت کہاں۔ میری موت نے ان سب صحراؤں اور لق و دق بیابانوں اور کوہستانوں
کو سنسان کر دیا جن کی آبادی میرے دم سے تھی۔ وہ بے دم بیہوش اور بے خود ہو گئے
ورنہ ضرور میرے غم میں گریبان چاک کرتے۔ ہمالہ جس کو میرے عروج حیات نے آسمان
تک پہونچایا تھا۔ اور اپنی چوٹی کی سفیدی میں آلام کی سیاہی کو چھپایا تھا۔ میرے
سرنگوں ہوتے ہی اپنے وجود کی فکر میں پڑ گیا۔ برف گھبرا کر پگھلنے لگی۔ بلندیاں ٹوٹ کر
گرنے لگیں۔ پس میرا رنج وہ بھی بھول گیا۔

تو آ عبدالرحمن؎۔ اپنا ماتم میں خود کروں کہ میں کیوں مرا۔ اور کیوں دنیا کے
قبرستان میں آیا۔ کاش میں ذات وحدت کی گود میں ہمیشہ زندہ رہتا۔ اور کن
کے مرض سے میرا سامنا نہ ہوتا۔ اب ہو گیا تو صبر میرا ماتم ہے۔

روح کا خول

(از اسوۂ حسنہ نومبر ۱۹۱۵ء)

تربوز کا چھلکا سبز۔ گودا سرخ۔ مزہ جو اسکی روح ہے میٹھا۔ مگر مٹھاس کی شکل دیکھی
نہیں چکھنے سے جانی۔

آم کا چھلکا سبز۔ رس زرد۔ مزا شیریں۔ وہی اس کی جان ہے جس پر آدمیوں کی

؎ عبدالرحمن پشاوری سے مراد ہے۔

جان قربان ہے۔ چاہتے سب جان و روح کو ہیں۔ مگر ہاتھ میں فقط اس کا خول آتا ہے۔ کمہاری ایک چھوٹا سا پَردار کیڑا ہے۔ بھڑ سے ذرا دُبلا پتلا۔ گھروں میں گیلی مٹی سے اپنا گھونسلا بناتا ہے۔ اور اس میں جھینگر مار کر اس کی لاش چھپا دیتا ہے۔ اور وہاں وہ میں خود بیٹھ کر روح کے خول کو توجہ دیتا ہے۔ چند روز میں اس کے مراقبہ کی طاقت جھینگر کو زندہ کر دیتی ہے۔ اور صحبت ہمنشین کا اثر ہے۔ روح جھینگر کو خوبصورت کمہاری کی شکل بنا دیتا ہے۔ اور جھینگر کمہاری بن کر اُڑ جاتا ہے۔

توجہ اور مراقبہ کی یہ برکت دیکھ کر اور جسم کی ماہیت میں یہ انقلاب مشاہدہ کر کے میں نے ایک دن جو ستمبر ۱۹۱۵ء کا آخری حصہ تھا۔ شملہ کے پہاڑ پر اپنے خول کا مراقبہ شروع کیا۔ اور اپنی لاش پہ نظریں جمائیں۔

کمہاری نے جس دن جھینگر کا شکار کیا۔ اور اس کے ڈنک مارے تو اس کی تڑپ اور پھڑک سے ایک لالہ صاحب کا جی بہت دُکھا تھا۔ اور انہوں نے کمہاری کو ہتھیارا جانور کا خطاب دیا تھا۔ اور میں نے بھی جو اس وقت تک خواجہ حسن نظامی تھا مظلوم جھینگر کو بچانے کی بہت کوشش کی تھی۔

یہ واقعہ آج پیش آیا۔ میرے خول کو میرے مرنے کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور اس کے صدمے میں نے بھی ہمدردی ظاہر کی۔ مگر جو نعمت مجھ کو اس فرقت و زحمت میں نظر آئی تھی۔ اس سے اوسان درست تھے۔ اور اطمینان سامنے تھا۔ اس لئے میں نے اپنے خول سے رسماً غم خواری کا اظہار کیا۔ اور اس کی وہ کہانی سن لی جو اس نے دم توڑتے وقت جی بہلانے کو مجھ سے کہی۔

نشہ کی کہانی

پہلے میرے خول نے ایک ایسی کہانی کہی جس کو میں سگرات کے نشہ کی نشانی سمجھا۔ اور میں پہاڑ کے ایک پیارے پھول کی پنکھڑی پر لیٹ گیا۔ اور اس کی بہکی بہکی باتوں میں

کی ستانت اور مسکراہٹ سے سننے لگا۔

خول نے کہا۔ برا ہو اس عبادت کا جس نے چڑیا کی جان لی۔ خواجہ پیارے آج سے دس ہزار برس پہلے اس پہاڑ پر ایک جھونپڑی تھی۔ جس میں ایک عبادت گزار جوگی رہتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے خیال کو خالق کے خیال سے لگایا اور چاہا کہ اس کا نور دیکھے کہ ایک چڑیا۔ چرچراتی پروں کو پھیلاتی۔ پھدکتی۔ چیں چیں کرتی اس کی جھونپڑی میں آ گئی۔ چڑا اس کے ساتھ تھا۔ اس نے اپنی لیڈی سے محبت کی گفتگو شروع کی۔ اور کہا پیاری دانہ چاک چکیں۔ آؤ۔ اس فقیر کی تونبی پر چل کر بیٹھیں۔ جس میں یہ پانی پیتا ہے۔ اور باتیں کریں۔ چڑیا اُچھلی۔ اور مستانہ ادا سے دو تین جھونٹے ہوا میں کھائے اور تونبی پر جا بیٹھی۔

چڑے نے کہا۔ یہ آدمی کیا چاہتا ہے؟ چڑیا بولی اپنے خول کی خواہشوں سے دوگزرا اور روح تک رسائی چاہتا ہے۔ چڑا چہچہا کر بولا۔ دیوانہ ہے۔ خول ملا ہے تو اس کی خواہشوں کو بھی پورا کرنا پڑے گا۔ روح خواہشوں کے بعد تھوڑی سے جوگی کو سوائے چیں چیں کے غل کے اور کچھ سنائی نہ دیا۔ اور اس نے اپنا ڈنڈا اٹھا کر ان دونوں پر کھینچ مارا۔ جو چڑے کے سر میں لگا۔ اور وہ بیچارہ تڑپ کر زمین پر گر پڑا۔ اور مر گیا۔ چڑیا یہ دیکھ کر پھر سے اُڑ گئی۔ اور باہر درخت کی ٹہنی پر جا بیٹھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتی تھی۔ اور اپنے خول کے بچ جانے پر شکر کرتی تھی۔ مگر تھوڑی سی دیر کے بعد اس کے دل کو شوہر کی محبت نے بے قرار کیا۔ وہ الفت کے غم میں اندھی ہو گئی اس کی روح اپنے خول میں سر پٹنے اور پھڑپھڑانے لگی۔ جس کے صدمے سے اس کا خول بھی حرکت میں آ گیا۔ اور روح کے اندر کے اشارہ سے مجبور ہو کر چڑیا پھر جھونپڑی میں چلی گئی۔ وہاں اس کے غریب چاہنے والے چڑے کی لاش خاک پہ پڑی تھی۔ اور فقیر اپنے خول کو توجہ دے رہا تھا۔ چڑیا نے آہ و نالے شروع کئے۔ کبھی وہ تونبی آتی۔ کبھی جھونپڑی کے

بالس پر جاتی۔ اس کی زبان تالوے لگنی تھی۔ وہ چیختی تھی اور بلبلاتی تھی۔

جوگی کے خیال میں پھر رخنہ پڑا۔ اس نے ایک اور جست کی اور چڑیا کو بھی ڈنڈے سے مار ڈالا۔

عاشق و معشوق کی لاشیں اٹھا کر جھونپڑی کے باہر پھینکدیں۔ اور ایک لمبا سانس لیکر جس سے تضیع اوقات کا صدمہ ظاہر ہو رہا تھا۔ پھر مراقبہ میں بیٹھ گیا۔

باہر چڑے چڑیا کے جنازے رکھے تھے۔ اندر جوگی اطمینان سے گردن جھکائے بیٹھا تھا کہ نورِ حق ہاتھ میں شعلہ کی تلوار لئے نمودار ہوا۔ جوگی اس کو دیکھ کر سجدہ میں گر پڑا۔ اور اس کی روح اپنے مرکز پر قربان ہونے کو خول میں پھڑپھڑانے لگی۔

مگر نورِ حق نے جوگی کے خول پر شعلہ کا ایک ہاتھ مارا۔ اور کہا میری چڑیوں کا خون کیا، جو فطرت کا سبق سنانے تجھ تک آئی تھیں۔ ان میں زندگی تھی۔ وہ نسل بڑھانے کے دو چلے تھے۔ تیرے ترک وجود سے ان کا رتبہ بڑا تھا۔

جوگی کے خول نے عاجزی سے معافی مانگی۔ مگر اندر کی روح نے اپنے باپ نورِ حق کو ترشی سے جواب دیا۔ اور کہا۔ مجھ کو یہاں قید کر کے آپ آزاد رہنا چاہتا ہے۔ تو بھی تو اس قفس کا مزا چکھ۔ دنیا میں تھوڑے پنجرے ہیں۔ جن کے اندر کی ارواح تیری فطرت کا مانتی ہیں۔ ایک میں اگر تعمیل نہ کروں تو کیا نقصان ہوگا۔

نورِ حق نے یہ سنکر اندر کا سانس لیا۔ اور جوگی کی روح ایک سناٹے کیساتھ ہاتھ پھیلائے کھنچکر اُڑی اور نورِ حق میں سما گئی۔

جوگی کا خول پڑا رہ گیا۔ اور چڑیوں کے خول سے زیادہ اس نے اس جنگل کو بدبودار کیا۔ جب میرا خول یہ تمثیلی کہانی کہہ چکا تو میں نے کہا۔ کہہ چکا یا کچھ باقی ہے۔ عبرت۔ میں تجھکو سڑنے سے بچاؤں گا۔ اور اس جنگل کو تیری بدبو سے آلودہ نہ ہونے دونگا۔ اس وقت وہ خول بولا۔ اب میں ہوشیاری کی ایک کہانی کہنی چاہتا ہوں۔ اُسکو

سن لے۔ پھر جو تیرا جی چاہے کر۔

میں نے پھول کی پنکھڑیوں کو اپنے اوپر لپیٹ کر آنکھیں خول کی طرف پھیر لیں۔ اور اس سے کہا۔ پہلے یہ تو بتا کہ اس دنیا نے تیری کیا قدر کی۔ جو تو دنیا میں بنے پر اتنا اصرار کرتا ہے۔ اور اس کی امیدوں کی اسیری پر فدا ہو جاتا ہے۔ ناحق مثالیں دیکر مجھکو گرفتار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں جبتک تجھ میں تھا ایک اچھا لکھنے والا۔ اور اردو زبان میں ایک نئی روش ایجاد کرنے والا سمجھا جاتا تھا۔ جو قلم سے ظاہر ہوتی تھی۔ یا کبھی کوئی سامنے آکر اس کو ادا کرتا تھا۔ تو جانتا ہے کہ اس وقت مجھ پر کیا حالت گزرتی تھی میں الفاظ پرست خولوں کی یہ تعریف سن کر بگڑتا تھا کہ یہ ایسے اندھے کیوں ہیں۔ جو میری اس شان کو بیان نہیں کرتے۔ جس پر مجھ کو نورِ حق نے اقتدار دیا ہے۔ نورِ حق سے میں جو کہتا ہوں وہ سُن لیتا ہے۔ اور اس کو پورا کر دیتا ہے۔ میں نے جس کی سفارش کی۔ نورِ حق نے کبھی اس کو نہ ٹالا۔ یہی نہیں۔ نورِ حق نے اپنے طلسمی رنگا رنگ جلووں کو میرے پاس تنہا چھوڑ دیا۔ اور میں نے ان میں خوابگاہ بنائی۔

اے خول آدمیوں کے جیل خانہ میں جی نہ لگا۔ یہ آدمی رشک کرنے لگتے ہیں۔ جب کسی کے پاس کچھ دیکھتے ہیں اور اگر انسان کو اپنے خول سے محبت ہو تو دوسروں کا رشک و حسد اس کو تکلیف دیتا ہے۔ کیا تو نے پایا کہ دنیا میں کتنے تیرے حاسد ہیں۔ اور ان کی مکارانہ کینہ وری سے تجھ کو کیسے کیسے صدمے اُٹھانے پڑے۔ اگر تو اپنی خواہشات خاکی کو فراموش کر دے۔ اور میرے مراقبہ و توجہ کے آگے سر جھکا دے تو تیری یہ ساری تکلیفیں دور ہو جائیں گی اور تو دنیا کے سب خولوں کا سرتاج بن جائے گا۔ مگر تجھ میں سرتاج بننے کی خوشی نہ ہوگی۔ کیونکہ سرتاجی واہمہ و شکیہ کے جذبات کی فنائیت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ جب یہ جذبات بھی نہ ہوں گے۔ تو تجھ کو اس کی خوشی نہیں ہو سکتی۔ البتہ تجھ کو نورِ حق سے وہ انعام ملیں گے جن کے سامنے دنیا کی سب

خوشیاں ہیچ اور بے نتیجہ ہیں۔

بیرے خول نے یہ سنکر کہا۔ اچھا تو میری کہانی سن۔ اس کے بعد فیصلہ ہوگا۔

جڑی بوٹی کا شہید

چادرِ جنگل کے مزمل سُن۔ کھڑا ہو۔ قدرت کی حقیر اولاد۔ جو ایک دن میں پیدا ہوتی بڑھتی پھولتی پھلتی۔ اور مرجھا کر فنا ہو جاتی ہے جس کا نام گھاس ہے۔ بناس پتی ہے۔ جنگل کی جڑی بوٹی ہے۔ اور جو تیری گلکار سہیلیوں کے دامن خاک سے سر لگائے چپ چاپ کھڑی ہے۔ بڑی قاتل ہے۔ سفاک ہے۔ بڑی دولت والی ہے۔ اسیری کی کنجی ہے۔ بڑی طبیب ہے۔ امراض کی موت ہے۔ بڑی زندگی ہے۔ حیات کی روح رواں ہے۔

ایک پہاڑ کے نیچے میدانی زمین میں ایک راجہ رہتا تھا جس کا ایک ہی بیٹا تھا اس کا نام اندر جوت تھا۔ اس کی عمر سولہ برس کی تھی کہ باپ مر گیا۔ اور گدی اس کے ہاتھ آئی۔ اندر جوت کی رانی کنولا چودہ برس کی اور اندر جوت سے صورت شکل میں ذرا گھٹیا تھی۔ اندر جوت اپنے زمانہ کا کنہیا تھا۔ اس کے حسن کی دھاک دُور دُور تھی۔ اسکو اپنی خوبصورتی پر گھمنڈ بھی تھا۔ سب سے بڑی سندرتا (خوبصورتی) اس کی آنکھوں میں تھی۔ اندر جوت ان کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ مگر جس کو دیکھتا تھا۔ جس چیز پر نظر ڈالتا تھا اسیں اپنی آنکھوں کی طاقت کو مشاہدہ کرتا تھا۔ کیونکہ آدمی ہو یا جانور۔ پتھر ہو یا درخت اس کی آنکھوں کے پرتو سے شرما جاتے تھے۔ یا اندر جوت کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سامنے والی چیز اس کی آنکھوں کے رعب حسن سے جھک گئی ہے اور بے قابو ہے۔

کنولا اپنے پتی (شوہر) سے بہت کم تھی۔ مگر اس کے دل میں بھی خدا نے ایسی کشش دی تھی کہ اندر جوت اس کا والہ و شیدا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ اندر جوت کنولا کو لے کر دیبی کے درشن کو گیا۔ جو پہاڑ کے دامن میں براجمان تھی۔ راستہ میں اس کو ایک پودنا جنگلی جھاڑی پر نظر آیا۔ جس کے سرمئی پیارے رنگ کے سامنے اس کی بدصورت پودنی بہت بُری معلوم ہوتی تھی۔ اندر جوت نے کنولا سے کہا کہ پودنا اس بدشکل جوڑے سے کیونکر خوش رہ سکتا ہوگا۔ کنولا بولی جس طرح تم میرے ساتھ۔ یہ سنکر اندر جوت ایک خیال میں پڑ گیا اور اس کو اپنے حُسن کے غرور نے تھوڑی دیر بے خود بنائے رکھا۔

اندر جوت دیبی کے درشن کرکے واپس آرہا تھا کہ ایک مور دکھائی دیا۔ جو اپنے جمال حسن کا لباس پہنے اپنی کالی کلوٹی بے قرینہ مورنی کو اپنا ناچ دکھا رہا تھا۔ اندر جوت کو پھر پودنے کا خیال آیا۔ اور اس نے کنولا سے کہا۔ یہ بڑا بے وقوف ہے۔ ایسی بدشکل بیوی پر عاشق ہوا ہے۔ پودنا اور مور اور شاید میں تینوں عقل سے دور ہیں۔ میں تجھ سے چار مہینے بات نہ کروں گا۔ جبتک اس کا بھید مجھ کو معلوم نہ ہو جائے۔

کنولا بڑی عقلمند لڑکی تھی۔ اس نے اندر جوت کے اس بچپن سے بُرا نہ مانا۔ اور کہا۔ کچھ ہرج نہیں۔ تم اس کو سوچو اور تحقیق کرو۔ اور چار مہینے مجھ سے الگ رہ سکتے ہو تو رہو۔ میں تم کو اجازت دیتی ہوں۔

اندر جوت یہ سنکر بگڑا۔ اور کہا۔ تم کو اجازت دینے نہ دینے کا کچھ اختیار نہیں میں نے اپنی خود مختاری سے یہ ارادہ کیا ہے۔ اور اپنے ہی اختیار سے اس پر عمل کروںگا تم میری تابعدار لونڈی ہو۔ مگر بہت بدصورت ہو۔ تم میرا جوڑا نہیں ہو سکتیں۔ تم میری آنکھوں کی جوت تک کو نہیں سہار سکتیں۔ اور میرے نگاہ بھر کر دیکھتے ہی نظریں جھکا لیتی ہو۔

کنولا بولی جو کچھ تم نے کہا سچ ہے۔ میں انکار نہیں کرتی۔ تم چار دن سے زیادہ اپنے ارادہ کی خود مختاری پر قایم رہ جاؤ تو غنیمت ہے۔ مجھکو خدا نے حسن نہیں دیا۔ تو دوسری نعمت دی ہے۔ جو تم کو میسر نہیں۔

اندر جوت۔ وہ کیا نعمت ہے!

کنولا۔ تمہیں سوال کرنے کا کچھ اختیار نہیں۔

اندرجوت۔ میں پوچھتا بھی نہیں۔

اتنے میں گھر آگیا۔ اور یہ دونوں علیحدہ علیحدہ حویلیوں میں اُتر کر چلے گئے۔ کنولا نے حویلی میں جاتے ہی ماما کو اپنے گرو کے پاس بھیجا۔ جس نے سارا قصہ ان سے کہا۔ گرو صاحب بڑے عالم اور دنیا کے حال سے خبردار تھے۔ انہوں نے ماما کو دھتکار نکال دیا۔ اور کہا۔ میں کیا کروں۔ میاں بیوی کے قصہ میں دخل دینے کا مجھے کچھ حق نہیں ہے۔ جا کنولا سے کہہ دیجو کہ آئندہ مجھ سے اپنے گھر کے جھگڑے بیان نہ کرنا۔

ماما بھی ہوئی کنولا کے پاس آئی۔ اور گروجی جنگل گئے۔ اور وہاں انہوں نے سات کنکروں پر کچھ دم کیا۔ اور نالے میں ڈال دئے۔ اُدھر کنولا کو گروجی کے برتاؤ سے اتنا رنج ہوا کہ اُس نے ہیرے کی کنی کھانے کو منگائی۔ مگر فوراً اس کے دل نے کہا کہ جو تعلیم گروجی نے مجھ کو دی ہے۔ اس میں صبر کا بڑا درجہ ہے۔ "سنتوش پرم لابھ" (صبر میں بڑا نفع ہے) رام چندرجی کا قول ہے۔ پس مجھ کو بھی اپنے کلیجہ پر پتھر رکھنا چاہیئے۔ دیکھئے غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

کنولا اسی خیال میں تھی کہ اندرجوت آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے اس کے پاس آیا۔ اور اس کے پیروں میں گر پڑا۔ کنولا نے کہا خیر ہے تم میرے پتی اور مالک ہو۔ اور میں تمہاری ادنیٰ لونڈی۔ یہ کیا کرتے ہو؟

اندرجوت بولا۔ میں نے غلطی کی۔ جو تم سے ایسی سخت باتیں کیں۔ خدا نے میرے دل کو روشنی دی اور میں نے تمہاری شان پہچان لی۔ اب میں کبھی اس کی قدرت میں دخل نہ دوں گا۔

کنولا حیران تھی کہ یہ کیا انقلاب ہوا۔ اتنے میں دیکھا کہ گروجی ہاتھ میں ایک بوٹی لئے چلے آتے ہیں۔ انہوں نے وہ بوٹی اندرجوت کو دی۔ اور کہا لے اسکو اپنی

آنکھ پر رکھ۔ اندرجوت نے اس پتہ کو اپنی آنکھ سے لگایا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ کنولا ایک نور کا پتلا ہے۔ اور اس قدر حسین ہے کہ اندرجوت نے اس سے پہلے کبھی ایسی خوبصورت عورت نہ دیکھی تھی۔ اس کے بعد گروجی نے کہا۔ نادان نظر کے دھوکے میں نہ پڑ۔ اس دنیا میں جو بدصورت ہیں ان کو قدرت کی آنکھ سے دیکھیگا تو اچھی شکل میں پائے گا۔ مورنی اور پودنی خاکی آنکھوں میں بدنما ہیں۔ مگر مور اور پودنے کی حقیقت شناس نگاہوں میں بے حد خوشنما۔

اندرجوت کو حیرت تھی کہ گروجی کو ہمارے مخفی قصہ کی کیونکر خبر ہوگی۔ اور ان کی کرامت کا قایل ہوگیا۔

اب اندرجوت گروجی کے پاس روزانہ جانے لگا۔ اُس کو جڑی بوٹی کے علم کا عشق ہوگیا تھا۔ گروجی نے بھی اس کے شوق کے موافق بوٹیوں کے صد ہا خواص سکھائے۔

کایا پلٹ بوٹی

ایک دن گروجی نے اندرجوت کو کایا پلٹ بوٹی بتائی۔ اور کہا اس کو اگر ہاتھ پر باندھ لیا جائے تو انسان اپنی روح کو جسم سے نکال کر آزاد کر سکتا ہے۔ اور روح کو جہاں چاہے سیر کرنے کو بھیج سکتا ہے۔ اور پھر جب جی چاہے واپس بلا سکتا ہے۔

اندرجوت نے کہا۔ پھر دوبارہ اپنے جسم میں بھی ڈالنا ممکن ہے یا نہیں۔ گروجی بولے کیوں نہیں۔ یہ نہ ہو تو کمال ہی کیا ہوا۔ مگر شرط یہ ہے کہ روح کو کسی ایسی جگہ نہ بھیجے جہاں سے وہ الٹی نہ آسکے۔

اندرجوت۔ وہ کونسا مقام ہے جہاں سے روح واپس نہیں آتی؟

گروجی۔ خدا کی جھولی جس میں ارواح رہتی ہیں روح کا پسندیدہ مقام ہے۔

اندرجوت۔ وہاں مجھے بھیجنے کی کیا ضرورت ہوگی۔ میں کبھی وہاں نہ بھیجوں گا۔

گروجی۔ نہیں یہ بات تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ دیکھو جو لوگ کسی نیک کام کی حمایت میں مارے جاتے ہیں۔ ان کی روحیں خدا کی ذات کے قریب ایک نورانی قندیل میں چلی جاتی ہیں۔ اور وہاں ان کو ایسا مزا ملتا ہے۔ جو دنیا کے کسی سرور کے مشابہ نہیں ہے جس کو تم سمجھ سکو۔ بس یہ خیال کرو کہ وہ بہت ہی بڑا لطف ہے۔ جو خدا کی ذات میں فنا ہونے سے پہلے اس مادی دنیا میں ارواح کو میسر آتا ہے۔

اگر تم نے کایا پلٹ بوٹی سے اپنی روح کو اپنے خول سے الگ کر لیا۔ اور کہیں سیر کرنے کو بھیجا تو وہ ضرور آزادی کی ہوا سے سرشار ہو کر اپنی شہید روحوں کی قندیل میں جائے گی۔ اور وہاں گئی تو پھر کبھی نہ آئے گی۔

اندرجوت۔ جب اس قندیل میں آپ کے فرمانے کے بموجب بہت سرور حاصل ہوتا ہے تو میں اپنی روح کو واپس کیوں بلاؤں گا۔ اچھا ہے کہ وہ ہمیشہ وہاں رہے۔ جہاں اس کو راحت اور چین ملتا ہو۔ اس دنیا کی تکلیف اور بے مزہ زندگی سے تو وہ لاکھ درجے بہتر ہے۔

گروجی۔ یہ سچ ہے۔ مگر قندیل مبارک میں غیر شہید روح کو رہنے کا حکم نہیں ہے۔ جو روح جسم کی شہادت کے بغیر محض سیر کے لئے وہاں چلی آتی ہے۔ تو چند روز کے مزے کے بعد ایک دھکہ لگ جاتا ہے اور پھر دنیا کے کسی ناپاک جسم میں ڈال دی جاتی ہے۔ اور قید کی تکلیف اٹھاتی ہے۔

اندرجوت۔ پھر کسی نیک کام میں شہید ہو کر اپنی روح کو قندیل مبارک میں کیوں نہ بھیجوں

گروجی۔ وہاں ایسا کروگے۔ تو ہمیشہ وہاں رہوگے۔

اندرجوت۔ بتائیے کہ وہ شہادت کونسی ہے؟

گروجی۔ خدا اور اس کے علم کی تلاش میں اگر آدمی مرجائے تو اس کی روح قندیل مبارک میں چلی جاتی ہے۔ کسی مظلوم کی حمایت میں مارا جائے تو اس کو یہ درجہ ملتا ہے۔

لیکن اے اندرجوت اگر تو جسم کی قید میں رہ کر اپنی خواہشوں پر قابو رکھے اور خدا کی دی ہوئی طاقتوں کو نیک کام میں صرف کرے۔ اور نفس کی دشمنی پر فتح پائے تو کسی موت مرے قندیل مبارک میں تیری روح کو جگہ دی جائے گی۔ اور تیرا نام شہیدوں میں لکھا جائے گا۔ دیکھ جس زمانہ میں اچھی باتوں کی بے قدری ہو جائے۔ اور خلقت نیکیوں کو عقل اور آرام کے خلاف سمجھنے لگے۔ اس وقت میں اگر کوئی شخص ایک نیکی کو بھی زندہ کرے گا۔ تو اس کی روح کو مرنے کے بعد قندیل حق میں اونچی جگہ دی جائے گی۔ اندرجوت نے گروجی سے یہ سن کر اپنے وقت کے دو حصے کئے۔ ایک میں وہ اپنی حکومت کے کام کرتا تھا۔ اور مظلوموں کی فریاد سنتا تھا۔ اور دوسرے میں جڑی بوٹیوں کی تحقیقات کرتا تھا۔ اور کنولا بھی اس کے شریک حال رہتی تھی۔ ایک روز وہ کنولا سمیت ایک بوٹی کی تلاش میں پھر رہا تھا کہ اس کے پاؤں میں ایک سانپ نے کاٹا۔ کنولا سانپ کو پاؤں سے چھڑانے لگی۔ کیونکہ وہ انگوٹھے کو چمٹ گیا تھا۔ تو سانپ نے کنولا کے ہاتھ میں بھی کاٹ کھایا۔ سانپ ایسا زہریلا تھا کہ دونوں وہیں پانی ہو کر بہہ گئے۔ مگر ان کی ارواح فوراً قندیل مبارک میں اڑ کر چلی گئیں۔ جہاں ان کا ارواح نے بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا۔ اور یہ دونوں ابدی اور کامل عیش سے وہاں رہنے لگے۔

لہٰذا تو بھی اے میری روح ایسا ہی کر۔ اور مجھ خول میں مقید رہ کر نیک کاموں میں مصروف ہو۔ تاکہ شہیدوں کی قندیل حق تک رسائی پائے۔ یوں خواہ مخواہ مجھ کو ترک کرنے اور غیر فطری آزادی سے تجھ کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔

میں نے اپنے خول کی کہانی سن کر قہقہہ لگایا۔ اور کہا دیوانے تو نے اپنے خاکی جذبات کے مطابق قندیل حق کو بھی عیش خانہ سمجھا۔ کوئی اور مثال دی ہوتی۔ مگر دیکھا کیونکر تیری عقل کا عروج تو خواہشات و لذات نفس تک ہے۔

خول۔ نہیں میں نے کہا ہے کہ قندیل مبارک میں جو سرور ارواح کو ہوتا ہے اُسکی مشابہت ہماری دنیا کی کسی چیز سے نہیں ہے۔ صرف بچے کو کسی دنیاوی لطف سے نسبت دے سکتے ہیں۔

میں۔ خیر اگر تو نے یہ کہا بھی تب بھی میں خیال کرتا ہوں کہ تیری پرواز فانی لذتوں سے آگے نہیں ہے۔ میں قندیل حق میں شہید ہو کر جانا پسند کرتا ہوں۔ مگر اس لئے نہیں کہ وہاں مجھکو دوسری ارواح کے ساتھ عیش و راحت نصیب ہو۔ وہاں میرا کام یہ ہوگا کہ سب ارواح کو قندیل کی قید کا دکھ بتاؤں۔ اور ان سے کہوں کہ تم سب جدوجہد کرو اور اس محدود حیات سے نکل کر ذات الٰہی کی نامحدود ہستی میں فنا ہونے کی کوشش کرو۔ کیونکہ قید تعین میں خواہ ہم کو کیسا ہی لطف ہو۔ پر وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔ جو محویت و فنائیت ذات میں ہو سکتی ہے۔

اگر میں قندیل حق کے بعد بہشت میں گیا۔ تو وہاں بھی جب مجھے یہ سوال کیا گیا کہ کس قسم کا عیش چاہتا ہے تو آزادیِ بیانِ حق کی طلب کروں گا۔ اور جنت والوں کو بہکاؤنگا کہ وہ بہشت کے جیل خانہ سے نکلیں اور موج الوہیت کی غرقابی خدا سے مانگیں۔

اے خول میں تجھ سے نفرت نہیں رکھتا۔ میں تجھ سے جدا نہیں ہوتا۔ میں کوئی کام ایسا نہیں کرتا جو قانونِ اسلام اور قانونِ دنیا کے برخلاف ہو۔ میں تجھکو کسی قسم کی مادی اذیت نہیں دیتا۔ مجھ کو یہ بھی منظور نہیں کہ فطرت کے مقررہ وقت سے پہلے تجھ سے الگ ہو جاؤں یا کسی اور کو ایسا کرنے کی نصیحت کروں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تجھ سے جدا ہو کر ذرا اپنے اور تیرے حالات کا مطالعہ کیا کروں۔ جب تک تجھ سے جدا نہ ہوں گا۔ سمجھ نہیں سکتا کہ تو کیا ہے۔ اور میں کیا ہوں۔ تو کس حال میں ہے اور میں کس حال میں ہوں تجھے کیا کرنا چاہئے اور مجھ پر کیا کیا فرائض ہیں۔

میرے مٹی کے پتلے! تیری دید کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ تیرے اندر بند رہکر تو ہی بتا

فطرت کی مخفی سلطنت مجھ پر حکمران تھی۔ تم جان سکتے ہو کہ محکومیت میں خودی کہاں رہ سکتی ہے۔ اس میں تو ہر ہستی بے خود رہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ تم انسانوں کے حالات پر غور کرنے اور ان میں دخل دینے کی صلاحیت رکھتی ہو!۔

روح مگس۔ ہاں اسوقت تو میرا ادراک ارواح انسانی کے بہت قریب ہو گیا ہے۔ میں بہت کچھ سمجھ سکتی ہوں۔ اور دیکھتی ہوں کہ مجھ میں سمجھانے کی بھی صلاحیت موجود ہے۔

اچھا تم کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نامی ایک مشہور شاعر نے آج کل ایک کتاب لکھی ہے۔ اور اس میں جسمانی و نفسانی خودی کو قائم کرنے اور دنیا کے تعلقات سے محبت بڑھانے کی تاکید کی ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ خودی کو مٹاتا اور تعلقات دنیا سے بے رغبتی سکھاتے ہیں، وہ بڑے ہی احمق اور بے وقوف ہیں۔

روح مگس۔ ہاں ہاں، میری بصیرت اس مثنوی کو صاف دیکھ رہی ہے۔ جس کا نام اسرار خودی رکھا گیا ہے۔ اور جس میں حکیم افلاطون اور لسان الغیب حضرت حافظ شیرازی کو نہایت سخت حقارت سے یاد کیا ہے۔ اور ان کی پیروی کو خطرناک بتا کے آدمیوں کو اس سے روکا ہے۔

اچھا جب تم اس مثنوی کو دیکھ رہی ہو۔ اور اس پر اتنی حاوی ہو گئی ہو کہ تم نے اس کے مضامین بھی بتا دئے۔ تو بتاؤ حضرت حافظ شیرازی کی روح اس توہین کی نسبت کیا خیال کرتی ہے؟

روح مگس:۔ یہ سوال میری حالت سے بہت اونچا ہے۔ اب مجھ کو جانے دو کہ آزادی کے بعد عجیب قسم کی تمنائیں مجھ میں پیدا ہوئی ہیں۔ اور ان کا تقاضا ہے کہ میں اس عالم سفلی کے ہر تعلق سے جلدی کنارہ کش ہو کر ان آرزوؤں کی جانب متوجہ ہوں۔

یہ سنکر میں نے دوسری مکھی کی روح کو بھی رخصت کیا۔ اور تیسری روح کو روک کر گفتگو شروع کی۔

وہ جان بوجھ کر ہی ہمیشہ موت و ہلاکت کے منہ میں جاتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ شراب سے لاکھوں آدمی تباہ ہو گئے۔ سب کی آنکھوں کے سامنے اس کی مثالیں پیش آتی ہیں۔ مگر پھر بھی خلقت شراب خواری سے باز نہیں آتی۔ ہر ایک کو معلوم ہو گیا ہے کہ کوکین کھانے والا آدمی چند روز میں گھل گھل کر مر جاتا ہے۔ اس کا مال تباہ ہو جاتا ہے۔ اس کی آبرو خراب ہوتی ہے۔ حکومت جیلخانے بھجواتی ہے۔ مگر ہوس کی نابینائی اس کو کوکین سے باز نہیں رہنے دیتی۔ اور وہ دیدہ و دانستہ موت و بربادی کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

یہی حال قمار بازی کا ہے۔ عیاشی کا ہے۔ اور ہر اس چیز کا ہے جس میں جسمانی و روحانی خطرے ہیں۔ جب عقلمند آدمی نہیں بچتا اور نہیں دیکھتا تو مکھی بیچاری کس گنتی میں ہے۔ وہ مگس مکھی کی لاشوں سے کالا ہو گیا۔ میرا دل اس قتل عام کی سفاکی سے ہانپنے لگا۔ تو میں نے اپنی گردن پورے چار گھنٹے کے بعد اوپر سے ہٹائی اور مکھیوں کی ارواح سے گفتگو کی ٹھہرائی۔

روح مگس نمبر ایک

جس وقت اجل کا ہاتھ ایک مکھی کی روح کو مٹھی میں لیکر چلا تو میں نے دامن کو پکڑ لیا۔ اور پوچھا۔ کیا مجھکو اجازت ہے کہ چند باتیں آپ کے قیدی سے دریافت کروں! دست اجل نے ذرا تامل کے بعد جواب دیا۔

قدرت نے مجھکو اس کا اختیار نہیں دیا ہے۔ لیکن اے آدمی تیری انسانی عظمت کے سامنے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تو روح مگس سے مجھ کو روک کر سوال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ پوچھ جو تیرا جی چاہے۔

تب میں نے مکھی کی آزاد روح سے سوال کیا۔

تم قید جسم کے بعد اس حالت اور اس حالت میں کیا فرق دیکھتی ہو؟

روح مگس۔ وہ کیفیت مجھ کو محسوس ہوتی ہے جسکا سمجھنا محال ہے۔ پہلے میں تعلقات جسم کے پردوں میں ایسی بند تھی کہ باہر آنے کو میرا جی نہ چاہتا تھا۔ اور جانکنی کے وقت مجھ پر حسرتیں اور بے قراریاں برس رہی تھیں۔ مگر اب مجھ کو نظر آتا ہے کہ میں اپنے وقت کی ملکہ ہوں۔ دست اجل کی مٹھی میں ہوں۔ لیکن تمام کائنات میری آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آتی ہے۔ میری آنکھوں سے عالم کی کوئی شے پوشیدہ نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ موت پر میں ہزاروں بار صدقے اور قربان ہوں جس کی بدولت میں نے منزل راحت پائی۔

میں۔ کیا عالم علوی کو بھی مشاہدہ کرتی ہو؟

روح مگس۔ نہیں ابھی مجھ کو وہ بہت دور کچھ مٹا مٹا اور دھندلا دھندلا سا دکھائی دیتا ہے۔ میں اس کے وجود کو پاتی ہوں۔ مگر بیان کرنے اور تمیز کرنے کے قابل نہیں۔ صرف اتنا کہ اس کے موجود ہونے پر یقین کر سکوں۔

میں نے یہ سن کر دست اجل سے کہا کہ اچھا اس کو لے جاؤ۔ باقی سوال دوسری ارواح سے کئے جائیں گے۔ جب یہ روح غائب ہو گئی تو میں نے دوسری مکھی کی روح کو روکا۔

روح مگس نمبر دو

تم بتاؤ کہ اس وقت بے خود ہو یا خودی میں ہو؟

روح مگس۔ قید سے آزاد ہوئی۔ اب بے خودی کیسی۔ خودی میں ہوں۔ خودداری کا لطف اس وقت آیا ہے۔ حالت جسم میں دیکھنے کو باخود۔ آزاد۔ خود مختار تھی۔ مگر درحقیقت عالم سفلی میں اپنی حرص و ہوس کی غلام اور بے خود تھی۔ اور عالم علوی میں قانون قدرت کے زبردست دباؤ نے مجھ کو معطل کر رکھا تھا۔ نہ اپنے اختیار سے اڑتی نہ اپنی طاقت سے نقل و حرکت کرتی۔ نہ اپنے بل پر زندگی بسر کر سکتی۔ ہر چیز میں محتاج

کو جال میں پھانسنے پر کمر باندھ لی۔

یہ کاغذی جال گورے ملکوں سے آیا ہے۔ اس میں انگریزی حروف ہیں۔ اور بھورے رنگ کی ایک چپ دار چیز ہے۔ جب میں نے اس کاغذ کو زمین پر رکھا ایک بھولی نشۂ شباب کی متوالی مکھی جست کر کے اس پر آئی۔ اور جھپٹ مار کر ہوس کے پروں سے نیچے اُتری۔ قدم رکھا تھا کہ دام میں اُلجھ گئی۔ یہ حالت دیکھ کر اس نے چاہا کہ اُلٹے پاؤں بھاگے۔ اس واسطے وہ پھر بالائی جست کے لئے اُبھری۔ بھی۔ مگر پاؤں جال میں پھنس چکے تھے۔ اس نے ساڑھے چار سکنڈ توقف کیا۔ اور دم لے کر لگاتار اکیس سکنڈ اپنے پروں کو پھڑپھڑایا۔ اس وقت اس کے پاؤں قید تھے۔ لیکن جسم پروں کی طاقت پرواز سے بار بار جنبش کرتا تھا۔ پر ایسی تیزی سے ہوا میں لہریں لیتے تھے کہ ان کی شکل نظر نہ آتی تھی۔ آخر اکیس سکنڈ کے بعد قوت پرواز نے جواب دے دیا۔ پر شل ہو گئے۔ اور مکھی اپنے بائیں رخ جھکی جھکنا تھا کہ بایاں پر بھی جال میں پھنس گیا۔ اور مکھی آڑی ہو کر بے دم ہو گئی۔ تیس سکنڈ وہ چپ چاپ پڑی رہی۔ اور اس کے بعد پھر زندگی کی تمنا نے اُس کو آمادہ کیا کہ ایک بار اور جان بچانے کی کوشش کرے۔ اب کے اس نے مایوسانہ عالم میں اپنے بدن کو حرکت دی۔ اور ایک آخری چیخ بھی ماری جو مسلسل گیارہ سکنڈ ہوا میں گونجتی رہی۔ مگر ہائے اس میں بھی اُس کو کامیابی نہ ہوئی۔ اور فرشتۂ موت اس کے سامنے آ گیا۔ اور مکھی نے دنیا سے گزرنے کا تہیّہ کر لیا۔ وہ نہ چاہتی تھی کہ اتنے جلدی اس کو موت سے سابقہ پڑے۔ وہ اپنی عمر کو بہت دراز تصور کرتی تھی۔ اس کو خیال تھا کہ یہ دنیا ہمیشہ رہے گی۔ اور میں اس میں آخر تک پھنسی پھرا کروں گی۔ آج اس نے موت کا پیام سنا۔ جس نے اس کے ارمانوں میں کھلبلی ڈال دی۔ وہ چپ ہو گئی۔ اور موت کے فرشتے کو حسرت و یاس سے دیکھنے لگی۔

جب میں نے معلوم کیا کہ مکھی سکرات میں ہے۔ تو گھڑی کو جلدی سے ہاتھ میں لیا اور پھر سکنڈ شمار کرنے لگا۔ مگر یہ میری بڑی بھول تھی۔ اس وقت مجھ کو اپنی سکرات کی

مشکلات کا خیال کرنا تھا۔ جو ایک دن مجھکو پیش آئے گی۔

مکھی پر سکرات کا عالم ایک منٹ طاری رہا۔ اس کے بعد اس نے داعیٔ اجل کو اپنی روح دے دی۔ اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا انا للہ وانا الیہ راجعون ہم سب خدا کے ہیں اور آخر خدا ہی کے پاس جانا ہے۔

جتنی دیر میں اس نوجوان مکھی کے انجام کار کی دید میں مصروف رہا۔ اتنے عرصہ میں مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ دس بیس اور نئے وجود اسیر بلا ہو چکے تھے۔ اور تڑپ رہے تھے۔ غور کیا تو قریباً ہر مکھی اکیس سکنڈ تک کوشش پرواز اور سعیٔ رہائی میں مصروف رہ کر آخر بائیں جانب جھک جاتی تھی۔ اور اس کا بایاں پر مسالہ میں آلودہ ہو کر اس کو جان سے کھو دیتا تھا۔

اس کے بعد اور بھی تماشے دیکھے۔ بعض مکھیاں سرنگوں رہ گئیں۔ بعض ایسی آئیں کہ پاؤں رکھتے ہی خاموش ہو گئیں۔ ذرا جنبش نہ کی۔ ادھر مری کی مری رہ گئیں یہ شاید مسالہ کے زہر کا اثر ہو گا۔

نابینا حرص

میں نے دیکھا کہ سینکڑوں لاشیں مکھیوں کی پڑی ہیں۔ آزاد مکھیاں ان کو دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود جال میں آتی ہیں۔ اور جان بوجھ کر اسیر پنجۂ اجل ہو جاتی ہیں۔

دل نے کہا ان میں اتنی عقل نہیں ہے جو اس قتل خانہ کی حقیقت کو سمجھیں عجب کی صدا بولی نہیں۔ قدرت نے ہر جاندار کو موت و حیات کے خطرات کی تمیز عقل دی ہے مکھی اس سے محروم نہیں ہے۔ لیکن چونکہ حرص و ہوس کے آنکھ نہیں ہوتی۔ اسی واسطے یہ بچاری بھی اس کے ہاتھوں اندھی ہو کر موت کے منہ میں جا پڑتی ہے۔

انسان سے زیادہ کس کو عقل ملی ہے۔ کیا اس کے اندھے پن کو نہیں دیکھا کہ

اور انسانوں کی محفل عشق میں شاعر دونوں کانٹے ہیں۔ بلبل چمن میں آتا ہے تو پھولوں کی مستیاں اور خوش ادائیاں نالہ و فریاد کر کے خاک میں ملا دیتا ہے۔ پھول عالم شگفتگی میں اپنی نشیلی آنکھ کھولتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کا چاہنے والا بھی ایسا ہی محو۔ وخاموش ہو۔ سنجیدگی و متانت سے بہار کا حسن لوٹے۔ نہ کہ بلبل کی طرح چیخے چلائے۔ ہائے گل۔ ہائے گل کے نعرے لگائے۔ جبل نصیب ہو تو چرخ کی بیتاب بوسہ بازی سے برگ گل کو پاش پاش کر دے۔ شاعر محفل میں جاتا ہے تو کبھی اپنی افسردہ دلی سے ساری انجمن کو افسردہ کر دیتا ہے۔ کبھی اپنی زندہ مزاجی سے وا مجلسیاں میں برہمی ڈالتا ہے۔ کبھی ہنستا ہے۔ کبھی روتا ہے۔ غرض یہ بھی بلبل کی طرح آزار رسندہ ہے۔ خود تکلیف میں رہتا ہے۔ دوسروں کو تکلیف میں ڈالتا ہے۔

شکاری نے دام بچھایا۔ اور شورش کنندہ بلبل کو اسیر کیا تو جناب شاعر کا کیا نقصان ہوا جو شکاری کو کوستے ہیں۔ اور اسکی ہجو میں دفتر کے دفتر کالے کئے ڈالتے ہیں۔ خیر آج میں نے ایک ایسی چیز کے لئے دام بچھایا ہے۔ جو شاعر صاحب کو چہ عشق سے محروم ہے۔ بلکہ بعض اوقات انکی فکر شعر میں ہارج ہوتی ہے۔ دیکھوں اسکی اسیری کی نسبت بھی حضرت کے قلم میں کچھ حرارت آتی ہے یا نہیں:

یہ دام مگس کیلئے ہے۔ دام بھی بے نقطہ اور مگس بھی۔ شاعر صاحب کی بے نقطہ گالیوں کا اب کچھ اندیشہ نہیں۔ جو خود بے نقطہ ہوگا وہ دوسرے کی بے نقطہ صلواتوں سے کیا ڈریگا۔

کاغذی جال

میں نے دیکھا کہ اس زمانہ میں اخباروں رسالوں کے کاغذی جال چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اور حرص و ہوس کی اسیر ارواح اپنے اجسام کو ان میں پھنسا رہی ہیں۔ اسواسطے میں نے بھی دو آنے کا مکھی مار کاغذ بازار سے خریدا۔ اور اپنے رین بسیرے کی آزاد مکھیوں کے سامنے یہ کاغذی جال لگایا۔

اس وقت میرے دل میں مکھیوں سے کسی انتقام کی خواہش نہ تھی۔ نہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے اس عقیدہ کو تسلیم کیا تھا کہ مکھی ہر بیماری کی جڑ ہے۔ میرے دماغ میں جرمنی قیصر کی خونخواری کا بھی کچھ دخل نہ تھا۔ نہ مجھ پر موجودہ جنگ کا ارتقائی اثر پڑا تھا۔ جو میں غریب مکھیوں کے قتل عام پر آمادہ ہوتا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مکھیوں نے مجھے بہت کم ستایا ہے۔ مچھروں کی جتنی شکایت کروں تھوڑی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ میرے جسم کے خون کو شیر مادر سمجھا۔ بیچاری مکھیاں میرے دسترخوان کی شریک سمجھ لیاں ہیں۔ میں ان سے اس قدر محبت کرتا ہوں۔ کہ جب کبھی انہوں نے میرے سالن میں ہاتھ ڈالا تو میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور سارا دسترخوان ان کے آگے رکھدیا۔ خود نہ کھایا۔ سب کچھ ان کو سونپ دیا۔

پھر جو میں نے ان کی گرفتاری و قتل کاری پر کمر باندھی اس کا سبب سوائے اسکے کچھ نہیں کہ میں فقرہ مگس بیچیا کا امتحان کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ خواہش تھی کہ میں اس جانور کی اسیری کا تماشا دیکھوں۔ جس کو سرمد نے سوز عشق سے محروم گردانا ہے۔ اور کہا ہے کہ

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند

سوز دل پروانہ مگس را ندہند

جب مکھی بوالہوس ہے تو دیکھوں اسیران ہوس کیونکر حرص و ہوس کا شکار ہوئے ہیں۔ اور ان پر کیا کیا بپتائیں پڑتی ہیں۔

سب سے زیادہ مجھ کو اس ننھے سے پرندے کی ایک اور آزمائش منظور تھی کہ وہ اپنی جان بچانے میں کہاں تک محتاط ہے۔ اور جب اس پر آفت آجاتی ہے۔ تو کس کس طرح حفاظت زندگی میں کوشش کرتا ہے۔ خاصکر یہ کہ مکھی پر سکرات موت کی کیسی کیفیت ہوتی ہے۔ اور اسکے بے حقیقت اور ناتواں جسم سے جان کتنی دیر میں نکلتی ہے۔

یہ بہت وحشیانہ تجربہ تھا۔ یہ بہت بے دردانہ تحقیقات تھی۔ اسمیں دردمندی اور ترس شعاری کا ذرا دخل نہ تھا۔ مگر جذبۂ بشری نے مجھ کو سنگدل بنا دیا۔ رحم میرے خانۂ دل میں منہ چھپا کر جا بیٹھا۔ اور میں نے اپنے بستر کے آس پاس بسنے والی مکھیوں

کہ تجھ کو کیا دیکھ سکتا ہوں۔ مانتا ہوں کہ دید کے ہزاروں طریقے ہیں مگر جو دید منزل تک پہونچاتی ہے وہ تیرے بند تن سے باہر آئے بغیر ہاتھ نہیں آسکتی۔

یہ خیال نہ کر کہ میں ہمیشہ اس پھول کی سی ہستی پر بستر جمائے رہوں گا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ محدود رہنا مجھ کو بالکل ناپسند ہے۔ میں ہمیشہ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے میں مصروف رہنا مجھ کو بالکل ناپسند ہے۔ میں ہمیشہ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے میں مصروف رہتا ہوں اور اس میں کہیں نہ رکوں گا۔ تاوقتیکہ خدا کو نہ پالوں۔ اور خدا کے پانے پر بھی چپکا نہ رہوں گا۔ یہاں تک کہ اس کی ذات میں سماکر نابود کے اسم سے آزادی حاصل نہ کرلوں

خول۔ یہ علم کہاں ہے کہ تو مجھ سے جدا ہو کر مجھ کو پڑھے۔ علم اندر رہ کر اچھا ہوتا ہے نہ کہ باہر نکلکر!۔

میں:۔ خدا نے اپنے عزیز کلام میں کہا ہے وفی انفسکم افلا تبصرون جس کی تعمیل جسم کی قید میں محال ہے۔

ارے غافل میں تجھسے جدا کب ہوں۔ تو مجھ میں ہے۔ تو میں تجھ میں ہوں۔ اور تیرے ہی اندر رہ کر علم حاصل کر رہا ہوں مگر یہ وہ اندرون نہیں جس کو تو چاہتا ہے کہ خواہشوں میں اسیر ہو کر علم حاصل کروں۔ بلکہ یہ وہ اندرون ہے جو مجھ روح کی اصطلاح میں اندرون ہے اور جس سے حکم خدا کی تعمیل اور دنیا میں آنے کا منشا پورا ہوتا ہے۔

دام مگس

(صوفی۔ جنوری ۱۹۱۶ء)

بلبل کو اسیر کر کے شاعروں کی یورش ہوئی بلبل۔ جس کو سنو قلم کی تلوار کھینچے آنکھیں بند کئے عالم خود فراموشی میں بلبل کے صیاد پر پلا پڑتا ہے۔ گویا غریب صیاد کو کچا چبا جائے گا۔ کوئی پوچھے کہ شاعروں کو بلبل سے کیا ہمدردی ہے۔ عقلمند جانتے ہیں کہ چمن کے محرم گل مین بلبل

دیکھتے ہی دردناک آہیں کھنچتی تھیں اور مرنے کے نام سے ہراساں ہوئی جاتی تھیں یا یہ کیفیت ہے کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار اڑی چلی جاتی ہو۔

روح نگس:۔ کہو کہو۔ جلدی کہو۔ وقت خراب نہ کرو۔ یہ کہہ کر روح نگس نے ایک ایسے پیارے انداز سے انگڑائی لی اور خمار آلود آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر دیکھا کہ میں سینہ تھام کر رہ گیا۔ میں نے کہا۔ ہریالی۔ راج دلاری بنو۔ یہ تم کس کو دیکھتی ہو۔ یہ تمہاری انکھڑیوں میں لال لال ڈورے کیوں پڑے جاتے ہیں۔ یہ تم پر مستی کس بات کی چھا رہی ہے؟

روح نگس۔ مسکرا کر اور اپنے وجود برقی کو کئی بل دیکر بولی۔ ارے آدمی کچھ پوچھتا ہے یا خواہ مخواہ مغز زنی کرتا ہے۔ کیا بتائیں کیا؟ مان ہے، کیا کہیں کس کے گلے لگنے کی تمنا ہے۔ تو اپنی سوکھی فلسفیانہ باتوں کو جانے دے اور میرا راستہ کھوٹا نہ کر۔

یہ کہہ کر گھتی کی روح نے پھر ایک جمائی کے ساتھ انگڑائی لی۔ اور آنکھوں کو کل کر بولی، بعد مدت کے غریبوں کا نصیبا جاگا، یہ کہا اور پھر آسمان کو للچائی اور شوق بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اب ان کے ان نظروں میں اس قدر مستی تھی کہ مجھ کو اپنی قید عنصری سے نفرت ہونے لگی اور میں نے چاہا کہ جسم سے آزاد ہو کر اس بہار تک پہنچوں۔

اس روح کو جب میں نے بہت بے قرار دیکھا تو کہا۔ عشق دنیا اچھا ہے یا عشق آخرت۔

دنیا کیسی۔ آخرت کیسی۔ عشق آزادی۔ عشق حیات ابدی کہو۔ یعنی یہ زندگی جو اس وقت مجھ کو حاصل ہے اور جو دوامی ہے اگر اسی کا نام تمہارے ہاں آخرت ہے تو کہوں گی کہ عشق آخرت کی آرزو کرو۔ اُنس دنیا کو لات مارو یہ کہا اور یکایک

غائب ہوگئی ۔

روحِ مگس نمبر (۴)

مجھ کو اس گفت و شنید میں ایسا مزا آیا کہ میں نے ہر مکھی کی روح سے بات چیت کا تہیہ کرلیا اور چوتھی مکھی کی روح سے مخاطب ہوا ۔

یہ بہت اداس اور غمگین تھی ۔ اور دست اجل کے آغوش میں چپ چاپ گردن جھکائے بیٹھی تھی ، میں نے کہا کیوں تم افسردہ کیوں ہو ؟ بولی اس لئے کہ قید جسم کی تکان نے شل کردیا ۔

آزادی نصیب ہوئی ، مگر سارا وجود حرص و ہوس کی سابقہ زیادتیوں سے چھلا ہوا ہے ۔ راحت ملی ۔ مگر دیر میں ۔ توانائی جلدی کہاں سے آئے ۔ رفتہ رفتہ زخموں کا اندمال ہوگا ۔

میں نے کہا ۔ کیا مرنے کے بعد بھی تعلقات جسم کا خمیازہ روح پر باقی رہتا ہے ؟

روحِ مگس ۔ جزا و سزا اسی کا نام ہے ۔ جو دنیا کے تعلقات سے جی نہیں لگاتا اس میں ایک مسافر کی طرح رہتا ہے ۔ کھاتا ہے ۔ پیتا ہے ۔ کماتا ہے شادی بیاہ کرتا ہے عزت آبرو کے درجوں تک پہنچتا ہے مگر دل کو ان باتوں کا اسیر نہیں کرتا اور اس کو ہر وقت خدا سے لگائے رہتا ہے تو مرنے کے بعد اسکی روح کو کچھ تکان نہیں ہوتی ورنہ میری طرح کہ دنیا میں بہت زیادہ زندہ رہی اور حرص و ہوس کی غلامی کو کل زندگی سمجھا ۔ کھانے اور مٹھاس کی تلاش و طلب کو مقصد حیات سمجھتی رہی اور آج جسم سے نکلکر بے انتہا کوفت اور پریشانی اپنے اوپر پاتی ہوں ، اس کا یہی انجام ہوتا ہے ۔

میں نے کہا ۔ تم نے سنا ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنی مثنوی اسرار خودی میں دنیا کو دین پر مقدم بتاتے ہیں ، اور عیش دنیا کی طلب کو لازمی قرار دیتے ہیں ؟

روحِ مگس ۔ آہ یہ ان کی بھول ہے ۔ اہل یورپ کی خوش حالی اور فروغ دنیاوی نے ان کو دھوکا دیا ہے ، وہ چار دن کی چاندنی کو نور ابد تصور کرنے لگے ۔ انھوں نے سائنس کی ترقی مشاہدات اور مادہ کی اوپری افتاد پر قیاس کرلیا کہ بس یہی چیزیں قابل تقلید ہیں ۔ حالانکہ ان ترقیوں کی اور ان کے عیش و آرام کی بہت تھوڑی عمر ہے ۔ وہ ہوس نفس کے بادلوں کی ایک بجلی ہے جو صرف ایک محدود موسم میں چمک کر رہ جاتی ہے وہ خواہشات سفلی کی برسات کے نالے ہیں جو چند ساعت چڑھاؤ دکھا کر اترجاتے ہیں ۔ بقا اس کائنات میں کسی شکل کو نہیں ہے ۔ ہر نیک و بد پر انقلاب ہوتا ہے مگر جس ہستی کی بنیاد امید آخرت اور توکل خدا پر ہو اس کو دنیا جلدی فنا ہونے سے بچاتی ہے اور جو خود اس دنیا کے اسباب پر اپنی عمارت کی نیو رکھتا ہے اسکی چند روزہ ٹیپ ٹاپ تو بہت پر بہار ہوتی ہے ۔ مگر قائم نہیں رہ سکتی ایک جنبش فطرت میں برباد ہوکر گر پڑتی ہے ۔

ڈاکٹر اقبال کی نیت بری نہیں ہے ۔ انھوں نے اپنے استادوں کی تعلیم اور اس تعلیم کے وطن کی بود و باش سے یہ خیالات اخذ کئے ہیں ان کے دل میں اپنی قوم کا درد ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بھائی بھی کامرانی اور عیش جاودانی حاصل کریں ۔ لیکن شیطان نے جب کسی ذی عقل کو دھوکا دیا ہے تو اسی طرح زینت دیکر اور اس کی نیک نیتی میں شریک ہوکر دیا ہے ۔

میں نے اس افسردہ مکھی کے اتنے لمبے چوڑے لکچر کو سنکر بہت تعجب کیا کہ جو مکھیاں مرنے کے بعد خوش تھیں انھوں نے بات کرنے سے گریز کیا اور یہ غمگین مکھی ایسی طول کلامی کرتی ہے ۔

اس پر میں نے اس سے اس کا سبب پوچھا ۔ مکھی بولی :۔

جس طرح دنیا میں راحت و آرام انسان کو دوسروں سے بے پروا اور بے خبر بنادیتا ہے

اسی طرح مکھیوں کی ارواح اپنے سرور باطنی کی مصروفیت میں تجھ سے ہمکلام ہونا نہ چاہتی تھیں۔ اور آگے بڑھنے کو جہاں ان کا مطلوب تھا گھبراتی تھیں۔ مگر میں کہ اب تک اسیر رنج و محن ہوں، دوسروں کی تکلیف کا حس رکھتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اور ارواح میری طرح مبتلائے عذاب نہ ہوں اسی واسطے میں نے ڈاکٹر اقبال کی مثنوی کی نسبت زیادہ گفتگو کی۔ کیونکہ مجھ کو نظر آتا ہے کہ جو اس کی پیروی کرے گا وہ اپنی آخرت کے عیش کو تباہ کرے گا۔ اور جو اس سے بچے گا وہ دائمی حیات کے سرور کا حق دار ہوگا ۔

مکھی کی روح اتنا کہنے پائی تھی کہ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور مکھی مار کاغذ کو جس پر صدہا لاشیں مکھیوں کی پڑی تھیں، اڑا کر لے گیا۔ اس حادثہ کو دیکھ کر مجبوراً عالم خیال سے اُلٹا پھرنا پڑا۔ اور ارواح کی بات چیت ادھوری رہ گئی ۔

میں اُٹھا اور تمثیلاتِ تجربہ کو اٹھا کر لایا۔ سامنے رکھا اور کہا۔ اے بے حیا مگس کے بے جان جسمو! تم اس جال میں کیسے سنسان پڑے ہو۔ کچھ اپنی ارواح کا بھی حال معلوم ہے اگر تم سن سکتے ہو تو سنو کہ ان میں سے نیک اعمال بے فنا عیش میں مصروف ہیں اور دنیا کی طلب گار اعراف میں پھڑپھڑا رہی ہیں، میں تم کو اپنے گھر کے اندر یہ آواز اس لئے دیتا ہوں کہ یہ صدا غیب کی طاقتوں سے اڑ کر ہندوستان بھر میں گونج جائے اور ہند کے ہر باشندے کو اس کا آخری وقت یاد دلائے اور خدا کرے کہ یہ آواز پہاڑوں اور دریاؤں اور سمندروں تک سے عبور کر کے اثر کرے ۔

آمین

۷۸۶ ہو الکل یا معین

چوتھی منزل

دین و ملت

عورتیں کیا کر سکتی ہیں

(از وکیل مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۳ء)

اس ضرورت کا احساس عام طور پر ہوگیا ہے کہ مسلمان اپنی پچھلی حالت پر نہیں پہونچ سکتے۔ جب تک کہ ان کی عورتوں کو تعلیم یافتہ نہ بنایا جائے۔ اسی لئے نئی روشنی کے جوان ہمہ تن کوشش میں ہیں کہ ہماری عورتیں بھی یورپ کی طرح خوب جی لگا کر لکھنا پڑھنا سیکھیں۔ اور عیسائی لیڈیوں کی طرح کھلم کھلا بازاروں میں گشت لگائیں لیکن ہمارے نوجوان یورپ کی ترقی دیکھ کر ان کی تقلید کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کو اپنی قدیمی ترقی کے اسباب معلوم ہو جاتے وہ ہرگز اس بیہودہ خیال پر توجہ نہ کرتے ۔

لازم ہے کہ وہ اپنے ان بزرگوں کے حالات دیکھیں جن کے طفیل آج ہندوستان میں ہماری صورتیں نظر آتی ہیں

حضرت خواجہ معین الدین حسن اجمیری چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے اسم گرامی سے ایسا کونسا ہندوستانی ہے جو ناواقف ہے۔ آپ کے والد سید غیاث الدین حسن سنجری نے رحلت فرمائی ہے۔ تو آپ کا سن شریف پندرہ برس کا تھا اور یہ عمر وہ ہوتی ہے کہ اس میں

آج کل کے صاحب پدر لڑکے بھی آوارہ ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ کی والدہ حضرت بی بی "خاصۃ الملکہ" نے آپ کی اس قابلیت سے تعلیم و تربیت فرمائی کہ آپ کا زمانہ میں غلغلہ مچ گیا۔ ہندوستان جیسے اجنبی ملک میں مسلمانوں کا جھنڈا کسی در یتیم کے صدقے سے نظر آتا ہے۔ خیال کیا جائے۔ اگر حضرت خواجہ رح کی والدہ تعلیم یافتہ نہ ہوتیں تو کیا اس نونہال کی یہ مشہور سرسبزی ممکن تھی؟ آپ ہی کے خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی دہلوی رح ماں کی گود میں تھے کوئی ڈیڑھ برس کی عمر تھی، کہ آپ کے پدر بزرگوار خواجہ کمال الدین حسن کا وصال ہو گیا۔ آپ کی والدہ حضرت بی بی صالحہ نے پرورش کی۔ اور جب سن شریف چار سال چار ماہ چار یوم کا ہوا تو مکتب میں تحصیل علم کے لئے بٹھا دیا۔ آپ نے قرآن شریف کے پندرہ پارے اس سہولت سے پڑھ لئے کہ استاد حیران رہ گئے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ اپنی والدہ سے جو حافظ قرآن تھیں اکثر یہ پارے پڑھتے سنا کرتے تھے۔ چونکہ ذہن بہت اچھا تھا۔ ان الفاظ نے پہلے ہی جگہ پکڑ لی تھی۔ اب تعلیم کے وقت کچھ دشواری نہ ہوئی۔

بی بی صالحہ نے اس قطب زمانہ کو جس علم سے تربیت کی تھی۔ اب وہی ہماری عورتوں کو بھی سکھایا جائے۔ تاکہ ان کے بچے بھی اسی طرح لائق و فائق بنیں۔

حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء رح بھی اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید احمد صاحب کی وفات کے وقت پانچ برس کے تھے۔ آپ کی مادر محترمہ حضرت بی بی زلیخا نے تعلیم کے فرض کو اس خوبصورتی سے ادا کیا، کہ آج ان کا قرۃ العین خدا کے محبوب کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ سولہ برس کے سن تک محبوب الٰہی رح تمام علوم سے فارغ ہو گئے۔ یہ بی بی صاحبہ کی تعلیم کا اثر تھا، کہ آپ کو بچپن میں صبر و قناعت سے محبت ہو گئی تھی۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ جس دن ہمارے گھر میں فاقہ ہوتا والدہ صاحبہ فرماتی "بابا نظام آج ہم خدا کے مہمان ہیں" یعنی آج گھر میں کھانے کو نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں

کہ مجھ کو والدہ صاحبہ کا یہ فقرہ بہت ہی مزہ دیتا تھا۔ اور جب کبھی ایسا ہوتا کہ متواتر کئی روز تک کھانے کو ملے جاتا تو میں دل ہی دل میں کہتا کہ "ابھی وہ دن کب آئیگا کہ والدہ یہ فرمائیں کہ "بابا نظام آج ہم خدا کے مہمان ہیں"۔

بھلا یورپ میں کسی غریب اور مفلس بچہ کی ایک بھی ایسی ماں ہے کہ جس کا بچہ ناداری سے ملول نہ ہوتا ہو۔ بلکہ الٹا خوش اور مگن رہتا ہو۔ نہیں۔ بلکہ وہاں تو طمع و حرص و اسراف کا سب سے پہلا سبق دیا جاتا ہے۔ لڑکیاں ان ہی عادات کے اختیار کرنے کے لیے مسلمان ان کی عورتوں کی تقلید کرنی چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کو ان مذکورہ خواتین کی حالت پر غور کرنا چاہیئے کہ انہوں نے کس علم کی بدولت اس قسم کی قابلیت اور شائستگی حاصل کی؟ نہ پردہ دری سے۔ نہ کسی غیر زبان کے یاد کرنے سے نہ کسی ترقی یافتہ قوم کی طرز معاشرت سیکھنے سے بلکہ محض اپنے کامل دین کی تعلیم کی بدولت جس کو وہ پوری حد تک حاصل کرتی تھیں۔

اب بھی اگر مسلمان لڑکیوں کو زمانہ کی حالت کا لحاظ رکھ کر تعلیم مذہبی دی جاوے تو وہ ان کی آئندہ نسلیں پہلی سی ترقی حاصل کر سکتی ہیں۔ کیونکہ اسلام سب کے نزدیک ظاہر و باطن کے درست کرنے کے لئے ایک مکمل مذہب ہے۔

ایک آہ اور کچھ نہیں

(از خاتون جولائی سنہ ۱۹۰۶ء)

اچھی آپا یہ سختی کے دن کب جائیں گے۔ بے فکری کی نیند بھی کبھی میسر آئے گی۔ یا یوں ہی ڈر اور خوف سے راتیں آنکھوں میں کٹیں گی، چچا عالم گیر ہم کو کیوں ستاتے ہیں۔ خدا بھی ہماری مدد نہیں کرتا۔ اس نے بھی حق کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دنیا گواہی

دیتی ہے کہ تخت دارا کا تاج دارا کا اور دین کے قاعدے کے موافق بھی آپ ہی تاج و تخت کے اصلی وارث ہیں۔ مگر میں دیکھتی ہوں کہ کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ زمین و آسمان دشمن ہیں۔ گھر سے بے گھر جنگلوں میں بسیرا لیتے پھرتے ہیں جب بھی لوگوں کو چین نہیں اور ہم کو دنیا سے فنا کرنے کی ترکیبیں سوچی جا رہی ہیں۔ جواب دیا گیا :-

دارا کی جان دل آرا۔ جو باتیں کل شام کو ہم نے بیان کی تھیں شاید تم نے ان کو ذہن سے اتار دیا۔ بیٹی اسی زبردستی اور زیردستی کا نام دنیا ہے۔ یہی ناکامی اور کامیابی ہے جس کے چکر میں تمام عالم گرفتار ہے۔ یہ نہ ہو تو ساری دنیا بے مزہ ہو جائے۔ اسی الٹ پھیر سے یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ بھائی اورنگ زیب کا کوئی قصور نہیں۔ نہ خدا اور زمانے کی کوئی شکایت۔ قدرت کا دستور ہے کہ ایک بادشاہی کا تاج پہنتا ہے۔ دوسرا سولی دیا جاتا ہے۔ ایک پاؤں پھیلا کر بے فکری سے سوتا ہے۔ دوسرا ایک جھپکنے کو ترستا رہ جاتا ہے۔ لیکن پیاری اس کی خوشی اور اس کا غم دونوں فانی ہیں۔ قرار ایک کو نہیں۔ بلکہ ذرا اور غور کرو تو معلوم ہوگا کہ خوشی اور رنج فقط وہم و خیال ہے۔ جیال قابو میں ہو تو کیسی ہی سخت مصیبت پیش آئے انسان اسکو ہیچ سمجھتا ہے اور اس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ جو باتیں آجکل ہم کو پیش آ رہی ہیں۔ وہ بھی ایک طرح کی خدمت ہے۔ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کو دی جاتی ہے۔ جس طرح ایک آدمی بادشاہ بنایا جاتا ہے اور اس کے ذمے حکومت کے فرائض لگائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک غریب کو بھی غربت کی خدمت سپرد کی جاتی ہے۔ بادشاہ کو دولت کی شان سے اپنے کام عمدگی سے پورے کرنے چاہئیں اور غریب کو غریبی کی حیثیت سے اس خدائی نوکری کو بجا لانا چاہئیے ؎

بھائی اورنگ زیب میں اتنا بھی مقابلہ نہ کرتا تھا جتنا کیا۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ آیا واقعی قدرت نے اسکی بادشاہت قبول کر لی ہے یا نہیں۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ بے شک خدا تعالیٰ اس کی حکومت اور میری غربت چاہتا ہے۔ یہ ہے تو میں ہر طرح راضی ہوں اورنگ زیب جس طرح چاہے ستائے۔ ہماری سرکوبی اور تکلیفوں کی جیسی چاہے تدبیریں کرے۔ اس کے لئے یہی شایاں ہے۔ کیونکہ اس کو شاہی طرز کی نوکری پوری کرنی ہے۔ ہم کو سب سختیاں برداشت کرنی چاہئیں۔ کیونکہ ہمارے ذمہ غربت بے کسی لاچاری اور ہر طرح کی مصیبت لگائی گئی ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم سہیں ؎

داراشکوہ کی یہ تقریر سن کر اس کی بیٹی دل آرا بولی :-

یا اللہ دل میں اور خلجان پیدا ہوا۔ آپ روز سمجھاتے ہیں۔ مگر مجھ بے وقوف کی عقل میں نہیں آتا۔ پرسوں آپ نے فرمایا تھا کہ ایک ہے اور کچھ نہیں یعنی جو چیز آنکھوں کو نظر آتی ہے اور جن چیزوں کی صورت خیال کرنے سے ذہن میں جمتی ہے۔ سب کی حقیقت ایک ہے۔ شکلیں الگ الگ ہیں۔ جیسے مٹی کے برتن۔ ایک مٹکا ہے۔ تو ایک آبخورہ ایک کونڈا ہے اور ایک چپنی۔ نام الگ الگ۔ کام الگ الگ۔ شکل و صورت الگ الگ مگر مٹی سب کی ایک۔ یا مثلاً ایک ڈورا ہے۔ جس میں کئی گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ گرہ ایک ابھری ہوئی صورت کا نام ہے۔ مگر اصل اس کا ڈورا ہے جو لپٹ کر گرہ بن گیا ہے۔ پہلی چیز جو مسلمان بچے کو سکھلائی جاتی ہے وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ ہے۔ جس کے معنی عام طور پر یہ بتلائے جاتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا دوسرا نہیں۔ اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ کلمہ ہی تمام دین و دنیا کی بنیاد بنا دیتا ہے اگر اس کے معنی یوں سمجھائے جائیں کہ ایک خدا کے سوا دوسرا نہیں یا لفظی معنی کہ نہیں ہے کچھ مگر خدا۔ اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ ابا جان یہ تعلیم میں نے اپنے اُستاد مولوی صاحب سے بیان کی تھی وہ یہ سُنکر بہت ناراض

ہوئے اور فرمایا کہ یہ شرک کی باتیں ہیں۔ ان میں پڑ کر آدمی کافر ہو جاتا ہے۔

دارا شکوہ نے ہندوؤں کی صحبت اور ان کی کتابوں کے پڑھنے سے یہ باتیں سیکھی ہیں دین اسلام کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام تو یہ سکھاتا ہے کہ خدا ایک ہے۔ اور سب مخلوق اُس نے بنائی ہے۔ مگر ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ خدا ہے۔ درخت بھی خدا۔ اور جانور و آسمان و زمین بھی خدا۔ تو یہ تو بالکل کفر کے کلمے ہیں۔ سو حضرت اول تو میں پرسوں کی باتوں میں الجھی ہوئی تھی۔ آج آپ نے یہ اور نئی باتیں سنائیں کہ مصیبت بھی ایک نوکری ہے جس کو خوشی خوشی بجالانا چاہیئے۔ پرسوں کی باتوں کی نسبت مولوی صاحب کہتے ہیں کہ قرآن شریف میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ یہ ہندوؤں کی ویدانت کا مسئلہ ہے جس کو مسلمانوں میں صوفیوں کا گروہ بھی ان کا دیکھا دیکھی ماننے لگا۔ اور آج کی تقریر سن کر تو میں پیشگی حکم لگاتی ہوں۔ کہ مولوی صاحب اس بالکل مسلمانی کے خلاف بیان کریں گے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میرے جی کو بھی مولوی صاحب کی باتیں لگتی ہیں معلوم ہوتی ہیں۔ بھلا جس کا ذکر قرآن شریف میں نہ ہو وہ ہم کس طرح مان لیں۔ اور بات بھی ایسی کہ سب چیز خدا ہے۔

الٰہی تیری پناہ! دل آرا کی شکستہ باتیں سنکر دارا شکوہ کو جوش آ گیا۔ مگر وہ جوش خفگی و ناراضگی کا نہ تھا۔ بلکہ جس طرح کوئی آدمی جانی پہچانی چیز کا انکار کسی نادان کی زبانی سنکر افسوس کے جوش میں آجاتا ہے۔ ایسے ہی دارا کے چہرے پر جوش کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اور نہایت بے پروائی سے بولا۔ دیوانی۔ اس چیز کے وجود پر شبہ کرتی ہے جو سورج کی طرح ظاہر ہے مولوی صاحب کی ناسمجھی ہے جو قرآن شریف کو اس تعلیم سے خالی بتاتے ہیں۔ اری نادان قرآن کے دل میں انہیں باتوں کا خزانہ ہے۔ ظاہری الفاظ پر عمل کرنا بے کار ہے۔ اصلی معانی پر غور کرنا چاہیئے۔ قرآن شریف میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ وہ سب پر محیط ہے۔ وہ اول ہے۔ آخر ہے۔ ظاہر ہے

باطن ہے نیچے ہے۔ اوپر ہے۔ اس کے بہت سے نام ہیں۔ مگر جس طرح قرآن شریف میں ارشاد ہے کہ ہدایت انہیں کو ہے جو غور کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ لوگ غور نہیں کرتے۔ بیشک ویدانت کے بھی یہی اصول ہیں۔ لیکن اسلام کی تعلیم اگر اس سے موافق ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے کب کہا تھا کہ ہر چیز کو خدا کہنا چاہیئے۔ وہ تو میری مثال سے خیال میں آ سکتا ہے۔ کہ جب تک آبخورہ اپنی صورت پر اور مٹکا اپنی شکل پر قائم ہے اس کو مٹی نہیں کہہ سکتے۔ یا جب تک ڈورہ میں گرہ ہے گرہ نام رہیگا ڈورا نہیں کہا جائے گا۔ لیکن سمجھنا یوں ہی چاہیئے کہ حقیقت سب کی ایک ہے۔

رہی دوسری بات کہ رنج و راحت آدمی کے فرائض ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے جب ہم نے یہ مان لیا کہ ایک ہے اور کچھ نہیں یعنی جو کچھ ہے سب خدا کا ظہور ہے تو کہیں اس کی شان کرم ظاہر ہے۔ اور کہیں شان غضب۔ ایک کانٹے دار درخت جس میں پھول پھل نہیں آتے۔ شکایت کرے کہ دوسرے درخت میں پھول بھی خوبصورت ہیں اور پھل بھی مزے دار ہیں مجھے اس سے محروم کیا گیا تو ہم یہی جواب دیں گے کہ تجھ کو وہ میسر ہے جو پھول دار پھلدار درخت کو نصیب نہیں جو شان تجھ میں ہے وہ اس میں نہیں۔ جو اس میں ہے وہ تجھ میں نہیں۔ پھر شکوہ کرنا لاحاصل ہے۔ دل آرا! یہ ایسی اچھی تعلیم ہے کہ اگر انسان اس کو خوب سمجھ کر ذہن نشین کرلے تو دنیا کے عیش و راحت اور رنج و غم کے جھگڑوں سے آزاد ہو جائے۔ دنیا کا ترک اسی کا نام ہے کہ اس کے اتار چڑھاؤ کی تکلیف جاتی رہے یہ نہیں کہ انسان مال و دولت۔ جورو بچے چھوڑ بیٹھے سو پیاری جب میں اپنے بھائی کے برتاؤ کا شاکی نہیں تو تو کیوں شکایت کرتی ہے۔ بس ہر وقت اس خیال میں غرق رہو کہ:۔

"ایک ہے اور کچھ نہیں"

دُعا

(از نظام المشائخ جولائی ۱۹۱۳ء)

دعا مذہبی زندگی کی جان ہے اہل مذہب کے نزدیک مذہب کی عملی صورت کا ظہور بہت کچھ دعا پر منحصر ہے۔ دعا سے مطلوب کا حاصل ہوتا اور پیغمبران الٰہی کا خاص خاص مطالب کے لئے دعا مانگنا اور اس کا قبول ہونا آسمانی کتابوں سے ثابت ہے۔

اسلام میں دعا کا مرتبہ ضروری اور اہم عقائد میں شمار کیا جاتا ہے۔ مسئلہ ذات و صفات اور فطرت اور قوانین فطرۃ کی طرح یہ مسئلہ بھی نہایت دقیق ہے۔ اور اسکی نسبت صدہا مختلف رائیں اور جداگانہ اقوال بزرگان اسلام کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں قرآن شریف میں ارشاد ہے وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ یعنی اور جب تم سے میرا بندہ مجھ کو طلب کرے (تو کہدو) کہ میں اس کے قریب ہوں۔ قبول کرتا ہوں دعا کرنے والے کا سوال جبکہ وہ مجھ سے مانگے۔ دوسری جگہ فرمایا اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ مجھ سے مانگو قبول کروں گا۔

دعا چونکہ تمام رسولوں کا ورثہ ہے۔ جو امت مرحومہ کو عطا ہوا اور جس میں خدائے تعالےٰ نے اعجاز رسالت کی شان باقی رکھی ہے۔ اس لئے بعض لوگوں کو دعا کے معاملہ میں بڑا اختلاف ہے۔ ایک فرقہ دعا کی تاثیر کا بالکل منکر ہے۔ دوسرا اس کے اثر کو خیالی بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن شریف کی اس آیت اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم جو کچھ دعائیں مانگو قبول کیا جائے گا کیونکہ اس میں دو دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اول یہ کہ ہزاروں دعائیں نہایت عاجزی اور خلوص کی جاتی ہیں۔ مگر سوال پورا نہیں ہوتا۔ جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ دعا قبول نہ ہوئی۔ حالانکہ خدا نے استجابت کا وعدہ فرمایا ہے دوسری یہ کہ جو امور ہونے والے ہیں وہ مقدر

ہیں اور جو نہیں ہونے والے وہ بھی مقدر ہیں۔ ان مقدرات کے برخلاف ہرگز نہیں ہو سکتا پس استجابت دعا کے معنی سوال کا پورا قرار دے جائیں تو خدا کا یہ دعویٰ کہ اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ان سوالوں پر جن کا ہونا مقدر نہیں ہے صادق نہیں آسکتا یعنی ان معنوں کی رو سے یہ عام وعدہ استجابت دعا کا باطل ٹھیرے گا۔ کیونکہ سوالوں کا وہی حصہ پورا کیا جاتا ہے جس کا پورا کرنا مقدر ہے۔ لیکن استجابت دعا کا وعدہ عام ہے جس میں کوئی بھی استثناء نہیں۔ پھر جس حالت میں بعض آیتیں ظاہر کر رہی ہیں کہ جن چیزوں کا دیا جانا مقدر نہیں دی جائیں۔ لہذا استجابت دعا کے یہ معنی لینے چاہئیں کہ دعا ایک عبادت ہے اور جب وہ قلبی خشوع و خضوع سے کی جائے تو اس کے قبول کرنے کا خدا تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ گویا دعا عبادت متصور ہو کر عطائے ثواب کا مستحق بناتی ہے۔ اور کسی خاص مسئول عنہ کے حصول سے اسے اسی حد تک تعلق ہے کہ مسئول داعی کے نصیب میں مقدر بھی ہو۔ اس قاعدہ سے دعا کا اثر بے کار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو چیز دعا میں مانگی گئی تھی وہ تو مل گئی مگر اس کو تاثیر دعا سے کچھ لگاؤ نہیں۔ تقدیر کی خوبی سے یہ نتیجہ ظاہر ہوا۔ دعا کا صرف یہ فائدہ ہے کہ دعا کرنے کے وقت خدا کی عظمت اور بے انتہا قدرت کا خیال دل میں جم جاتا ہے تو خیالات کی لہریں بھی جمع ہو کر ایک مرکز پر ٹھیر جاتی ہیں۔ اور انسان کی پریشانی و گھبراہٹ جو کسی خاص فکر سے پیدا ہوئی ہو مغلوب ہو کر صبر و استقلال سے بدل جاتی ہے اور استقلال کی کیفیت کا دل میں ہونا عبادت کے لئے لازمی امر ہے پس یہی دعا کا مستجاب ہونا ہے۔

دوسرا فریق دعا کی قبولیت پر پورا ایمان رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک دعا کا نتیجہ ضرور حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ مذکورہ اعتراض کے جواب میں کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی خیر و شر مقدر سے خالی نہیں۔ تاہم قدرت نے اس کے حصول کے لئے

ایسے اسباب مقرر کر رکھے ہیں جن کے صحیح اور موثر ہونے میں کسی عقل مند کو کلام
نہیں پہلے فرقے نے دعا اور ترک دعا میں جس تقدیر کا ذکر کیا وہ تقدیر دوا میں بھی تو
موجود ہے مگر سب دیکھتے ہیں کہ دوا کے اثر کو ایسا یقینی مانا جاتا ہے کہ تقدیر کا خیال
بھی نہیں آتا اور دوا سے دوری مرض کا پختہ یقین ہوتا ہے جسمانی معاملات میں تو
تقدیر کا لحاظ نہ کیا جائے اور روحانی مسئلہ میں تقدیر کو شامل کر کے تاثیر دعا کا انکار کر دیا
جائے یہ کسی طرح قرین انصاف نہیں ہو سکتا۔

ادعونی استجب لکم میں بیشک دعا سے عبادت مراد ہے چنانچہ نعمان
بن بشیر سے روایت ہے کہ حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان الدعاء ھو العبادۃ
ثم قرا ادعونی استجب لکم یعنی فرمایا۔ دعا عبادت ہے۔ اس کے بعد آیت
ادعونی استجب لکم تلاوت فرمائی۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں دعا سے
مراد عبادت ہے۔ اس کے علاوہ یہاں دعا کی تعلیم امر کے صیغہ سے کی گئی ہے گویا
دعا کو فرض کر دیا گیا ہے حالانکہ دعا انسان پر فرض نہیں ہے پس معلوم یہ ہوا کہ
اس آیت میں دعا سے عبادت ہی مقصود ہے لہٰذا جو فریق استجابت دعا کے یقینی
ہونے کو اس آیت سے نکال کر مسئلہ تقدیر کے ذریعہ سے اشکال پیدا کرتا ہے اس
کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ آیت عبادت کے متعلق ہے۔ ہاں اس کے علاوہ اور کئی
آیتیں ہیں جن سے قبولیت دعا ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ ایک آیت میں تو گویا صاف
صاف انہیں شکوک کا جواب دیا گیا ہے جو سورہ انعام میں ہے بل ایاہ
تدعون فیکشف ما تدعون الیہ ان شاء تم خاص اسی سے دعا مانگتے
ہو تو وہ دے دیتا۔ تمہارے مطلب کو اگر چاہے۔ یہاں تقدیر کا صاف طور سے ذکر کر دیا
گیا ہے مگر دنیا میں کوئی چیز تقدیر سے خالی نہیں۔ آگ جلا دیتی ہے پانی ڈبو دیتا ہے
ان تاثیرات سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ مگر آخر تقدیر کے وقت ظاہر ہوتا ہے ایسے ہی دعا

بھی آگ کی طرح یقینی اثر دار چیز ہے۔ دواؤں کی مثل خدا نے اس میں تاثیر پیدا کی
ہے مگر جس طرح تقدیری گردش کے سبب باوجود دوا استعمال کرنے کے مریض کو
فائدہ نہیں ہوتا۔ دعا کا نتیجہ بھی ظاہر نہیں ہوتا۔

آج کل نئی روشنی کے مسلمانوں میں یورپ کی تقلید کے سبب سے دعا سے
بے توجہی ہوتی جاتی ہے۔ اور وہ اس کو ایک فعل عبث خیال کرنے لگے ہیں۔ اور یہی سبب
ہے کہ ان کے دل کو مصیبت کے وقت تسلی و تسکین کسی صورت سے میسر نہیں آتی۔
کیونکہ دعا کا مانگنا صرف اس یقین پر مبنی ہے کہ خدا تعالےٰ قادر مطلق اور فاعل مختار
ہے بے قرار دل کی نکلی ہوئی دعا کا سننے والا اور اس کی حاجت پوری کرنے والا ہے
اگر ایک لحظہ کے لیے اس یقین میں تذبذب ہو تو کون سا دل ہوگا جو بیقراری کی حالت
میں اس کی طرف رجوع کرے اور وہ کون سا خیال ہوگا جو اس کے اضطرار کی آگ کو
ٹھنڈا کرے۔ اس لئے کہ صرف یہ خیال کہ دعا میں سننے اور حاجت پوری کرنے کی
قدرت رکھتا ہے اضطرار کی حالت میں بندہ کا خیال خدا کی طرف رجوع کراتا ہے
اور محض اس اعتقاد سے کہ باوجود قدرت کے خدا کا دعا قبول نہ کرنا کسی مصلحت
پر مبنی ہوگا اور وہ مسئول عنہ سے بہتر کوئی چیز دے گا۔ دعا کرنے والے کے دل کو
تسلی ہوتی ہے۔ اگر دعا کا عمل موقوف ہو گیا اور خدا سے دعاؤں کے سننے اور حاجتوں
کے پورا کرنے کا خدائی حق لے لیا گیا تو مذہبی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ اگر یہ مان لیا جائے
کہ دعا ذریعہ حصول مقصد نہیں ہے اور یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ دعا اپنے بندوں کی مصیبتوں
کے دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا اور نہ کسی کی گریہ وزاری اور اضطرار و بے قراری
کا اثر ہوتا ہے تو دعا بے کار اور توکل فضول ہے۔ پھر یقین اور اعتقاد کو بھی اپنے قدم جمانے
کے لیے کوئی جگہ نہیں رہتی۔ اور بندہ کو بجز اس کے کہ وہ غیر تغیر پذیر قوانین فطرت
کو اپنا خدا مانے دوسرا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ایسی حالت میں انسان کو نے بے جان

قانون سے واسطہ رہتا ہے اور ایک زندہ خدا سے اور یہ خیال اس محبت کے رشتے
کو جو خدا اور اس کے بندوں کے بیچ میں ہے توڑ دیتا ہے ۔ اگر اس میں مدد کرنے کی
طاقت نہیں ہے تو ہم کس لئے اس پر بھروسہ کریں ۔ اگر وہ ہماری دعائیں نہیں سنتا
تو ہم کیونکر اسے رحیم مانیں ۔ اور اس میں رحم نہیں تو ہم کیوں اس سے محبت کریں پس
اس عقیدہ سے ہمارا یقین جاتا رہتا ہے ۔ ہم کو خدا سے محبت باقی نہیں رہتی اور ہم
ایسے مذہب کے ماننے والے رہ جاتے ہیں جس میں نہ یقین ہے نہ محبت ۔ لہذا
اگر دعا کی اجابت ناممکن ہے تو مذہب بھی ناممکن ہے ۔

صوفیہ کرام کے تمام سلسلے اجابت دعا کے قائل ہیں اور صرف قائل ہی نہیں
ہیں بلکہ ان کو خدا کی طرف سے تاثیرات دعا کا وہ مرتبہ عطا ہوا ہے جو بنی اسرائیل
کے پیغمبروں کو حاصل تھا ۔ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ نبوت کے آثار میں اس امت کو
مقبول دعا دی گئی ہے یعنی جس طرح اگلے زمانہ کے پیغمبر دعا کے ذریعہ سے اپنے اعجاز
دکھاتے تھے ہمارے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی امت کے اولیاء اسی دعا سے
کرامتیں دکھانے پر قادر بنائے گئے ہیں ۔ آئندہ پرچہ میں خدا نے چاہا تو ہم ثابت کریں گے
کہ صوفیوں کے مختلف خاندانوں کے مشایخ کی دعا کی کیا کیا تاثیریں ظاہر ہوئی ہیں چشتیوں
قادریوں نقشبندیوں ۔ سہروردیوں وغیرہ کل سلسلوں کے بزرگوں نے اپنی ذات اور
قوم کے لئے دعائیں کی ہیں اور اگر ہر دعا کے الفاظ علیحدہ علیحدہ و نظر تعمق سے دیکھے جائیں
تو صاحب دعا بزرگ کی باطنی کیفیت و اندرونی احساس اور جذبہ کا حال معلوم
ہو جاتا ہے ۔ یہاں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے ۔ پھر بھی اس کو وضاحت سے
لکھا جائے گا ۔

اب یہ بات ثابت کر کے کہ دعا میں تاثیر ہے اور دعا ہمارے صوفیہ کرام کے
کل فرقوں کی مسلمہ چیز ہے اس رسالہ کا شروع ہو جو صوفیوں کی دینی و دنیوی اغراض کی خدمت

گزاری کے لئے جاری کیا جاتا ہے) اور جس کا آج پہلا پارہ نمودار ہوتا ہے) دعا
کرتے ہیں یقین ہے کہ جس طرح خدائے تعالےٰ نے صوفیائے کرام کی دعاؤں میں تاثیر
عطا فرما کے ان کو ہمیشہ مقبول فرمایا اسی طرح ان کا یہ ماہوار رسالہ بھی اپنی دعا کے
ذریعہ سے بارگاہ الٰہی میں قبول ہوگا اور اپنے ابنائے جنس کو فائدہ پہونچائے گا ۔

گلیم درویشی کی تنگی

اور

ایک الم ناک فسانہ

(از نظام المشایخ سنہ ۱۹۰۹ء)

اگلے وقتوں میں کہا کرتے تھے کہ دو بادشاہ ایک اقلیم میں نہیں رہ سکتے ۔ مگر دو
درویش ایک کمبل میں بسر کر سکتے ہیں ۔ آج کل اس کے خلاف پایا جاتا ہے ۔ بادشاہت کا تو
یہ عالم ہو گیا کہ ہر فرد واحد اپنے تئیں ملک کا حاکم سمجھتا ہے جس سے ایک اقلیم میں کروڑوں
بادشاہ نظر آتے ہیں ۔ اور درویشوں کی یہ کیفیت ہو گئی کہ ایک گلیم میں دس تو کجا دو درویش
بھی نہیں سما سکتے ۔ قادری ہوں یا نقشبندی ۔ چشتی ہوں یا سہروردی سب ایک تھیلی
کے چٹے بٹے ہیں ۔ اصول کے لحاظ سے ان میں کوئی بین فرق یا تفاوت نہیں ہے ۔ فروعات
ہر شرب کی علیحدہ ہیں ۔ مگر افسوس ہے کہ فروعات کے جھگڑوں سے ان سلسلوں میں ایسی
اجنبیت اور غیریت قائم ہو گئی ہے کہ باہم ایک دوسرے سے جدا نظر آتا ہے سب سے
پہلے تفریق حد سے زیادہ محبت کرنے سے پیدا ہوئی یعنی اپنے سلسلہ کے مشایخ سے
جب مریدین کو تعلق بڑھا ۔ تو انھوں نے اسکو اتنا بڑھایا کہ اور تمام مشایخ کو پست

کر دیا۔ یہ کیفیت دیکھ کر دیگر مشائخ کے متوسلین نے بھی اپنے بزرگوں کو ناجائز طور سے دوسروں پر ترجیح اور فوقیت دینی شروع کی، اور اس طرح درویشی خاندانوں میں نفسانی کشمکش شروع ہو گئی سب سے پہلے قادری سلسلہ سے لوگوں کو شکایت پیدا ہوئی کہ یہ لوگ حضرت غوث الاعظم محبوب سبحانی کو تمام مشائخ عالم پر ترجیح دیتے ہیں اور حضرت غوث الثقلین رح کا یہ قول کہ قدمی علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ (یعنی یہ میرا قدم سب ولیوں کی گردن پر ہے) اس شد و مد سے بیان کرتے ہیں جس سے دوسرے خاندان والے بتقاضائے بشریت مشتعل ہوں۔ اس کے بعد چشتیہ طریق کی آزادی اور نقشبندیہ طریق کی محدود خیالی کی نسبت لوگوں کو شکایت پیدا ہوئی خود چشتیہ خاندان میں کئی شاخیں ہو گئیں۔ نظامی صابری۔ جمالی۔ اور ان شاخوں میں بھی وہی فضیلت کے جھگڑے برپا ہو گئے۔ نظامی کہتے ہیں کہ حضرت بابا گنج شکر رح کے اصلی جانشین اور خلیفہ اعظم حضرت خواجہ نظام اولیا محبوب الٰہی ہوئے۔ صابری کہتے ہیں کہ تمام باطنی امور کا حصہ حضرت مخدوم صابر رح کو ملا جمالی کہتے ہیں کہ جو نظر خاص حضرت بابا صاحب کی حضرت قطب جمال الدین ہانسوی رح پر تھی وہ کسی اور کو میسر نہ ہوئی۔ نقشبندیوں میں مجددیہ شاخ کے دعوے تمام خاندانوں سے نرالے ہو گئے۔ حضرت شیخ احمد مجدد سرہندی رح کے ایسے عجیب و غریب دعوے اور ان کے ایسے فضائل بیان کیے جاتے ہیں جو تمام متقدمین مشائخ نقشبندیہ سے مجدد رح صاحب کو بڑھا دیتے ہیں۔

الغرض نہایت سخت کشمکش سلسلوں میں معمولی باتوں کے سبب پڑی ہوئی ہے جس قدر ذکر کیا گیا یہ سب محبت یا علم سے متعلق ہے ہر شخص اپنے بزرگ اور اپنے شیخ کو سب سے بڑھ کر سمجھتا ہے یہ کوئی شکایت کی بات نہیں ہے افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اس ولولے میں دوسرے بزرگوں کی تحقیر اور تنقیص کی جاتی ہے ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ جہاں دو شخص جمع ہوتے ہیں اور ان میں ایک چشتی ہوتا ہے اور ایک قادری تو وہ بجائے اس کے کہ کسی مسئلہ تصوف پر بات چیت کریں فضیلت حضرت

غوث الاعظم رح اور حضرت خواجہ خواجگان اجمیری رح پر گفتگو کرتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ حضرت غوث الاعظم رح سے حضرت خواجہ بزرگ رح نے فیض پایا۔ دوسرا کہتا ہے نہیں بلکہ حضرت غوث الاعظم رح حضرت خواجہ بزرگ سے فیضیاب ہوئے۔ ان فضول باتوں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں بزرگوں کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کرنے لگتے ہیں اور اس نعمت سے محروم ہو جاتے ہیں جو ادب اور تعظیم سے حاصل ہوا کرتی ہے۔

ہم کو بڑا افسوس ہوتا ہے جب ہم سماع کی محفلوں میں حضرت صاحب صابر صاحب کا نام قوال کی زبان سے سنکر نظامی درویشوں کو یہ نام لینے سے منع کرتے ہوئے پاتے ہیں ایسے ہی صابری محفل محبوب الٰہی رح کا نام لینے سے قوال کو روکا جاتا ہے تو بیحد قلق ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگ اپنی دانست میں حضرت محبوب الٰہی رح اور حضرت مخدوم صابر رح کی محبت اس میں سمجھتے ہیں کہ دوسرے بزرگ کا نام نہ لیا جائے حالانکہ یہ ان کی کور باطنی اور جہالت ہے یہ سب بزرگ ایک شان رکھتے ہیں۔ ان میں تفریق کرنا ملت عشق میں کفر کے برابر ہے۔ اللہ تعالے قرآن شریف میں فرماتا ہے لانفرق بین احد من رسلہ (یعنی ہم کسی رسول کے مرتبہ میں فرق نہیں کرتے) اولیاء اللہ مثل انبیاء ہوتے ہیں۔ پھر بھلا ان میں تفریق کیونکہ ہو سکتی ہے۔

الغرض گلیم درویشی کی وسعت کو تنگ خیال لوگوں نے اس قدر چھوٹا کر دیا ہے کہ اس میں ایک درویش بھی نہیں سما سکتا۔ اوپر جتنی باتیں لکھی گئی ہیں یہ سب ایک حد تک محبت یا علمی روایتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ افسوس آج کل کے زمانہ پر ہے کہ محض دنیاوی اور نفسانی کدورتوں سے مشائخ میں تفریق اور جدائی پھیلتی جاتی ہے نقشبندی، قادری، سہروردی، چشتی تو خیر الگ الگ خاندان ہیں غضب تو یہ ہے کہ ایک ہی خاندان کی مختلف شاخوں میں اس قدر عناد پایا جاتا ہے۔ کہ کوئی نہیں

کہہ سکتا کہ ان کا آپس میں کوئی تعلق بھی ہے ۔

مثلاً نقشبندیہ طریق میں مجددی حضرت غیر مجددی لوگوں سے بالکل ناآشنا اور بے غرض ہیں۔ اور ان کو سوائے مجدد صاحبؒ کے اپنے سلسلہ میں اور کسی سے محبت نہیں ہوتی۔ امیر حبیب اللہ خان والی کابل جب ہندوستان میں آئے تو تمام مشہور مزارات پر حاضری دی۔ مگر حضرت خواجہ باقی باللہ رح کے مزار کی زیارت کو نہ گئے۔ کیا تعجب خیز امر نہیں کہ مجدد صاحبؒ کے پیرو مرشد کے مزار کی زیارت بیکار سمجھی گئی مگر اس میں شاہ کابل کا کوئی قصور نہیں ہے اگر ان کو بتایا جاتا کہ مجدد صاحب رح کے شیخ کا مزار دہلی میں ہے۔ تو وہ ضرور حاضر ہوتے۔ مگر جو حضرات ان کے گرد و پیش تھے وہ سب مجدد صاحب کے مقابلہ میں حضرت خواجہ باقی باللہ کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے یا سمجھتے ہیں تو بہت معمولی۔ ورنہ وہ ضرور شاہ کو وہاں کی حاضری کے لئے آمادہ کرتے ۔

اسی طرح چشتیوں کا عالم ہے۔ ان کی ایک مشہور شاخ نظامیہ پر غور کیجئے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ حضرت مولانا فخر الدین رح سے پنجاب اور یورپ میں کئی مسندیں نظامیوں کی قائم ہوئیں۔ بریلی میں نیازیہ تونسہ شریف میں سلیمانیہ۔ فخریہ خاندان کی مشہور شاخیں ہیں۔ مگر ہم نے کبھی نہیں سنا کہ سلیمانیہ اور نظامیہ مشایخ میں کبھی اس قسم کا ارتباط پیدا ہوا ہو جو ہم طریقہ اور سلسلہ مشایخ میں ہوا کرتا ہے اور ہونا چاہیئے پنجاب میں فخریہ سلسلہ سے جس طرح تونسہ شریف میں سلیمانیہ مسند قائم ہوئی اسی طرح چاچڑاں شریف میں حضرت قاضی محمد عاقل صاحب کی خانقاہ بڑی مشہور اور بااثر مانی جاتی ہے۔ اس خانقاہ کے مشہور سجادہ نشین حضرت غلام فرید صاحب تھے جن کا ابھی حال ہی میں وصال ہوا ہے۔ اور تونسوی خانقاہ میں خواجہ غلام فرید صاحب کے ہمعصر حضرت خواجہ اللہ بخش صاحبؒ تھے جن کی رحلت کا زمانہ بھی خواجہ غلام فرید صاحب کے

قریب واقع ہوا۔ ان دونوں حضرات کی نسبت مشہور تھا کہ تعلقات کشیدہ رکھتے ہیں مگر بہاولپور شریف کے عرس میں ایک دفعہ یہ دونوں بزرگ جمع ہو گئے۔ اور باہمی ملاقاتیں ہوئیں۔ جس خلوص اور تپاک سے ان بزرگوں نے باہم ملاقات کی ہے وہ اس بات کا نمونہ تھا کہ مشایخ ایسے عمدہ اخلاق رکھتے ہیں۔ عوام کی سب غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور جو فرضی روایتیں کشیدگی اور رنجش کی مشہور تھیں مجمع کی ایک ہی ملاقات میں صاف ہو گئیں۔ مگر افسوس ان بزرگوں کے بعد ان کے جانشینوں نے رسم مودت و اتحاد کو تازہ نہ کیا۔ ہر ایک اپنے مشاغل میں مصروف ہے۔ اور اس عظیم الشان ضرورت کی طرف توجہ نہیں کرتا ۔

جس قدر بڑے بڑے عرس نظامیہ خانقاہوں میں ہوتے ہیں وہاں سوائے ان ہی مشایخ کے جن کو صاحب عرس سے کچھ تعلق ہے اور کوئی عرس میں نہیں آتا اور آتے ہیں تو اس طرح کہ ایک دوسرے کی حالت سے بے خبر رہتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اجمیر شریف میں چشتیوں کے تمام مشایخ خواہ وہ کسی شاخ کے ہوں جمع ہوتے ہیں اور محفل سماع میں بازو سے بازو ملا کر کھڑے ہوتے ہیں لیکن ان سے پوچھا جائے کہ چھ دن کی محفلوں میں تم نے کتنے مشایخ سے واقفیت حاصل کی۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم واقفیت حاصل کرنے نہیں جاتے ہمارا مقصد سماع کی شرکت ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں محفل سماع کے آداب کے خلاف ہے کہ وہاں بات چیت اور کلمہ کلام ہو۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ان مشایخ کے باہمی میل جول کا اور ایک جگہ جمع ہونے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع میسر نہیں آسکتا۔ اگر سماع سے پہلے یا بعد کوئی وقت ایسا مقرر کیا جائے جس میں مشایخ آپس میں میل جول۔ اور تبادلہ خیالات کریں تو کوئی حرج نہیں۔ یہ بات جب ہی ہو سکتی ہے کہ مشایخ اس کی ضرورت اور اہمیت اور مفاد کو سمجھتے بھی ہوں۔ وہاں تو یہ عالم ہے کہ ہر بزرگ

سے مصافحہ کرنا یا آنکھ ملانا اپنی شان اور وقار کے خلاف سمجھتا ہے۔ پھر کیونکر یہ رسم جاری ہو سکتی ہے کہ "ملاقاتی محفل" قائم ہو۔

قصہ مختصر اس تنگ خیالی اور نقصان رساں کشیدگی اور علیحدگی کو سالہا سال مشاہدہ کرنے کے بعد ہم چاہتے ہیں کہ اس کے دور کرنے کا خیال مشائخ میں پیدا کردیں۔ اور یہ خیال جب ہی پیدا ہو سکتا ہے کہ ان کے سامنے بزرگوں کی مثالیں پیش کی جائیں اور دکھایا جائے کہ مشائخ قدیم کا باہمی برتاؤ کیسا تھا اور تم آجکل کیا برتاؤ کر رہے ہو۔ ان کا طرز عمل دین و ملت کے لئے مفید تھا یا تمہارا لہٰذا کو منظور ہے تو ان اوراق میں ہم کل سلسلوں کے مشائخ متقدین کا وہ تذکرہ شائع کرتے رہیں گے جس سے ہمارا مذکورہ مقصد ہویدا ہو سکے۔ سردست چشتیوں اور سہروردیوں کے پرانے تعلقات لکھے جاتے ہیں کیونکہ ہندوستان میں ان ہی سلسلوں کا قدم پہلے آیا تھا۔ گو آج کل سہروردی طریقہ کی اشاعت عام نہیں ہے۔ مگر جس زمانہ کا ذکر ہم کرنا چاہتے ہیں وہ سہروردیوں کے عروج و کمال کا زمانہ تھا۔ امید ہے کہ تمام مشائخ عظام ان واقعات کو غور و خوض اور تعمق سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

التمش کی خرقہ پوشی

قبل اس کے چشتیوں اور سہروردیوں کے تعلقات کا ذکر شروع کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہان ہند کے مذہبی خیالات کا تھوڑا سا تذکرہ کر دیا جائے۔

جب شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان فتح کر لیا تو اس کے نائب اور غلام قطب الدین ایبک نے پایۂ تخت کی بنیاد دہلی میں قائم کی اور فتح کی یادگار میں مسجد قوۃ الاسلام اور قطب مینار بنانا شروع کیا۔ یہ بادشاہ درویشوں کی طرف خاص میلان

رکھتا تھا۔ مگر اسکی زندگی نے بہت کم وفا کی۔ اس کے بعد جس قدر بادشاہ تخت نشین ہوئے وہ عموماً سب چشتیہ طریق کے تھے۔ کیونکہ دہلی میں چشتیوں کے بہت بڑے پیشوا حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی۔ جو اجمیری خواجہؒ کے دربار کی جانب سے تشریف رکھتے تھے۔

ان غلام بادشاہوں میں سلطان شمس الدین التمش سب سے بڑھ گیا۔ اور اس نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے اس قدر عقیدت پیدا کی کہ حضرت کے ممتاز مریدوں میں شمار ہونے لگا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے اس کو خرقہ خلافت بھی عطا فرمایا تھا۔ اور حضرت کے وصال کے بعد اسی بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے آپ کا غسل میت کیا۔ مشائخ میں خیال کیا جاتا ہے کہ التمش کو مرتبہ قطبیت بھی حاصل ہوا تھا۔ بہرحال التمش کی خرقہ پوشی اور چشتیہ خاندان سے گرویدہ ہونے کے سبب ملک میں چشتیوں کی طرف عام میلان ہو گیا تھا اور لوگ جوق جوق اس طریقہ کے مرید ہو رہے تھے۔

اس زمانہ میں ملتان اور دیپالپور وغیرہ سرحدی مقامات میں سہروردی سلسلہ نے قدم بڑھانے شروع کئے تھے۔ چونکہ ملتان بیرونی دشمنوں کے حملہ کی پہلی گذرگاہ واقع تھا اس واسطے شاہان دہلی اس کے استحکام کے لئے چیدہ افسر مقرر کرتے تھے اور ملک کی زبردست فوجیں وہاں رہتی تھیں۔ اس ظاہری انتظام کے ساتھ باطنی انتظام بھی تھا۔ ملک کے نامور علماء و مشائخ خلقت کی روحانی تربیت کے لئے ملتان میں رہتے تھے۔ چنانچہ سہروردیہ طریق کے نامور پیشوا حضرت بہاؤ الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ یہیں تشریف رکھتے تھے لوگوں کو ان سے بڑا اعتقاد تھا اور سہروردی سلسلہ نہایت سرعت سے پھیل رہا تھا۔ اسی اثناء میں دہلی سے حضرت خواجہ قطب صاحبؒ کے خلیفہ اعظم حضرت بابا فرید گنج شکرؒ بھی ملتان کے قریب قصبہ اجودھن میں تشریف

لے گئے اور وہیں قیام اختیار کیا۔ حضرت بابا صاحب کے تشریف لے جانے سے سہروردیہ سلسلہ کی ترقی میں پہلی سی تیزی نہ رہی۔ مگر اس کا نہ حضرت شیخ الشیوخ شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کو افسوس تھا اور نہ حضرت بابا صاحب کو خوشی تھی کیونکہ یہ دونوں بزرگ دینی خدمت کر رہے تھے ان کو اس سے کچھ سروکار نہ تھا کہ کون خاندان زیادہ پھیل رہا ہے۔

التمش کے بعد سب غلام بادشاہ چشتیوں کے حلقہ بگوش رہے غیاث الدین بلبن حضرت بابا صاحب کی زیارت کے لئے خواجودھن (پاکپٹن) حاضر ہوا اور ایک روایت کے بموجب اپنی لڑکی بھی آپ کے نذر کی بلبن کے آخری زمانہ میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی حضرت بابا صاحب کی اجازت سے دہلی کے نائب مقرر ہو کر تشریف لائے اور آپ کا غلغلہ اس کی موت سے پہلے اچھی طرح تمام ملک میں پھیل گیا۔ بلبن اور اس کا بیٹا محمد خان شہید جو ملتان کا صوبہ دار تھا حضرت محبوب الٰہیؒ سے دلی عقیدت رکھتے تھے۔ بلکہ محمد خان تو آپ کے دو مقبول مریدوں حضرت امیر حسن علاء سنجری رح اور حضرت امیر خسرو رح کو اپنے ہمراہ ملتان لے گیا اور مرتے دم پاس رکھا۔ بلبن کے بعد اس کا پوتا کیقباد بھی حضرت محبوب الٰہی رح کا خاص عقیدت شعار رہا۔ اور اس طرح چشتیوں کی دھاک تمام ملک کے دل پر بیٹھ گئی۔

کیقباد کے بعد جلال الدین خلجی اور علاؤالدین خلجی بھی چشتیوں کے حلقہ بگوش رہے مگر علاؤالدین کا جانشین قطب الدین خلجی چشتیوں سے منحرف ہو گیا اور اپنی نادانی و نا تجربہ کاری کے سبب اس کے درپے ہوا کہ پولیٹکل چال سے

چشتیوں کا زور

توڑ دے۔ چنانچہ اس کے مشیروں نے اس کو صلاح دی کہ جب تک حضرت

محبوب الٰہیؒ کے مقابلہ میں کوئی دوسرا بزرگ دہلی میں نہ آئے گا ان کا زور قائم رہے گا شاہی اختیارات سے ایسے ہردلعزیز لوگوں کا زیر کرنا آسان کام نہیں ملتان سے سہروردیہ خاندان کے سب سے بڑے پیشوا حضرت مولانا رکن الدین ابوالفتح کو دہلی بلوایئے۔ اول تو یقیناً ان کے آپس میں زور آزمائی ہو گی حضرت محبوب الٰہیؒ کبھی گوارا نہ کریں گے کہ ان کی اقلیم میں غیر خاندان کا آدمی سکہ چلائے۔ مولانا رکن الدین چونکہ سلطان کی شہ سے آئیں گے اس واسطے وہ بھی مضبوطی سے چشتیوں کا مقابلہ کریں گے اور دہلی سے ان کا اثر زائل کرنے کی کوشش کریں گے اس کشمکش میں سلطان کا مطلب حاصل ہو جائے گا۔ سلطان نے اس مشورہ کو پسند کیا۔ اور ملتان سے حضرت مولانا رکن الدین ابوالفتح کو بلوایا۔ چنانچہ حضرت مولانا ملتان سے روانہ ہو کر دہلی تشریف لے آئے۔ اور وہ وقت قریب آ گیا کہ

تلوار اور تسبیح کا مقابلہ

شروع ہو۔ کیونکہ سلطان تلوار کے زور سے حضرت محبوب الٰہیؒ کی تسبیح کو زک دینی چاہتا تھا آج کل کا زمانہ ہوتا تو خبر نہیں کیا حالت ہوتی خود مختار، جابر، ظالم سلطان کا ناد اور ایسی خطرناک چال کہ بھائی کو بھائی سے جنگ کا اندیشہ۔ مگر حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنی خداداد حقانیت اور حسن نیت سے سلطان کے تمام منصوبے خاک میں ملا دے جوں ہی حضرت مولانا رکن الدین ابوالفتح شہر میں داخل ہوئے سلطان نے بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا۔ اور پوچھا کہ دہلی میں سب سے پہلے کون ملا؟ آپ نے ارشاد کیا جو سب سے اچھے ہیں۔ سلطان نے گھبرا کر دریافت کیا وہ کون ہیں؟ فرمایا مولانا نظام الدین محبوب الٰہیؒ! یہ سنکر سلطان کا چہرہ فق ہو گیا۔ اور اس نے غیظ و پشیمانی میں اپنا منہ حضرت کی طرف سے پھیر لیا۔ وہ اپنے ہونٹ چباتا تھا اور حضرت محبوب الٰہی رح کی ایسی

صاف کامیابی سے مبہوت تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ یہ لوگ دنیا کے آدمیوں کی طرح چالبازیاں نہیں کیا کرتے وہ نہیں جانتا تھا کہ جو چراغ خدا نے روشن کیا تھا وہ ان فریب کاریوں کی پھونکوں سے بجھنا دشوار ہے۔ اس کے مشیروں نے چشتیوں اور سہروردیوں کو جداگانہ مذہب تصور کر کے یہ چال چلی تھی مگر اب انہیں معلوم ہوا کہ یہ سب تو ایک ہی گھر کے رہنے والے ہیں اور ان میں کچھ بھی اختلاف نہیں ان کے ذہن میں یہ بات وہم و گمان کی طرح بھی نہ آئی تھی کہ حضرت محبوب الٰہی باوجود اس عظمت و شان کے تمام ہندوستان ان کے قدموں میں سر جھکاتا ہے، مولانا رکن الدین ابو الفتح کے استقبال کو شہر سے باہر تشریف لے جائیں گے اور اس طرح بادشاہ کی کی کرائی محنت کو خاک میں ملا دیں گے۔

مولانا رکن الدین بشر تھے۔ امکان میں تھا کہ وہ دہلی میں بادشاہ کے پاس ٹھہر کر اغوا میں آجاتے۔ اور حضرت محبوب الٰہی رہ سے مخاصمت شروع کر دیتے۔ مگر حضرت محبوب الٰہی رہ نے کمال دور اندیشی۔ کمال اخلاص شعاری۔ کمال مہمان نوازی اور کمال فروتنی کو کام میں لا کر خود تکلیف اٹھائی۔ شہر سے باہر استقبال کو تشریف لے گئے اور بادشاہ سے پہلے حضرت سے ملاقات کر لی جس کا اثر یہ ہوا کہ مولانا نے بادشاہ سے کہا کہ حضرت محبوب الٰہی رہ ہی تمام دہلی میں سب سے اچھے ہیں۔ بادشاہ کے دل پر تیر کی طرح زخم انداز ہوا۔

ہند کے تاج کو دوسری زک

قطب الدین خلجی اس واقعہ کے بعد فکر میں رہا کہ مولانا رکن الدین کو حضرت محبوب الٰہی رہ سے برہم کرانے کی کوئی اور صورت پیدا ہو۔ مگر مرتے دم تک اس کو کامیابی نصیب نہ ہوئی ادھر تو وہ اس خیال میں تھا۔ ادھر حضرت مولانا رکن الدین خود کیلوکھری کی جامع مسجد

میں نماز کو تشریف لے گئے۔ جہاں حضرت محبوب الٰہی رہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس مسجد کا صحن بہت وسیع تھا۔ نماز کے بعد حضرت محبوب الٰہی رہ کو خبر دی گئی کہ مولانا رکن الدین اس مسجد میں تشریف لائے ہیں۔ حضرت یہ سنکر مولانا سے ملنے تشریف لے چلے۔ اور تمام وسیع صحن پیادہ طے کر کے مسجد کے دوسرے حصے میں پہنچے۔ اس وقت مولانا صاحب نماز میں مصروف تھے حضرت محبوب الٰہی رح مولانا کے پس پشت بیٹھ گئے۔ خلقت کا یہ عالم تھا کہ ٹوٹی پڑی تھی عوام کو نہایت تعجب تھا کہ حضرت محبوب الٰہی رح جیسے شان دار بزرگ نے مولانا کے پس پشت بیٹھنا کیونکر گوارا کر لیا۔ حالانکہ یہ کوئی عجیب بات نہ تھی عارفین ان ظاہری تکلفات کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ مگر آج کل کے زمانہ میں تو کبھی درویش اس بات کو قبول نہ کرے گا کہ دوسرے درویش کے پیچھے بیٹھ جائے اور ہزاروں مرید یہ تماشا دیکھ رہے ہوں۔ کیونکہ اس کے دل میں ضرور اندیشہ ہوگا کہ اس سے میرے مریدوں کے عقیدے میں کمزوری واقع ہوگی۔ اور میری وقعت کے مقابلہ میں اس شخص کی وقعت بڑھ جائے گی۔ جس کی تعظیم کر رہا ہوں۔ لیکن حضرت محبوب الٰہی رہ نے چھ سو برس پہلے اس وہم کو جھوٹا ثابت کر کے دکھا دیا کہ ایک غیر سلسلہ کے فقیر کی ایسی غیر معمولی تعظیم اپنے مریدوں کے سامنے کی۔ مگر حضرت کی وقعت کو بال بھر صدمہ نہ پہنچا بلکہ اور گرویدگی بڑھ گئی۔

جب حضرت مولانا نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت محبوب الٰہی رح کے ساتھ کمال تپاک سے مصافحہ و معانقہ کیا اور دونوں بزرگ ہاتھ پکڑ کے باتیں کرتے ہوئے دروازے پر تشریف لائے اور پالکیوں میں سوار ہو کر اپنے مقامات پر تشریف لے گئے۔

اس ملاقات کی خبر سلطان کو ہوئی تو اس نے بہت پیچ و تاب کھایا۔ مگر کیا کر سکتا تھا خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ آخر اس آتش حسد میں جلتا ہوا ایک دن اپنے مرغوب غلام خسرو خان کے ہاتھ سے محل ہزار ستون کی چھت پر قتل کیا گیا۔

ایک اور پراسرار مباحثہ

حضرت مولانا رکن الدین رح جس کام کے لئے بلائے گئے تھے وہ قطب الدین کے ساتھ قبر میں گیا۔ اب ان دونوں بزرگوں کی ایک اور ملاقات کا ذکر لکھا جاتا ہے جو موجودہ مشائخ کی سبق آموزی کے لئے ازبس موثر ہے اور اتحاد کا جذبہ ہر قلب میں پیدا کرتا ہے۔

ایک دن حضرت محبوب الٰہی رح اس مقام پر تشریف رکھتے تھے جہاں آپ کا مزار ہے کہ ایک شخص خبر لائے کہ حضرت مولانا رکن الدین ملاقات کو تشریف لاتے ہیں۔ حضرت نے خواجہ اقبال کو حکم دیا کہ کھانا تیار کرو۔ اسی اثناء میں خبر آئی تشریف لے آئے۔ حضرت بالا خانے سے تشریف لائے اور حضرت مولانا کا استقبال فرمایا۔ مولانا پالکی میں سوار تھے اور پاؤں میں کچھ تکلیف تھی لیکن اسی حالت میں نیچے اترنے کی کوشش فرمانے لگے۔ حضرت محبوب الٰہی رح نے اصرار کیا۔ اور نیچے نہ اترنے دیا پالکی زمین پر رکھ دی گئی۔ اور حضرت محبوب الٰہی رح بھی وہیں رونق افروز ہو گئے۔ اقبال نے دسترخوان چنا۔ کھانے لگائے گئے۔ انگوری سرکہ دور رکھا تھا۔ مولانا نے فرمایا سرکہ قریب لاؤ پیالی قریب سرکا دی گئی۔ حضرت محبوب الٰہی رح نے فرمایا۔ اسی شہر کا ہے مولانا نے جواب دیا۔ اسی لئے تیز ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ ہاں اور اسی واسطے عزیز ہے۔ اس پر لطف بات چیت کے بعد کھانا بڑھایا گیا۔ خواجہ اقبال نے ایک باریک کپڑے میں سو اشرفیاں باندھ کر اور چند تھان نہایت نفیس کپڑوں کے ان کے ہمراہ مولانا کے سامنے رکھے۔ اشرفیوں کی زردی کپڑے سے جھلک رہی تھی۔ مولانا نے فرمایا استر ذهبک (اپنے سونے کو چھپاؤ) اپنے جانے کو چھپاؤ۔ اپنے مذہب کو چھپاؤ۔ استر ذهبک وذهابک ومذهبک (اپنے سونے کو چھپاؤ اپنے جانے کو

چھپاؤ۔ اپنے مذہب کو چھپاؤ) اس جواب سے مولانا بہت محظوظ ہوئے۔ لیکن یہ تمام باتیں سلوک کے مقاموں کی تھیں۔ جنکو حضرت محبوب الٰہی رح نے اس برجستگی اور فصاحت سے ادا کر دیا۔ کہ مزاح کا مزاح اور بیان کا بیان۔ کوئی شخص اس اختصار اور موزونیت سے درویشی کی باتیں ادا نہیں کر سکتا۔

اس پر اسرار و لطیف گفتگو کے درمیان میں مولانا رکن الدین کے بھائی مولانا عماد الدین اسمٰعیل نے عرض کیا کہ اس وقت ہندوستان کے دو نامور بزرگ ایک جگہ جمع ہیں۔ اس سے بہتر اور کوئی موقع میسر نہیں آسکتا۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہجرت کا کیا سبب تھا۔ یعنی حضرت رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ منورہ کو کیوں ہجرت فرمائی۔ اگرچہ ظاہری طور پر تو ہر شخص جانتا ہے کہ کفار قریش کی یورش و آزار دہی کے سبب سے ہجرت ہوئی۔ کہ

ہر ظاہر کا ایک باطن ہے

اس ظاہری وجہ کا باطن بھی ضرور ہوگا۔ اس کی تشریح و توضیح کا طلبگار ہوں۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ حضرت سلطان المشائخ جواب ارشاد کریں گے۔ اور حضرت محبوب الٰہی سلطان المشائخ نے فرمایا۔ نہیں آپ ہی فرمائیں۔ آخر اس کسر نفسی کے تبادلہ کے بعد حضرت محبوب الٰہی نے اول ارشاد کیا کہ فقیر کے خیال میں مدینہ کے ناقصوں کی تکمیل اس بات پر منحصر تھی کہ حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر بار چھوڑیں سفر کی تکلیف برداشت کریں۔ عزیز و اقارب سے جدا ہوں اور مدینہ میں ہجرت کرکے تشریف لے آئیں۔

مولانا رکن الدین رح نے یہ جواب سنکر فرمایا۔ میرے نزدیک خود حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات کی تکمیل ہجرت پر منحصر تھی۔ جب آپ نے کامل طور سے

تمام تعلقات خانہ کو ترک کر کے بے وطنی اختیار کی۔ اس وقت دین مکمل ہوا۔ ان دونوں جوابوں میں ہر بزرگ نے نہایت مزہ دار اشارے کئے ہیں۔ جنکی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ مولانا عماد الدین کا سوال تو محض ہجرت کے متعلق تھا مگر ان حضرات نے جواب ایسے پیرایہ سے دیا کہ اپنی ذات کے متعلق بھی اشارے کنائے ہو گئے۔ مثلاً حضرت محبوب الٰہی رح کا یہ فرمانا کہ ہجرت مدینہ کے ناقصوں کی تکمیل کے لئے ہوئی۔ بظاہر نہایت سادہ و مؤدب جواب ہے۔ مگر حقیقت میں حضرت نے خود اپنی ذات کی نسبت اشارہ کیا ہے کہ مولانا رکن الدین کا ملتان سے ہجرت کر کے دہلی آنا میرے نقص کی تکمیل کے لئے ہے۔ اس کے جواب میں مولانا رکن الدین نے فرمایا کہ نہیں بلکہ خود میری تکمیل دہلی آنے اور آپ سے فیضیاب ہونے پر منحصر تھی۔ بہرحال یہ وہ برتاوے ہیں جن سے اعلےٰ درجہ کی یگانگت و اخلاص مندی سترشح ہوتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ علیحدہ علیحدہ سلسلہ کے تھے۔ گو اس میں سے ایک چشتیہ گھرانے کا آفتاب اور دوسرا سہروردیہ طریق کا ماہتاب تھا۔ لیکن طرز عمل سے وہ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آج کل کے مشائخ نے گلیم درویشی کو اس قدر تنگ کر دیا ہے اور میل جول و رسم اتحاد کو چھوڑے بیٹھے ہیں۔ حلقۂ نظام المشائخ نے اس بات کا بیڑا اٹھایا ہے کہ مشائخ میں پھر وہی اگلا سا اتحاد پیدا ہو قادری چشتی۔ نقشبندی۔ سہروردی۔ نظامی۔ صابری۔ مجددی وغیرہ سب شیر و شکر ہو کر رہیں اور اپنی ان اغراض کی جو سب طریقوں میں شامل ہیں اغیار کے مقابلہ میں حفاظت کریں۔ اس اتحاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب سلسلے خلط ملط ہو کر ایک معجون مرکب بن جائیں بلکہ منشا یہ ہے کہ فروعات کے ناجائز اختلافات مٹا دیئے جائیں۔ ہر شخص دوسرے سلسلہ کے بزرگ کا ادب اسی طرح ملحوظ رکھے

جس طرح کہ وہ اپنے سالار سلسلہ کا ادب کرتا ہے۔ اگر ایسا ہونے لگا اور ہمیں تسلی دی گئی ہے ایسا ہی ہو گا تو گلیم درویشی کی وسعت پھر اپنی اصل شان پر آجائے گا۔

خوش خلقی

(از صوفی۔ نومبر ۱۹۰۹ء)

خوش خلقی کی فضیلت - جس طرح ہمارے رسول صلعم کو تمام رسولوں پر فوقیت اور فضیلت ہے۔ اسی طرح ان کے اوصاف و خصائل سب پیغمبروں سے اعلےٰ ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے خود اپنے کلام قرآن شریف میں اس کا ذکر فرمایا ہے مگر وصف بھی وہ بیان کیا گیا جو تمام اوصاف کی جان ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔ تمہاری پیدایش (اے محمدؐ) بہت بڑے خلق پر ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا کہ حسن خلق ایسی شان دار چیز ہے کہ حضور رسول مقبول کے اعلےٰ اوصاف میں اس کا شمار ہوا۔ حضور رسول مقبول صلعم نے حسن خلق کی فضیلت میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کو ذیل میں قلم بند کر کے بدخلقی کی برائی کو لکھا جائے گا۔ اور اس کے بعد بتایا جائے گا کہ حسن اخلاق کیا چیز ہے۔

احمد حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رح سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کو پورا کروں ابو داؤد اور ترمذی نے ابوالدردا سے روایت کی ہے کہ حضرت صلعم نے فرمایا سب سے بھاری چیز جو میزان عمل میں رکھی جائے گی وہ خدا سے ڈرنا اور خوش خلقی ہو گی ایک دفعہ کسی نے آپ سے دریافت کیا دین کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا خوش خلقی۔ اس شخص نے آپ کے داہنی طرف آ کر یہی سوال کیا۔ اور یہی جواب پایا۔ یہاں تک کہ

چاروں رخ سے پوچھا اور ایک ہی جواب پایا۔ ایک اور آدمی نے دریافت کیا اعمال میں افضل کیا چیز ہے۔ فرمایا حسن خلق۔ کسی نے دریافت کیا۔ باعتبار ایمان کون افضل ہے؟ ارشاد ہوا۔ جو خلق میں سب سے اچھا ہے۔ طبرانی نے مکارم الاخلاق میں بروایت حضرت ابی ہریرہ رح بیان کیا ہے کہ حضرت صلعم نے فرمایا۔ اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے تو خندہ پیشانی اور خلق حسن میں بڑھ جاؤ۔ حضرت جریر بن عبداللہ کو ایک دفعہ ارشاد ہوا تجھ کو اللہ نے خوبصورت بنایا ہے۔ اپنے خلق کو بھی خوبصورت بنا۔ حضرت مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم اکثر یوں دعا فرماتے تھے۔ "اللھم احسنت خلقی فحسن خلقی، الہٰی تو نے میری اچھی صورت بنائی ہے تو میرا خلق بھی اچھا بنا،، دریافت کیا گیا بندہ کو سب سے اچھی کیا چیز دی گئی ہے؟ فرمایا۔ خلق حسن! دوسری جگہ فرمایا قیامت کے دن زیادہ محبوب اور میرے قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہوں گے جن کے اخلاق اچھے ہوں گے۔ فرمایا خوش خلقی گناہ کو اس طرح گھلاتی ہے۔ جس طرح دھوپ برف کو۔ فرمایا کوئی تدبیر عقل کی موافق نہیں ہوتی مگر خوش خلقی +

بد خلقی کی برائی

حضرت صلعم سے کسی نے دریافت کیا۔ نحوست کیا چیز ہے؟ فرمایا بدخلقی۔ فرمایا بدخلقی اعمال نیک کو اس طرح خراب کر دیتی ہے جس طرح سرکہ شہد کو بدمزہ کر دیتا ہے دوسری جگہ ارشاد ہے بدخلقی ایسا گناہ ہے۔ جو کبھی بخشا نہیں جائے گا نیز آپ نے فرمایا۔ بدخلقی آدمی دوزخ کی تہ میں ڈالا جائے گا۔ حضرت خواجہ حسن بصری رح نے فرمایا بدخلق انسان اپنی جان کو آفت میں خود پھنساتا ہے۔ وہب بن منبہ فرماتے ہیں۔ بدخلق ٹوٹا ہوا برتن ہے جو جڑ نہیں سکتا ہے نہ مٹی بن سکتا ہے

حضرت فضیل نے فرمایا بدکار خوش خلق کو بدخلق عابد پر ترجیح ہے +

خوش خلقی کیا چیز ہے

حضرت خواجہ حسن بصری رح فرماتے ہیں کہ خوش خلقی یہ ہے کہ کشادہ پیشانی سے رہے اور دولت کو خرچ کرے۔ اور کسی کو ایذا نہ دے۔ واسطی فرماتے ہیں کہ خوش خلقی کی یہ علامت ہے کہ نہ آدمی خود کسی سے دشمنی کرے۔ نہ کوئی اس سے خصومت رکھے۔ اور مفلسی و تونگری میں خلقت اس سے راضی رہے۔ شاہ کرمانی کے خیال میں ایذا سے باز رہنا اور مشقتوں کا سہنا خوش خلقی ہے۔ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں غربت کی شان سے لوگوں کے قریب رہنا خوش خلقی ہے۔ حضرت مولائے علیؑ فرماتے ہیں خوش خلقی تین چیزوں میں ہے محرمات سے بچنا، حلال روزی کا تلاش کرنا۔ اور عیال پر زیادہ خرچ کرنا۔ امام غزالی رح کی رائے میں خلق کی تعریف یہ ہے کہ انسان سے افعال بآسانی بلا فکر و تامل صادر ہوں۔ اگر وہ افعال عقلاً و شرعاً عمدہ ہیں تو خوش خلقی ہے ورنہ بدخلقی نیز فرمایا خلق فعل کا نام نہیں ہے کیونکہ بہت سے آدمی طبیعت کے اعتبار سے سخی ہیں مگر مفلسی کے سبب سخاوت نہیں کر سکتے یا بعض آدمیوں کی طبیعت بخیل ہوتی ہے لیکن ریاکاری سے خرچ کرتے ہیں۔ اور فرمایا جس طرح ظاہری جسم کا حسن محض آنکھوں یا صرف رخساروں کی موزونیت سے مکمل نہیں کہلاتا۔ جب تک کہ کل جسم کے اعضاء موزوں نہ ہوں اسی طرح خوش خلقی جو انسان کا باطنی حسن ہے چار چیزوں سے مکمل ہوتی ہے

ایک قوت علم۔ دوسرے قوت غضب۔ تیسرے قوت خواہش۔ چوتھے قوت عدل یعنی چاروں طاقتوں کو درجہ اعتدال پر رکھنا۔ علمی طاقت کی ضرورت اس لئے ہے کہ آدمی اس کے سبب اپنے اعمال اور عقائد میں راست رو رہ جاتا ہے۔ اسی طرح

سے غضب اور شہوانی طاقت پر قائم ہونا محاسن اخلاق کے لئے لازمی ہے اور یہ قابو قوت عدل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

خوش خلقی کیونکر پیدا ہوتی ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح انسان سے ظاہری جسم کی اصلاح ناممکن ہے اسی طرح باطنی درستی بھی دشوار ہے۔ بونا آدمی کوشش سے دراز قد نہیں بن سکتا کالا رنگ گورا نہیں ہو سکتا۔ بدصورتی خوبصورتی سے نہیں بدل سکتی۔ ایسے ہی جس کی سرشت میں کج اخلاقی ہے وہ تدبیر سے خوش اخلاق نہیں بن سکتا۔ مگر یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اول تو بعض جسمانی مثالیں اس مسئلہ پر کماحقہ ثابت نہیں آئیں دوسرے یورپ کے محققین نے اس کلیہ کو بھی غلط ثابت کر دیا ہے اور جسم کے وہ عارضے جن کی صحت ناممکن مانی گئی تھی ان کی تدبیروں سے گم ہوتے جاتے ہیں۔

بدخلقی کا بدل جانا فطرت سے ثابت ہے۔ درندے جانور انسان کی تربیت سے اپنی خونخوار خصلت کو بھول جاتے ہیں تو خود انسان دوسرے انسانوں کی تربیت سے اصلاح پذیر کیوں نہ ہو سکے گا۔ بعض آدمی تو پیدائشی نیک اور خوش خلق ہوتے ہیں لیکن جن کی عادت ابتدا سے بدخوئی اور تنگ مزاجی کی ہوتی ہے۔ وہ بھی خوش خلق بن سکتے ہیں۔ جس کی سب سے آسان ترکیب خوش اخلاق لوگوں کی صحبت ہے۔ صحبت زمانہ قدیم سے لے کر اس نئے زمانہ تک (جو پرانے عہد کی باتوں پر خندہ زنی کرتا ہے) یہ امر مسلم ہے کہ صحبت کا اثر تمام تعلیمات سے بڑھ کر ہے۔ ملنے جلنے کی تاثیر سے آدمی میں انسانیت پیدا ہوتی ہے اسی واسطے مشایخ عظام نے حسن صحبت کو تصوف کی درسگاہ مانا ہے۔

جس کو خوش خلقی سیکھنی ہو۔ یا کسی دوسرے کو خوش خلق بنانا ہو تو چاہئے کہ ایسے شخص کی صحبت اختیار کرے جو خوش اخلاقی کا مکمل نمونہ ہو۔

انسان کامل کے اخلاق

خوش خلقی کی ذہن نشین تعلیم ایک انسان کامل کی اخلاقی مثالوں کے بغیر دشوار ہے۔ اس واسطے حضرت رسالت مآب صلعم کے اخلاق کی چند مثالیں معتبر و مستند کتب سے اخذ کر کے لکھی جاتی ہیں۔ مشایخ صوفیہ ان مثالوں کو توجہ اور غور سے ملاحظہ فرمائیں۔ اور اپنے متکبرانہ اخلاق کی تبدیلی میں متوجہ ہوں۔

حضرت رسول مقبول صلعم کا قاعدہ تھا کہ بیمار کی عیادت کو خود تشریف لیجاتے غلام کی دعوت منظور کر لیتے۔ پاپوش مبارک کی خود مرمت کر لیتے۔ کپڑوں میں پیوند لگا لیتے۔ اپنے گھر والوں کے کام میں شریک ہو کر خود کام کرنے لگتے۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ صحابہ کو تکلیف نہ دیتے۔ بلکہ جو کام خود نہ کر سکتے تھے اس کو دوسرے سے کرانا برا تصور فرماتے تھے۔ جب آپ کا گزر لڑکوں پر ہوتا تو ان کو سلام کرتے ایک شخص آپ کے پاس آیا۔ وہ آپ کی ہیبت سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا کیوں ڈرتا ہے میں بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو قریش کی ایک عورت کا لڑکا ہوں جو خشک گوشت کھایا کرتی تھی۔ آپ کا دستور تھا کہ آپ اپنے اصحاب میں اس طرح سے مل جل کر بیٹھتے کہ اجنبی آدمی آپ کو پہچان نہ سکتا تھا۔ آخر صحابہ رضہ نے بار بار عرض کر کے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا جس پر آپ تشریف رکھنے لگے اور لوگوں کو اس امتیاز کے سبب شناخت کی دقت جاتی رہی۔

ایک دفعہ حضرت عایشہ رضہ نے آپ سے عرض کیا کہ میں آپ پر قربان جاؤں تکیہ لگا کر کھانا نوش فرمایا کیجئے۔ تاکہ تکلیف نہ ہو۔ آپ نے ارشاد کیا میں اسی طرح کھاؤنگا

جس طرح بندہ کھاتا ہے اور ویسا ہی بیٹھوں گا جیسا کہ بندہ بیٹھتا ہے آپ کے
اصحاب میں سے یا اور کوئی آدمی آپ کو پکارتا تو آپ جواب میں لبیک فرماتے جس قسم
کی بات کا آپ کے اصحاب میں پہلے سے ذکر ہوتا تو آپ بھی اسی کے متعلق باتیں کرتے
اگر وہ اشعار خوانی کرتے ہوئے ہوتے تو آپ بھی شعر پڑھتے۔ اگر اصحاب ہنستے تو
آپ بھی تبسم فرماتے اور سوائے حرام اور ناجائز امور کے اور کسی بات میں اصحاب کو زجر و
توبیخ نہ فرماتے تھے۔ فقیروں میں بیٹھتے۔ مساکین کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے جو لوگ
اخلاق میں افضل ہوتے ان کا احترام فرماتے تھے جو آپ کے سامنے عذر کرتا اس عذر
کو قبول کر لیتے۔ خوش طبعی فرماتے مگر جھوٹ کو نہ آنے دیتے تھے مباح کھیل کو دیکھتے
اور منع نہ فرماتے۔ آپ بچوں کے ساتھ دوڑتے کہ دیکھیں کون آگے نکلے لوگ
آپ کے سامنے بلند آواز سے بولتے تھے جس سے آپ کو اذیت ہوتی تھی۔
مگر آپ صبر فرماتے کسی کو مفلسی و بیماری کے سبب حقیر نہ جانتے تھے کسی بادشاہ
سے اس کی دنیاوی شوکت کے سبب خوف نہ کرتے تھے۔

آپ نے کبھی کسی عورت یا نوکر کو لعنت نہیں کیا۔ اگر آپ سے کہا جاتا کہ
کسی کے لئے بددعا کیجئے تو آپ اس کو دعا دیتے سوائے جہاد کے آپ نے کسی پر وار نہیں
کیا اگر آپ کے واسطے بچھونا بچھا دیا جاتا تو آپ اس پر لیٹ جاتے اور اگر بچھونا نہ بچھایا
جاتا تو آپ زمین پر لیٹ جاتے۔ جب کوئی آپ سے ملتا۔ سلام میں سبقت فرماتے
اور جب تک وہ چلا نہ جاتا تو آپ کھڑے رہتے۔ اگر کوئی آپ کا ہاتھ پکڑ لیتا تو آپ
چھڑانے کی کوشش نہ کرتے۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی چھوڑ دیتا۔ آپ کے پاس کوئی
آتا اور آپ نماز میں مصروف ہوتے تو نماز کو مختصر کر دیتے اور پوچھتے کہ تم کو مجھ سے
کچھ کام ہو تو کہو۔ کسی مجمع میں تشریف لے جاتے تو جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے۔ کسی کو
اٹھانے کی تکلیف نہ دیتے۔ مجمع میں اس طرح پھیل کر نہ بیٹھتے۔ ہاں گھر میں کبھی

کبھی پیر پھیلا کر بیٹھتے تھے، جو لوگ آپ کے پاس آتے تھے ان کی خاطر اور تعظیم
فرماتے قرابت داروں کے لئے اپنی چادر بچھا دیتے تھے جس تکیہ کے سہارے
آپ تشریف رکھتے تھے آنے والے کو وہ تکیہ عنایت فرماتے کہ اسکے سہارے
بیٹھو۔ اگر وہ عذر کرتا تو قسم دے کر تکیے کے سہارے آرام سے بٹھاتے۔ ہر شخص سے
ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ یہ سمجھتا کہ مجھ سے زیادہ اور کسی پر مہربانی نہیں ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ آپ کے حسن اخلاق کا مجمل سا بیان ہے۔ اس سے اندازہ
ہو سکتا ہے کہ مسلمان خاصکر صوفیائے کرام جو حضور کی پیروی و تقلید کو مقصود
حقیقی تصور کرتے ہیں۔ آیا واقعی اس قسم کے اخلاق رکھتے ہیں۔ یا کچھ فرق و تفاوت
ہے۔ اب تو مشائخ کی صحبتیں بنکر امراء کے درباروں سے بڑھ کر پائی جاتی ہیں
جہاں غرباء اور کم حیثیت لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا اور جو معمولی بات چیت ایسی
درشتی سے کرتے ہیں کہ سننے والا خواہ مخواہ مکدر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب
فقراء میں اگلے وقت کے بزرگوں کی سی تاثیریں نہیں پائی جاتیں نہ پہلا سا قال
ہے نہ حال۔ ہر چیز میں آسمان زمین کا فرق پڑ گیا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق
عنایت فرمائے کہ آقائے نامدار مرشد حقیقی حضرت رسول العرب والعجم صلعم کے
اخلاق سے سبق حاصل کریں۔ اور یورپ کی خودغرضانہ زندگی میں اسلامی صداقت
کے اخلاق کا زندہ نمونہ بنکر نمودار ہوں۔ تاکہ روحانیت کی پیاسی دنیا اسلامی
چشمہ حیات سے سیراب ہونے کو آگے بڑھے۔ آمین۔

خونی درویش

(از نظام المشائخ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء)

درویشی اور خونخواری یہ دونوں الفاظ آپس میں کیسے اجنبی اور نا آشنا معلوم

ہوتے ہیں جو وجود خاک نشینی کے سبب میدان ہستی میں موجود نظر آتا ہو۔ اسکو خدنگ اندازی سے کیا سروکار۔ مگر زمانہ نے اور اسکی غلط گو۔ بانوں نے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا سوڈانی ملا صاحب کے ہمراہیوں کا نام درویش مقرر کردیا تھا۔

سوڈان مصری حکومت کے جوار میں ایک علاقہ ہے جہاں کوئی ملا صاحب مہدی کے لقب سے نمودار ہوئے تھے۔ اور چند جنگجو اعراب کو ساتھ لیکر سوڈان فتح کرلیا تھا۔ انگریزوں نے جو مصری حکومت کے محافظ ہیں مصری فوج کے ساتھ ہوکر ملا مہدی صاحب اور ان کے رفقا سے جنگ بازی کی اور آخر شکست و فتح کی متعدد گردشوں کے بعد سوڈان فتح کرلیا۔ جواب تک قبضے میں ہے مجھ کو اس سے بحث نہیں کہ ملا حق پر تھے یا ناحق پر۔ انگریزوں نے ان سے جنگ بازی انصاف سے کی یا ناانصافی سے۔ کیونکہ غیر ملک اور غیر حکومت کے معاملات سے ہمیں کیا واسطہ۔ گفتگو اس معاملہ میں ہے کہ ملا مہدی کے سپاہیوں کو لفظ درویش سے یاد کیا جاتا تھا۔ اور تمام عربی۔ اردو۔ انگریزی اخبارات مہدی کی فوج کو درویش کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ آیا یہ لفظ موزوں تھا یا ناموزوں غلط تھا یا صحیح۔ جائز تھا یا ناجائز۔

میں کہتا ہوں کہ ملائی لشکر کو درویش کا نام دینے والا یا تو کوئی بڑا اہل دل اور درویشی طرق سے بے خبر تھا اور یا اس کو فقراء سے کچھ عداوت تھی اور دانستہ اس نے ان کے غیر متحرک اور ساکت گروہ کو بدنام و مشتبہ کرنے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا تھا۔

درویشوں کی پر امن معاشرت پر اس سے بڑھ کر کوئی حملہ نہیں ہوسکتا کہ ان کو شرتی۔ فسادی طبقے میں شمار کرانے کے واسطے ایسے ناجائز وسائل اختیار کئے جائیں۔

ملا مہدی کی فوج میں سوائے اس کے کہ وہ بد دیانہ زندگی کے مسلمان تھے کوئی بات درویشی کی نہ تھی۔ خود ملا مہدی صاحب عالمانہ حیثیت کے ایک بزرگ تھے جنھوں نے ظاہری اتقا کے سبب عوام پر ایک اثر حاصل کرلیا تھا۔ اور یہ اثر ان کی دانشمندی سے حصول مملکت میں ان کے لئے مفید ہوگیا تھا۔ نہ ان کا ضابطہ کوئی سلسلہ تھا اور نہ وہ درویشی طریقہ پر سلسلہ چلانا پسند کرتے تھے۔ بلکہ وہ ایک ملکی اور جنگی بیعت لیتے تھے جس کو فقیری بیعت سے کچھ علاقہ نہیں۔

ایسی صادق صورتوں میں کوئی منصف مزاج ملا صاحب کی فوج کو درویش نہیں کہہ سکتا۔ لہٰذا ان خونی درویشوں کو اصلی اور حقیقی درویشوں سے جدا کیا جاتا ہے۔

اب مسلمانوں میں کوئی خونی درویش باقی نہیں رہتا جس کی ہستی پر غور کرسکیں اور نظر ہندوؤں کے ایک فرقہ پر جاتی ہے جو باعتبار لباس درویش معلوم ہوتا ہے۔ مگر کام درویشی کے نہیں کرتا۔ فقیری لباس کی آڑ میں پوشیدہ ہوکر حصول مملکت کے منصوبے پورے کرتا۔ بم اندازی۔ اور پستول بازی کے کرشمے دکھاتا ہے۔

یہاں بھی ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں ہے کہ ان کی یہ کوشش جائز ہے یا ناجائز۔ بلکہ کلام اس روش اور طرز میں ہے کہ اس سیاسی جماعت کو خرقہ درویشی استعمال کرنا زیبا ہے یا نہیں۔

کلکتہ میں میں نے ان مصلحتی درویشوں کے سرگروہ بابو آربندو گھوش سے اسی مسئلہ کے متعلق باتیں کرنے کے لئے ملاقات کی۔ آربندو گھوش بنگال کے نامور فضلاء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی انگریزی قابلیت کا بڑے بڑے انگریزی دان

کو اعتراف ہے۔ اگر نوکری کرنی چاہیں تو نہایت معزز عہدہ انگریزی گورنمنٹ ان کو عطا کرے۔ مگر انھوں نے اپنی دانست میں زندگی ملک پر قربان کر دی ہے اس لیے بہت سادہ طریق سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ اور نوکری نہیں کرنا چاہیئے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا چند بنگالی بم اندازی اور بم سازی کے جرائم میں پکڑے گئے تھے۔ جن کی مدت تک اخباروں میں شہرت رہی تھی۔ بابو آربندو گھوش بھی اس جماعت کے ساتھ ماخوذ تھے۔ لیکن تحقیقات سے ان کی شرکت کا کوئی قانونی ثبوت نہ بہونچ سکا اس لیے بری کر دیئے گئے جیل خانہ سے واپس آکر انہوں نے کلکتے میں ایک ہفتہ وار انگریزی زبان کا اخبار جاری کیا جس کا نام کرم یوگ ہے کہتے ہیں اس اخبار کا لہجہ انقلاب انگیز ہے مگر ایسے عاقلانہ پیرائے سے مرتب کیا جاتا ہے۔ کہ قانونی مواخذہ کی حد دور رہ جاتی ہے۔

القصہ جب میں نے معلوم کیا کہ بابو آربندو خود بھی سنیاسی ہو گئے ہیں اور سنیاسی لباس میں پولٹیکل مشن چلا رہے ہیں۔ اور تمام پولٹیکل سنیاسوں کی افسری بھی ان ہی کو حاصل ہے تو ملنا ضروری سمجھ کر ایک دن ملاقات کی۔ آربندو اردو بہت کم جانتے ہیں اس لیے ترجمان کے ذریعے سے انگریزی میں باتیں ہوئیں۔

اول تو میں نے یہ دیکھا کہ آربندو کا لباس درویشی نہیں ہے اور نہ ان کے گرد و پیش کوئی اس لباس کا نظر آیا اس لیے جو خبر مجھ کو دی گئی تھی اس میں شبہ پیدا ہوا۔ پہلا سوال میں نے آربندو سے یہی کیا۔ کہ کیا تم سنیاسی ہو گئے ہو؟ جس کا جواب انھوں نے متانت آمیز تبسم سے یہ دیا کہ باعتبار ظاہر سنیاسی نہیں ہوں۔ مگر میرا دل سنیاس کو پسند کرتا ہے۔ اور وہ سنیاسی ہو چکا ہے میں نے دریافت کیا۔ تمہارے گرو کون ہیں؟ کہا سوامی وویکانند جی۔ اس کے بعد میں نے کرم یوگ

کی حقیقت پر گفتگو شروع کی۔ اور پوچھا۔ اخبار کا نام کرم یوگ کیوں رکھا ہے؟ جس کا جواب معمولی طور پر یہ دیا گیا کہ اس اخبار کا مقصد لوگوں کو اُن کے فرائض سے آگاہ کرنا ہے۔ اور یہی معنی کرم یوگ کے ہیں۔ کہا گیا کہ کیا گیتا کے کرم یوگ سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے؟ جہاں سری کرشن جی نے ارجن کو انقلاب پیدا کرنے کا فلسفہ بتایا ہے۔ یہ سُنکر آربندو نے اپنے دور اندیش دماغ کو جنبش دی اور کہنیاں میز پر ٹیک کر مصنوعی مسکراہٹ ظاہر کر کے سر ہلایا اور گیتا کی پیروی کا اقرار کیا۔ لیکن اس اقرار کے بعد ان کا چہرہ فکر مند نظر آنے لگا جس کو وہ اپنی عقلمندی سے دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

آخر سوالات کی نوبت اُس مقام پر آگئی جو ملاقات کا اصل مقصود تھا۔ کیونکہ اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ گو یہ خود درویشی لباس میں نہیں ہیں مگر پولٹیکل درویشوں کی مرشدی کا منصب انہیں کو حاصل ہے۔ یہ باتیں بطور سوال و جواب کے نہیں ہوئیں بلکہ مشورے کے طریق سے کہا گیا کہ جس طرح آپ کو ہندوستان اور اس کے علوم سے محبت ہے۔ میں بحیثیت ایک ہندوستانی کے ان علوم کا شیدا ہوں۔ ویدانت نے اپنی برتری و خوبی کا سکہ یورپ و امریکہ میں بھی چلانا شروع کر دیا ہے اور اس سے ہم کو اسی قدر خوشی ہے جتنی آپ کو ہوتی ہو گی مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض پولٹیکل کام کرنے والے جن کو ویدانت سے کچھ تعلق نہیں ہوتا جو سنیاس یوگ کی ذمہ داریوں سے ناآشنا ہوتے ہیں محض ملکی مصلحت سے سنیاسیوں کا لباس پہنتے ہیں۔ اور اس لباس میں بم اندازی و پستول بازی کرتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے درویشی لباس سلطنت کی نگاہ میں مشتبہ ہو جاتا ہے۔ اور بیچارے غیر پولٹیکل درویش خواہ مخواہ پولیس کے شک کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر حالات کی یہی صورت رہی تو ایک دن

تمام ملک کے فقرا، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اطمینان سے یادِ الٰہی نہ کر سکیں گے اور روحانیت کی تلقین کمزور ہو جائے گی۔ اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ روحانیت کو ضرر پہونچنا ملک کا کتنا بڑا نقصان ہے۔ جس دولت کے سبب ہندوستان اور ایشیا، تمام یورپ و امریکہ میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے وہ یہی روحانی جواہرات ہیں۔ آپ مادی دولت و حکومت کی طلب گاری میں اصل دولت کو برباد نہ کیجئے۔ اور اپنی جماعت کو فہمایش کیجئے کہ درویشی لباس ترک کر دے۔

اس کا جواب بابو اربندو نے ایسا دیا کہ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ باوجود اعلےٰ قابلیت کے اس اعتراض کا تسلی بخش جواب ان کے پاس نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے یہ عذر کر کے بات کو ٹالنا چاہا کہ سادھو اور درویش اپنی بد اعمالیوں کے سبب پہلے ہی مشتبہ و بدنام ہو رہے ہیں۔ اب مزید بدنامی کا اندیشہ نہ چاہیئے۔

مَیں نے کہا اعمال کی بدنامی اصلاح حال سے درست ہو سکتی ہے۔ لیکن اس ناجائز و خوفناک شبہ کی بدنامی ہرگز دور نہیں ہوگی جب تک یہ طریقہ ترک نہ کیا جائے۔ جو پولٹیکل درویشوں نے شروع کیا ہے۔ اس کا جواب کچھ نہ دیا گیا اور معلوم ہوا کہ بابو صاحب مکالمہ کی اہمیت کے سبب زیادہ توضیح و تشریح پسند نہیں کرتے۔ لہذا گفتگو کسی مفید نتیجہ پر پہونچنے سے پہلے ختم ہو گئی۔

لیکن ہر محب وطن ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس گفتگو کے مقصد کو ختم نہ سمجھے اور اس بات کی کوشش کرے کہ پولٹیکل مشنری درویشی ہیئت اختیار نہ کریں۔ سوامی وویکانند بابو اربندو گھوش کے گرو تھے۔ اور سوامی وویکانند کے گرو سوامی رام کرشن پرم ہنس جی تھے۔ جو دور آخر میں بنگال کے نہایت خدا رسیدہ اور عارف بزرگ مانے جاتے تھے۔ مَیں نے ان کی زندگی کے حالات پڑھے ہیں۔ عجیب

پر اثر زندگی تھی۔ دہلی کے رسالہ زبان نے اردو زبان میں ان کے سوانح شائع کئے ہیں جو لالہ چندو لال صاحب چاول والے سے چھاپنے میں دستیاب ہوتے ہیں۔ پرم ہنس جی کے تارک دنیا چیلے دو چار اب بھی کلکتے میں موجود ہیں۔ اور ایک مٹھ میں رہتے ہیں۔ سوامی سرودھانند جی سے جو باغ بازار کلکتہ میں رہتے ہیں مَیں نے بھی ملاقات کی۔ بہت اچھے درویش ہیں۔ اور اپنے گرو کے فیضان کا موثر حصہ رکھتے ہیں۔ مگر ان درویشوں میں پولٹیکل ہل چل کا کوئی لگاؤ میں نے محسوس کیا۔ میری خواہش ہے کہ سوامی پرم ہنس کے تمام ممتاز چیلے بالاتفاق اس بات کی کوشش کریں کہ درویشی صورت میں پولٹیکل مشن بند ہو جائے اور میں یقین کرتا ہوں کہ اگر وہ چاہیں تو بہت آسانی سے ایسا کر سکتے ہیں۔

بہرحال اس تمام سمع خراشی کا نتیجہ یہ ہے کہ درویشی لباس کی شان اور اصلی حیثیت کی حفاظت میں ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یکساں کوشش کریں۔ کیونکہ درویشی ہی ایک ایسا کوچہ ہے جس میں ہندو مسلمان کا امتیاز نظر نہیں آتا۔

درویشی شہادت نامہ

(از نظام المشائخ فروری ۱۹۱۴ء)

شہادت کیا چیز ہے؟

اصطلاح میں شہادت ایک قسم کی قربانی کو کہتے ہیں جو مذہبی یا ملکی یا معاشرتی امور کی حمایت میں ظاہر ہو یعنی اگر کوئی شخص مذہب یا ملک یا رسم و رواج کی حفاظت میں جان دیدے تو اس کو شہید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ دیگر ممالک اور مذاہب میں بھی شہادت کے لفظ کا کوئی مفہوم باقاعدہ موجود ہو۔ مگر ہم کو

جہاں تک اس مسئلہ میں گفتگو کرنی ہے اس کا تعلق صرف اسلام سے ہے۔

اسلام نے ظاہر ہو کر جو زبردست اور زلزلہ انگیز چیز پیدا کی وہ شہادت کا عقیدہ تھا۔ ہر شخص جس نے اپنے سر کو اسلام کے آگے جھکایا تھا اپنے وجود کو شہادت کی قربان گاہ میں فنا کر دینے کا متمنی اور طلبگار نظر آتا تھا۔ مسلمانوں کو یقین آ گیا تھا کہ

ایک وجود کی فنا دوسرے وجود کی بقا

کے لئے لازمی ہے۔ جب تک ہم یہ اجسام اسلام پر نثار اور فدا نہ کریں گے جسد اسلام مستحکم کائنات نہیں بن سکتا۔ لہٰذا ان کے بچوں۔ بوڑھوں اور عورتوں تک میں شوق شہادت کا جذبہ موجیں مارا کرتا تھا۔ اور بارہا دیکھا گیا کہ ان جنگی میدانوں میں جہاں بڑے بڑے شیروں۔ جوانمردوں کا کلیجہ کانپ جاتا ہے وہاں مسلمانوں کی خانہ نشین نازک کلائیوں والی عورتیں دلیری و بیباکی سے تلوار چلاتی تھیں۔ انسانی خون کے رنگ کی مہندی لگاتی تھیں۔ خاک و خون سے لتھڑے ہوئے کپڑے ان کو اطلسی و حریری لباس کا لطف دیتے تھے۔ اور عرصہ کارزار کی جگر خراش آہ و بکا ان کے کانوں میں شیریں نغمے بن کر جاتی تھی یہی وجہ تھی کہ تکبیروں کے نعرے مارتی ہوئی برچھیوں اور تلواروں کی نوکوں سے رزم گاہ کو درہم و برہم کر ڈالتی تھیں۔

یہ ذوق شہادت جس گھرانے کا عطیہ تھا خدا تعالےٰ نے اسی خاندان کو نمونہ بنا کر دکھایا جس سے شہادت کی اصلی شان نظر آگئی۔ مگر پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کائنات ہستی میں آکر اشیاء کا ظہور دوسری اشیاء کی شہادت یعنی فنا سے ہوتا ہے۔

جنس آدم سے قطع نظر کر کے عناصر اربعہ کے اجزاء کو علیحدہ علیحدہ دیکھئے کہ جب تک ایک وجود فنا نہیں ہوتا۔ دوسرا وجود موجود و ہستی پذیر نہیں ہو سکتا آگ کی ہستی کو معدوم کرنا ہو تو پانی کا وجود قربان کیجئے۔ پانی کا نشان مٹانا ہو تو آگ کی زندگی خرچ کیجئے۔

بھاپ جس کے بل پر تی دنیا کے کارخانے چل رہے ہیں۔ ریلیں دوڑتی پھرتی ہیں۔ جہاز سمندر میں لہراتے ہیں۔ یہ کیا ہے۔ اور کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ سب جانتے ہیں کہ پانی کی شہادت و قربانی سے جو آگ کی تپش سے ہوتی ہے بھاپ یا طلسمانی جسم تیار ہوتا ہے۔ یعنی پانی آتشی حرارت کے خنجر سے ذبح ہو کر اپنا جسم چھوڑ دیتا ہے اور بھاپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

دانہ خاک میں ملتا ہے۔ اپنا نام و نشان مٹاتا ہے تو شگوفہ اور درخت کا وجود ظاہر ہوتا ہے۔ دانہ شہید نہ ہو، اپنی ہستی قربان نہ کرے اور کہے کہ میں کیوں پرائے واسطے اپنے تئیں خاک میں ملاؤں اور برباد کروں تو تمام دنیا بھوکی مر جائے کیونکہ دانہ ہی قربانی ہے جس کی بدولت چار دانے پیدا ہوتے ہیں اور انسان و حیوان ان کو کھا کر اپنی زندگی قائم رکھتے ہیں۔

روئی اپنے وجود کی قربانی کرتی ہے تو سوت تیار ہوتا ہے اور آدمی کے تن پوشی کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ سب برہنہ مادر زاد پھرا کرتے۔ یا درخت کے پتوں سے ستر پوشی کرتے۔ مگر اس میں بھی یہ اندیشہ تھا کہ درخت پتوں کی قربانی سے انکار نہ کر دیں۔

کھانے میں صرف دانے کی مثال پر موقوف نہیں ہے۔ دانہ کے بعد شہادت اور قربانی کا سلسلہ دور تک جاتا ہے دانوں کی شہادت سے آٹا ظاہر ہوتا ہے آٹے کی شہادت سے روٹی نمودار ہوتی ہے۔ روٹی کی شہادت سے پرورش کا

ظہور ہوتا ہے۔ الغرض اسی شہادت کی بنیاد پر سب کارخانہ قائم ہے۔

تیل نہ جلے تو تاریکی کون دور کرے۔ روشنی کہاں سے پیدا ہو۔ بتی آتشی آرہ سر پر نہ چلوائے تو لوگ اندھیرے میں ٹکراتے پھریں۔ اور ہاں جن کے دم سے سب گھروں میں روشنی ہے اور جن کو حقارت سے تنکا سمجھا جاتا ہے وہ تو شہادت کی خاص شان رکھتے ہیں۔ ان کی مقبول شہادت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ۔

دیاسلائی کی شہادت

پر ذرا تفصیل سے غور کیجئے۔ عجیب دردناک قصہ ہے۔ جنگل میں ایک ہرا بھرا درخت لچکدار شاخوں اور نرم نرم پتوں سے چھایا ہوا کھڑا تھا۔ ایک صاحب گئے اور ایک ننھے وجود کے لالچ میں درخت کو شہید کر ڈالا۔ اس کے بعد ایک گرم چشمے کے کھولتے ہوئے پانی میں جوش دیکر کھال کھینچ لی۔ پھر مشین کے دوسرے خنجر سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تیسری مشین نے یہ صورت بھی مٹادی اور چھیلکر پرت بنا دیئے۔ چوتھی نے ان پرتوں کو بھی کتر ڈالا۔ اور دیاسلائی کے ننھے ننھے تنکے بن گئے۔ ان تنکوں کو اول گندک اور تیزاب کے پانی سے وضو کرایا گیا۔ اس کے بعد بکس کی مسجد میں بھیج دیا۔ اب میاں تنکے بکس کی سیاہ جانماز پر ایک ہی رگڑ دار سجدہ کرنے پائے تھے کہ غیبی خنجر آگ کی صورت میں نمودار ہوا اور تنکے کو شہید کردیا۔ تنکا تو آن کی آن میں جلکر نابود ہو گیا مگر اس کی شہادت ایسی مقبول ہوئی کہ فوراً خانۂ تاریک روشنی میں آگیا۔ مسجد۔ گرجا۔ مندر۔ شراب خانہ غرض ہر مقام نے تنکے کی شہادت سے فائدہ اٹھایا ۔

باغ میں تشریف لے جایئے۔ نہر کا پانی درختوں میں آکر جذب فنا ہو رہا ہوگا

باغ کی شادابی اسی شہادت پر منحصر ہے۔ پانی قربان نہ ہو تو درخت جلکر رہ جائیں ۔

ذرا پھولوں کو بھی دیکھئے۔ کیا بہار ہے۔ توڑ لیجئے۔ یہ نازک ہستی بھی شہادت کا ارمان رکھتی ہے اور وہ یہی ہے کہ آپ ان کو توڑ لیں۔ اور ٹہنیوں کے سایہ سے جدا کر کے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ ہار بنا کر گلے میں ڈالیں۔ چادر بنا کر قبر پر چڑھائیں سہرا گوندھ کر سر پر رکھیں۔ یا شکر ملا کر گلقند بنائیں۔ ہر حال میں خدمت کو حاضر ہیں۔ یہ قربانی سے انکار کرتے تو تفریح کی کتنی کیفیتیں نابود رہتیں ۔

ہاں مگر آپ کس قدر ناانصاف ہیں۔ ان پھولوں کو شہید کر کے گھر لے چلے تو ان کا دونا بنالیا تاکہ سورج کی تپش سے ان کا جسم کملا نہ جائے۔ مگر کربلا میں اپنے رسول کے نواسے کو شہید کر کے دھوپ میں پھینک دیا۔ اور حرم رسول ؐ کو جو گلاب کی پنکھڑیوں سے زیادہ نازک اور لطیف تھیں بے چادر کر کے پھرایا۔ یہ خیال نہ کیا کہ یہ بھی پھول ہیں مرجھا جائیں گے ۔

القصہ نتیجہ ان سب مثالوں سے یہ نکلا کہ شہادت دوسرے کے فائدے کے واسطے اپنا وجود فنا کر دینے کا نام ہے اور یہ ایسی چیز ہے جس کی تمام موجودات میں ضرورت ہے۔ جو شخص اس ضرورت سے انکار کرے وہ گویا تمام بدیہیات سے انکار کرتا ہے اور اس کو بصارت و بصیرت سے محروم سمجھنا چاہیئے ۔

شہادت خوشی کی چیز ہے یا غم کی؟

اب یہاں ایک نہایت باریک اور نازک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شہادت کارخانۂ عالم میں ایسی مفید اور ضروری شئے ہے تو اس کے سبب ماتم کیوں کیا جاتا ہے غمگینی و افسوس کو اس سے کیا تعلق۔ آہ و بکا کا اس سے کیا سروکار۔ مگر یہ کچھ ایسی پیچیدہ بات نہیں ہے جس کا جواب نہ ہو۔ جو چیز شہید ہو رہی ہے اُس کو تو اپنی

موت کا کچھ افسوس اور غم نہیں ہوتا۔ اور نہایت بے پروائی اور اطمینان سے اپنی ہستی مٹانے کو آمادہ ہوتی ہے۔ مگر غیروں کے دل پر اس کی چوٹ کا لگنا فطرتی امر ہے۔ بشرطیکہ ان دلوں میں آدمیت کا حس اور درد شناسی کا مادہ بھی ہو۔ پروانہ اگر شمع کی شہادت دیکھ نہ سکے اور بے چین ہو کر درو دیوار سے سر ٹکرائے تو شمع اور نفس شہادت پر کوئی الزام قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ تو بہت بڑی خود غرضی ہے کہ جس چیز نے ہمارے فائدے کے لیے اپنی جان دیدی اس کا ہم رنج بھی نہ کریں ۔

جو بتی پہلے جل چکی ہوتی ہے اس کا سرا آگ جلدی پکڑ لیتا ہے لیکن کوری اور نئی بتی کو جس نے پہلے آگ کی شکل نہ دیکھی ہو مشکل سے روشن کیا جاتا ہے اسی طرح جن دلوں میں اللہ تعالےٰ نے محبت کی آگ کا نشان لگا دیا۔ وہ تو عالم کی تمام شہادتوں میں درد محسوس کرتے اور اثر پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن جو ازل سے سنگین سرشت پیدا ہوئے ہیں۔ وہ اس بھید کو سمجھنا تو کجا سمجھنا چاہتے بھی نہیں ۔

شہادت حضرت امام علیہ السلام کے جس قدر واقعات شعرا نے لکھے ہیں اور اُن میں شہیدوں کی بے سروسامانی اور مایوسی کی تصویریں کھینچی ہیں یا ان کے اہل بیت کی بے قراری و نالہ زاری کے نقشے دکھائے ہیں۔ یہ سب ہمارے غم کو اُستوار اور اثر دار کرنے کے لیے ہے۔ ورنہ ان باتوں کی کچھ اصلیت نہیں۔ حضرت امامؑ اور ان کے خاندان نے شمع سے بڑھ کر سکوت و اطمینان ظاہر کیا۔ اور نہایت دلیری و ثابت قدمی سے ظہور حق کے لیے جانیں قربان کر دیں ۔

اسلام میں شہادت کی ابتدا

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ شہادت کیا چیز ہے۔ اور دنیا میں اسی کے بل پر صدہا کام چلتے ہیں اب یہ جاننا چاہیئے کہ اسلام میں شہادت کا دور کب شروع ہوا۔ اور کون کون بزرگ سب سے پہلے درجۂ شہادت کے وارث قرار پائے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب سے پہلے معرکہ کی لڑائی بدر میں پیش آئی تھی۔ جہاں آپ کے مٹھی بھر صحابہ نے کفار قریش کے دَل بادل لشکر کو میسکر رکھ دیا۔ اس معرکہ میں جو مسلمان شہید ہوئے ان کا مرتبہ بعد کی لڑائیوں کے شہدا سے زیادہ مانا جاتا ہے۔ بلکہ جو لوگ زندہ واپس آگئے وہ بھی شرکت بدر کا فخر شہدا کی طرح کرتے تھے۔ اور مسلمان ان کے فخر کو تسلیم کر کے ان کی عظمت و بزرگی کو دیگر مجاہدین پر فوق دیتے تھے۔ اسی طرح شہادت کا سلسلہ بدر۔ اُحد وغیرہ میدانوں کے سبب جڑ پکڑتا گیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں آج تک دین کی حمایت وحفاظت میں جان دینا شہادت خیال کیا جاتا ہے۔

مگر مشائخ صوفیہ نے جس شہادت کو سب سے برگزیدہ شہادت مانا ہے وہ فنائے نفس اور فنائے ماسوی اللہ ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام میں سب سے پہلے بڑی عمر والوں میں حضرت ابو بکر صدیقؓ تھے۔ اور چھوٹی عمر میں حضرت مولیٰ علیؓ تھے۔ اور عورتوں میں بی بی خدیجۃ الکبریٰؓ تھیں۔ جنھوں نے تمام قوم تمام ملک بلکہ تمام دنیا کو لات مار کے کلمۂ توحید کے آگے سر جھکا دیا۔ اور تمام ملکی قومی۔ خاندانی تعلقات کو ترک کر کے خنجر سے ذبح کر ڈالا۔

اس شہادت کے بعد دوسری شہادت کا رتبہ حضرت مولیٰ علیؓ کو حاصل ہوا اور وہ ہجرت کا زمانہ تھا۔ جبکہ کفار نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے شہید کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو آنحضرتؐ نے مدینہ شریف کو ہجرت کرنی چاہی مگر کفار نے گھیرا ڈال رکھا تھا جس سے بچکر نکلنا آسان نہ تھا۔ اس وقت ایک فدائی کی قربانی درکار تھی۔ جو آپ کے بستر پر لیٹ رہے اور آپکے عوض اپنی جان دیدے

لڑکر مرجانا دوسری بات ہے۔ یوں موت کے منہ میں کوئی نہیں جاسکتا۔ مگر آنحضرتؐ کے قدیمی فدائی علیؓ نے جو ایک بار شہادت کا رتبہ حاصل بھی کر چکے تھے۔ اس جان جوکھوں کو قبول کیا۔ اور بستر رسولؐ پر لیٹ گئے۔ ان دو شہادتوں کے بعد آپ کو تیسری شہادت بھی خدا تعالیٰ نے عطا فرمائی۔ یعنی ابن ملجم کے خنجر سے زخمی ہو کر شہید ہوئے۔

لڑائیوں کے قطع نظر اسلام میں سب سے پہلے شہید عمر فاروقؓ ہیں۔ جو ایک پارسی غلام کے ہاتھ سے مسجد میں شہید ہوئے۔ آپ کے بعد تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنیؓ کو مسلمانوں کے ایک گروہ نے غلط فہمی سے شہید کر دیا۔ اگرچہ آپ کی شہادت محض غلط فہمی کے سبب ہوئی۔ یعنی محمد بن ابی بکر وغیرہ کی جماعت کو آپکی نسبت وہ شبہ ہوا جس کا آپ کو مطلق علم نہیں تھا۔ اور جس میں آپ کی بے گناہی کا سب کو اقرار ہے۔ مگر آپ کی شہادت نے اس امر کا راستہ کھول دیا کہ خود مسلمان اپنے ہم مذہب لوگوں کو شہید کرنے لگے۔ حالانکہ کفار کے ہاتھوں شہادت کا جام حاصل ہوا کرتا تھا۔

حضرت مولیٰ علیؓ کی شہادت کے بعد ان کے بڑے صاحبزادہ سیدنا حضرت امام حسنؓ کو مسلمانوں نے زہر دے کر شہید کر دیا۔ اور پھر آپ کے چھوٹے فرزند سیدنا حضرت امام حسینؓ کو کربلا میں لے جا کر مسلمانوں ہی نے بھوکا پیاسا ذبح کر ڈالا۔ اور یہی وہ شہادت ہے جو اسلام میں سب شہادتوں سے زیادہ مشہور زیادہ پُر درد زیادہ درجہ والی۔ زیادہ ہر دلعزیز اور نہایت مہتم بالشان چیز مانی جاتی ہے۔ اسی شہادت کی یادگار میں ہم نے بھی اپنے سالہ کا شہید نمبر نکالا ہے۔

سیدنا و مولانا حسینؓ کی شہادت کو اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے۔ حالانکہ

ان سے پہلے اور ان کے بعد سیکڑوں مسلمان نہایت بیکسی اور بے بسی کے عالم میں شہید کئے گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو حالات اور واقعات سیدنا و مولانا حسینؓ کو پیش آئے۔ اُن کا ساز گزشتہ تاریخوں میں ذکر پایا جاتا ہے۔ نہ بعد کے تذکروں میں اس قسم اور اس طرز کا کوئی واقعہ موجود ہے۔

سیدنا و مولانا حسینؓ کی شہادت میں حسب ذیل خصوصیات تھیں جو اور کہیں نہیں پائی جاتیں۔

آپ اس زمانہ میں تھے جب کہ اسلام کا نشو و نما تازہ تازہ ہوا تھا۔ اور ہر فرد کے دل میں اپنے مذہب کی محبت ہر چیز سے زیادہ پیاری تھی۔ خاصکر اپنے رسولؐ کی الفت میں ہر مسلمان کا یہ عالم تھا کہ وہ دل و جان سے آنحضرتؐ پر نثار تھا اور آپکے تعلق کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز مسلمانوں میں بہت بڑے ادب کی مستحق مانی جاتی تھی۔ ایسی حالت اور ایسے زمانہ میں خاص رسولؐ کے نواسہ پر مسلمانوں کا یہ ظلم و ستم کرنا کس قدر عجیب تھا۔ اور حضرت مولانا و سیدنا حسینؓ کے دل پر جو صدمہ ان لوگوں کی بیوفائی و جفاشعاری کا گزرتا ہوگا وہ ہزار خنجر و سناں سے بڑھ کر تھا کہ کل کے دن جو لوگ رسولؐ کے نواسہ کی حیثیت سے اپنی آنکھیں میرے قدموں میں بچھاتے تھے آج وہ میرے سینہ پر پاؤں رکھ کر گلا کاٹتے ہیں۔

(۲) اہل و عیال کی معیت بھی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی نظیر تاریخ میں کم ملے گی۔ ممکن ہے کہ کسی مقتول کے ساتھ اُس کے خاندان والے بھی ہوں۔ مگر جو حالت سیدنا و مولانا حسینؓ کو بال بچوں کے ہمراہ ہونے سے پیش آئی۔ وہ اور کسی کو ہرگز ہرگز پیش نہ آئی ہوگی۔

مختلف سن و سال کی عورتیں۔ ننھے ننھے بچے۔ اور وہ بھی بیمار۔ جن کو ہر مذہب و قوم نے قابل رحم کہا ہے۔ تین روز بھوک پیاس سے تڑپے۔ مگر حضرتؓ کو بیکسی کے سبب

کچھ چارۂ کار نہ تھا۔ ہمارے عقیدے میں اُس وقت خیمۂ امامؑ کی یہ تصویر تھی۔

ظہر کا وقت۔ صحرائے عرب کی تپش۔ خیمے کی قناتوں سے آگ کی لپٹیں آ رہی ہیں۔ پانی کو بند ہوئے دوسرا دن ہے۔ حضرت امامؑ مستورات کے خیمے میں تشریف لےگئے۔ دیکھا، سب کے چہروں پر بھوک پیاس کی شدت سے ہوائیاں اُڑ رہی ہیں ہونٹ خشک ہیں۔ اور آنے والے وقت کے کھٹکے سے سب پر یاس و ہراس کا عالم طاری ہے۔ آپ نے اپنی ہمشیرہ حضرت زینبؑ سے کہا۔ بہن! اگر تمہاری رائے ہو تو یزید کی بیعت قبول کروں۔ کیونکہ مجھ سے تمہاری تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ اور خبر نہیں میرے بعد تم پر اور کیا کیا ظلم و ستم ہوں۔ بیعت کے اقرار سے یہ مصیبت جاتی رہے گی۔

اکیلے اور بے یار و مددگار بھائی کی زبان سے یہ کلمے سنکر حضرت زینبؑ نے اپنی چادر کے آنچلوں کو اُلٹ دیا۔ اور بنی ہاشم کے تیوروں میں بیباک ہو کر بولیں۔ بھائی! تم میرا امتحان لیتے ہو۔ ہاشم کے گھر کی لڑکیاں کم ہمت اور ڈرپوک نہیں ہوتیں وہ اپنی آن اور حق کی حمایت میں جان دینی کچھ بات نہیں جانتیں۔ اے بھائی جاہلیت کے زمانہ میں عرب کی عورتیں بچہ کی پیدائش کے وقت سب سے بڑی آرزو اس بچہ کی یہ کرتی تھیں کہ میدانوں میں تلوار چلانے والا خون میں نہلانے اور نہانے والا ہو۔ پھر اسلام نے اس جنگی خیال کو شہادت کے درجات بیان کرکے اور بھی مستحکم کر دیا۔ تو کیا ہم میں عرب نسل اور مسلمان ہونے کے باوجود حرارت نہیں ہے۔ یا حسین! میں علیؑ کی بیٹی ہوں۔ جو خون کے میدانوں میں بے پروائی سے گھوڑا دوڑاتا تھا۔ جو دشمن سے لڑتا نہیں تھا۔ بلکہ شیر کی طرح اپنے پنجوں سے کھلاڑیاں کرتا تھا۔ وہ جو فقر و فاقہ میں بھوک پیاس کو شرافت کا جوہر سمجھتا تھا۔ میں اپنے باپ کی اصل نسل لڑکی ہوں۔ مجھ کو عیب نہ لگا۔ میں تیرے سر کو خاک و خون میں تھڑا ہوا دیکھ کر فخر کروں گی کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ حق کی پاسداری میں کٹ کر مر جاتے۔ اگر

تو نے یزید کی بیعت قبول کرلی تو ہمارے خاندان کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی ننگ و عار نہ ہوگی کہ ایک فاسق فاجر کی بیعت زندگی کے لالچ سے منظور کرلی۔ میں جانتی ہوں کہ تو میری زندگی کا سہارا ہے۔ تیرے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ اور ایک فقط مجھ پر کیا منحصر ہے۔ رسولؐ کے خاندان میں ہر شخص تیرے وجود کو اپنا سہارا اور پناہ سمجھتا ہے۔ مگر غریب زینب کے لاچار بھائی۔ حق کی حمایت میں جان دیدے ہمارا کچھ فکر نہ کر۔ ہم تکلیف و مصیبت کو آسانی سے برداشت کرنے والے لوگ ہیں۔

حضرت زینبؑ کی تقریر ختم ہو چکی تو امامؑ اپنی زوجہ حضرت شہربانوؑ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔

تم کہو تمہارا کیا خیال ہے؟ بانو نے شرم آلود ادب سے نظریں جھکا کر کہا میں ہر حال میں تابع فرمان ہوں۔ جو میرے مالک کی مرضی ہو۔ اس کی تعمیل کروں گی۔ اگرچہ میں حضرت زینب کی طرح فخر تو نہیں کر سکتی۔ مگر اتنا ضرور عرض کروں گی کہ میری پیدائش ایران کے شہنشاہ کے گھر میں ہوئی تھی اور اب بھی ایک شہنشاہ کے گھر میں ہوں۔ بس ایک حرارت والا اور ہمت والا دل میرے سینہ میں بھی حرکت زن ہے۔ نازک وقت میں میری بے صبری کا اندیشہ میری توہین و حقارت ہے۔ اے امام! ان سب بچوں کو جو میری گود کی زینت ہیں بلکہ برسوں کی محنت سے پالا ہے۔ جن کے دیکھنے سے میری زندگی قایم ہے۔ میدان میں لیجائیے اور قربان کر دیجئے۔ میں بھی قربان اور یہ بچے بھی۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ حق کی پاسداری کے خیال کو میرے خیال سے چھوڑ دیں۔ چلئے۔ تاجدار ایران کی لڑکی اپنے شریف خون کا وصف دکھائے۔ میدان میں چلئے۔ میں رکاب تھام کر چلوں گی۔ اور تیر و سناں کے میدان میں آپ کے قدموں پر جان دیدوں گی۔

حضرت امامؑ عورتوں کی اس دلیری سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ شاباش

ایسا ہی خیال رکھنا۔

ان باتوں کے باوجود حضرت امام بشر تھے۔ جوان جوان بچوں کا سامنے کٹ جانا۔ ننھے ننھے بچوں کا بھوک پیاس سے بلکنا۔ اور اس پر یہ خیال کرنا کہ میرے بعد میرے ناموس کا کیا حال ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ بنی ہاشم اور رسولؐ کی گھر کی مستورات کے ساتھ دشمن ناروا بے عنوانی کریں۔

الغرض بال بچوں کی ہمراہی بھی ایک بڑا امتحان تھا جس نے حضرتؑ کی شہادت میں خاص خصوصیت پیدا کر دی تھی۔

(۳) بھوک پیاس میں بہت آدمی شہید ہوئے ہوں گے۔ مگر جو کیفیت حضرت امامؑ اور آپ کے خاندان کی تھی وہ کسی کو پیش نہیں آئی۔ پورے تین شب و روز کا بھوکا پیاسا رہنا۔ گرمی کا موسم۔ عرب کی گرمی۔ چاروں طرف سے تکلیف کے اسباب گھیرے ہوئے تھے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ بچوں کی زبانیں پیاس کے مارے نکلی پڑتی تھیں۔ اور حضرت امامؑ آنکھوں سے یہ تماشا دیکھتے تھے۔

امریکہ کے ایک تشریح داں ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ جب انسان ۷۲ گھنٹے پیاسا رہتا ہے تو اس کے ہر رونگٹے میں ایسی تکلیف ہوتی ہے گویا ایک انچ زخم پڑ گیا ہے۔ پس حضرت امامؑ اور آپ کے فدائی ۷۲ گھنٹے کامل پیاسے رہ کر جب برچھی و تلوار کے زخم کھاتے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ کیسی تکلیف ہوتی ہوگی۔ ایسی روحانی تکالیف کو برداشت کرنا اور امر حق سے قدم نہ ہٹانا شہادت کی اعلیٰ خصوصیت ہے۔

(۴) سارا کنبہ آنکھوں کے سامنے کٹ گیا۔ سوائے ایک طفل بیمار کے کوئی باقی نہ رہا جس سے بقائے نسل کی امید ہو۔ اس پر بھی قول کی حمایت کرنا اور مرنے کو تیار ہو جانا مخصوص شہادت کا ثبوت ہے۔

(۵) آخر وقت تک اپنے اشغال و قواعد کو جاری رکھنا اور مصیبت سے حواس

باختہ نہ ہونا بھی خصوصیات امام سے ہے۔ حد ہے کہ سر کٹتے کٹتے نماز پڑھی اور سجدہ ناغہ نہ کیا۔

اس شہادت کے بعد

اکثر سادات و مشائخ اسی قصور پر شہید ہوئے جو حضرت امامؑ کے ذمہ لگایا تھا یعنی جس طرح یزید بن معاویہ کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ حضرت امام حسینؑ کی زندگی میں اس کی بادشاہت چنگلی سے نہیں جم سکتی۔ اس لئے کسی بہانہ سے ان کا قصہ پاک کر دینا چاہئے ایسے ہی حضرت امامؑ کے بعد متعدد اماموں بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ سب آئمہ اطہار کو ہوس پرست نام کے مسلمان بادشاہوں نے شہید کیا۔ بعض سادات کو ایسی بے رحمی سے شہید کیا گیا کہ اگر ان کی تفصیل کی جائے تو کلیجہ کانپ اٹھے۔ سیدوں کے نازک جسم جو ریشمین کپڑوں کی طرح نرم اور خوبصورت تھے اموی اور عباسی خلفاء نے زندہ دیواروں میں چنوا دئے اور ان غریبوں نے پھڑک پھڑک کر جان دیدی۔

حضرت امام حسینؑ اور ان کی اولاد کے بعد پولیٹکل بدگمانی کی وبا ایسی پھیلی کہ جو شخص عبادت و یاد خدا کے سبب خلقت میں ذرا عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اُس بیچارہ پر آفت آجاتی۔ یا تو جلا وطن ہوتا۔ یا کسی شرعی بہانہ کی آڑ میں قتل کر دیا جاتا۔ اس کی صدہا مثالیں تاریخ کے صفحوں پر موجود ہیں جن میں سے چند اس شہید نمبر میں لکھی گئی ہیں۔ باقی پھر کسی موقع پر بیان ہوں گی۔

حضرت شہاب الدین مقتول کو محض ان کے کمالات و تسخیر خلائق کے سبب بے دردی سے مار ڈالا گیا۔ حضرت منصور کو خفیہ منصوبہ باز تصور کر کے دار پر کھینچ دیا۔ سرمد کو دارا کا درد مند یقین کر کے اور اس اندیشہ سے کہ کہیں سرمد لوگوں

کو انتقام کے لئے ٹکڑا نہ کر دے۔ بے سر و پا الزام لگایا گیا۔ اور بے گناہ قتل کیا
کیا گیا۔ سیدی مولہ کی ہر دلعزیزی و بزرگی و سخاوت جلال الدین خلجی جیسے نیک
سلطان کو بھی کھٹکی اور بیچارے درویش کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا۔

اب آخر زمانہ میں ترکی سلطان کے پیر و مرشد سید ابوالہدیٰ رفاعی کو نوجوان
ترکوں نے تاریک کوٹھری میں بند کر کے محض اس جھوٹے شبہ میں مار ڈالا کہ
سید صاحب ان کے پولیٹکل منصوبوں میں حارج تھے۔

یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ میں مسلمان بادشاہوں پر ظلم و سفاکی کا بیجا الزام
لگاتا ہوں یا میرے دل میں اسلامی حکومت کی کوئی عظمت نہیں ہے۔ بلکہ مقصود
بزرگان دین کی شہادت کا احوال لکھنا ہے۔ اس کے ضمن میں لازمی طور پر
قاتل و مقتول کے حق و باطل پر نظر جاتی ہے۔ اور آئمہ اطہار و مشائخ کبار بیگناہ
و مظلوم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب قصور شخصی و خود مختارانہ حکومتوں کا تھا
جو قاعدۂ اسلام کے برخلاف تھیں۔ اس لئے ہر مسلمان خود ایسی حکومت ہی کو سرے
سے ظلم و سفاکی کا مظہر خیال کرتا ہے۔ اسلام نے جمہوریت و مساوات کی حکومت
قائم کر کے کامل حریت انسانوں کو عطا فرمائی تھی۔ مگر لوگوں نے اپنے ذاتی فوائد
کی خاطر اصول اسلامی کو کچل ڈالا۔ اور شخصی بادشاہت قائم کر دی۔

شخصی حکومتوں میں ہمیشہ خود غرض لوگ بادشاہ کے گرد جمع رہتے ہیں اور
بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹ پتلی ہوتا ہے۔ اور کٹ پتلی نہ بنے تو کیا کرے۔ اکیلا
بشر تمام ملک کی خبر گیری و حفاظت میں مجبور محض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود مختار بادشاہ
حاشیہ نشین لوگوں کے بہکانے سے خونریزیاں اور بے انصافیاں کیا کرتے ہیں ہم کو
تسلیم کرنا پڑیگا کہ ان خود مختار بادشاہوں میں بعض ایسے دل و دماغ کے تھے کہ ہزاروں
آدمیوں کی متفقہ رائے ان کی رائے کے سامنے کمتی اور کمزور ثابت ہوتی تھی لیکن ایک آدمی

پھر ایک ہی ہے۔ ہمیشہ اس کی رائے پر بھروسہ نہیں ہو سکتا۔

جو بزرگان دین خود مختار بادشاہوں کی غلطیوں سے شہید ہوئے وہ سب
بیگناہ و مظلوم تھے۔ اس کی نسبت ہم کچھ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ مگر جن شہداء کا اس شہید
نمبر میں ذکر ہے وہ یقیناً ناکردہ گناہ شہید کئے گئے۔

غالباً یہ معلوم کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ بعض مشائخ کبار نے جب خود مختار
بادشاہوں کی دست درازیاں دیکھیں اور ان کو اپنی جان کا اندیشہ ہوا۔ تو انہوں
نے بارگاہ الہٰی میں بد دعا کی جس سے وہ بادشاہ ہلاک و تباہ ہو گئے۔ مثلاً ہمارے
سرتاج سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الہٰی کی نسبت جب ناتجربہ کار
سلطان قطب الدین خلجی کو مشورہ دیا گیا کہ حضرت سلطان المشائخ کا وجود پولیٹکل
حیثیت سے تیری تاجداری کو نقصان پہونچائے گا۔ تو اُس نے آپ کو آزار پہونچانا
چاہا۔ اور قریب تھا کہ ایک چاند رات کو حضرت کا آفتاب حیات ابر شر سے پوشیدہ
کر دیا جائے۔ تو خدا نے آپ میں اپنی شان قہاری کو ظاہر فرمایا۔ اور آپ نے گرجکر
یہ شعر پڑھنا شروع کیا ؎

اے روبہک چرا نہ نشستی بجائے خویش با شیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

یعنی او لومڑی اپنی جگہ کیوں نہ بیٹھی رہی۔ شیر سے پنجہ کیا۔ اپنی سزا دیکھی
آپ کا یہ شعر پڑھنا تھا کہ بادشاہ کے ایک منظور نظر غلام نے بادشاہ کا سر کاٹ ڈالا
اور اس طرح وہ آہنی پنجہ جو حضرت سلطان المشائخ محبوب الہٰی کی اذیت کے لئے
بڑھایا گیا تھا۔ غیب کے فولادی پنجے سے آن کی آن میں شکست کھا گیا۔

اب نئے زمانہ کے مورخ اس واقعہ پر طرح طرح کے حاشیے چڑھاتے ہیں۔
مگر ہمارا تو ایمان یہ ہے کہ خود مختار سلطان کو اور تمام دنیا کو یہ دکھانے کے واسطے
کہ کوئی دوسری با اختیار طاقت بھی موجود ہے۔ جو سب طاقتوں و حکومتوں کی

نگراں ہے اور زبردست کو زیردست کر دینا اُس کو کچھ مشکل نہیں۔ یہ واقعہ ظاہر ہوا۔ اور حضرت محبوب الٰہیؒ کو ظالم کے شر سے بچا یا گیا۔

ناظرین! خود مختار بادشاہوں کی حرکات پر اگر انصاف کی نظر ڈالیں گے۔ تو ان کو لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس وقت انسان انسان نہ تھا۔ بلکہ گھاس پھونس کی طرح بانجل زندگی بسر کرتا تھا جس کو ہر وقت جان و آبرو کا خوف دامنگیر تھا۔ آزادی جو ہر آدمی کی فطرت میں رکھی گئی ہے۔ ہمیشہ دل کے قیدخانہ میں بند رہتی تھی۔ زبان اور قلم پر مہر لگی ہوئی تھی کہ آزادی نکل نہ آئے۔ اس میں مذہب کو کچھ دخل نہ دینا چاہئیے۔ کیونکہ خود مختاری ہر ملک۔ ہر مذہب۔ ہر قوم میں یکساں مزہ پہونچاتی تھی۔ اس لئے میرا روئے سخن مسلمان بادشاہوں سے نہیں ہے۔

اُس زمانہ میں زیادہ دولت مند ہونا۔ زیادہ بارسوخ ہونا۔ زیادہ خداپرست ہونا قابلِ دار جرم تھا۔ کیونکہ اسی قسم کے آدمی بغاوت کا جھنڈا بلند کیا کرتے تھے۔ مگر آج خدا کے فضل سے جمہوریت و مساوات کا دور دورہ ہے۔ آزادی خوش وخرم ہر گھر میں چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ زیادہ دولت مندی زیادہ عزت کی علامت ہے۔ زیادہ رسوخ ہونا بادشاہ کی نظر میں ممتاز بناتا ہے۔ عبادت و خداپرستی کی روک ٹوک نہیں۔ بلکہ آزادی اتنی بڑی ہے کہ شیطان پرستی سے بھی کوئی نہیں روکتا۔

جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خدا آسمان سے مینہ برساتا ہے۔ تاکہ زمین میں سبزی و غلہ پیدا ہو۔ ہوا چلاتا ہے۔ تاکہ ہم اس کے سہارے زندہ رہیں۔ یا اُس نے چاند۔ سورج۔ پانی۔ بجلی۔ وغیرہ چیزیں انسان کے عام فائدہ کے لئے پیدا کی ہیں۔ اور ان کو دیکھکر ہم اپنے محسن اور رحیم خدا کا شکر و حمد بجالاتے ہیں۔ اسی طرح ہم کو اُسکا شکر بھی ادا کرنا چاہئیے کہ اس نے آزادی کی حکومت عطا فرمائی جس کے سایہ میں ہم نہایت بےفکری اور امن سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جس طرح چاہیں اور جس قدر چاہیں

خدا کی عبادت کرسکتے ہیں۔ کوئی مخل اور حارج نہیں۔ اب ہماری مذہبی برتری یا تقدس کی عالمگیری سے کسی کو بدگمانی نہیں ہوتی۔

اس لئے

اے حجروں اور گوشوں میں رہنے والے بزرگو باہر نکلو اور آزادی سے حق کے نعرے لگاؤ۔ اب منصور و سرمد کی طرح تم کو کوئی آنکھ اٹھاکر بھی نہیں دیکھیگا یہ توپ خانے۔ یہ فوجیں یہ رسالے یہ سنگینیں۔ یہ چھاؤنیاں سب تمہاری ہیں۔ اور تمہارے ہی امن و سکون کی خاطر پرے جمائے کھڑی ہیں بس شکر کرو۔ کس کا! آدمی کا نہیں۔ خدا کا۔ جس نے اپنی رحمت سے یہ آزاد حکومت عطا فرمائی۔

انگریز و ترک۔ افغان و ایران۔ ہند و جاپان۔ سب الفاظ ہیں۔ جن کو دیکھنا تمہاری شان سے بعید ہے۔ تم تو حقیقت و معانی کو دیکھنے والے ہو۔ یہ اشکال و صور تو تمہارے عقیدے میں نابود و بے حقیقت ہیں۔

ہاں یہ مت سمجھو کہ حکومت عیسائیوں کی ہے۔ یا موسائیوں کی ہے۔ انگریزوں کی ہے یا افغانیوں کی ہے۔ کالوں کی ہے یا گوروں کی۔ بلکہ طریقِ حکومت کو دیکھو اس کے اثر و کیفیت کو مشاہدہ کرو کہ اس میں کس قدر راحت۔ آسائش۔ سکون۔ و خاموشی ہے۔ خدا تعالیٰ اس آزادی کو برقرار رکھے۔ اور ہم کو دوسرا اعدو لیشی شہادت نامہ لکھتے وقت موجودہ وقت میں کوئی ظاہری واقعہ نہ ملے۔ اور مجبور ہو کر باطنی شہادت کی طرف رجوع کریں۔ جو شہادت اکبر ہے۔ اور جس کا حاصل کرنا ہر صوفی کا مقصود حقیقی ہے۔

مستانہ بزم مولود

نئے الفاظ میں پرانے مطالب

دن آگئے کہ ہم فراق کی راتوں سے رخصت ہوں۔ ربیع الاول کا چاند مغرب کے افق سے بلند ہونے کو ہے۔ آؤ سب مل کر اس کو دیکھیں اور چشم منتظر کو ٹھنڈا کریں۔

سارا جہاں اس ماہِ مبارک میں اُس پاکیزہ وجود کے میلاد کا ذکر کرے گا۔ جو تمام موجودات کے وجود کا سبب ہے۔ ہم بھی جہاں میں ہیں۔ کیوں نہ ایک بزم میلادُ منعقد کریں۔

نظام المشائخ کے اوراق کا فرش بچھا دو۔ حروف کے نقش و نگار سے محفل کو آراستہ کر دو۔ اور صدائے مستانہ سنو۔

ہم اپنی محفل میں اغیار کو نہیں بلائیں گے۔ نہ کوئی اس قابل ہے کہ اس شاندار بزم میں مدعو ہو سکے۔ رقعہ خدا کو گیا تھا۔ اور اس سے درخواست کی گئی کہ ہماری مجلس کی صدارت قبول فرمائے۔ اور اپنی مرضی سے جس کو چاہے شرکت جلسہ کی دعوت دے۔ سوائے لوح محفوظ کے چکنے کاغذ پر مطبع وحی میں حسب ذیل اعلان چھپوا کر اخبار القرآن میں شائع کر دیا۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

خدا اور اُس کے فرشتے نبیؐ پر درود پڑھتے ہیں۔ تم بھی اے ایمان والو اُس پر درود و سلام بھیجو۔

چونکہ القرآن کثیر الاشاعت اخبار ہے۔ بےشمار اہل ایمان اس بزم درود و سلام و ذکر خیر الانام کی شرکت کے لئے جمع ہو گئے ہیں۔ اس وقت صدر انجمن صاحب جل جلالہٗ و عم نوالہٗ کرسی لامکان پر جلوہ افروز ہوئے۔ اور اپنی افتتاحی تقریر اُردو میں شروع کی جو یہ تھی۔

فرشتو! اور جنٹلمین (ایمان دار آدمیو!) میں خوش ہوں کہ تم سے آج کے دن شان تعین میں خطاب کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ تمہاری کوئی بزم ایسی نہیں ہے جو میرے دائرۂ وجود سے باہر ہو۔ مگر یہ محفل ایک خاص محفل ہے جس میں علانیہ میری تجلی تم سے ہمکلام ہوتی ہے۔ آج کے جلسہ کی غرض یہ ہے کہ ہم سب اسم کثرت کی شان میں اس شئے کا ذکر کریں۔ جو ہماری ذات وحدت آب کا ذکر بشکل حمد و ثنا میں تھا۔ جس کو ہم نے احمدؐ بھی کہا اور محمدؐ بھی۔

میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ کس کا ذکر کیونکر کیا جائے گا۔ سنو سنو ہر وجود اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے اس کا ذکر کرے۔ مگر ہم کبریائی کے مالک ہیں۔ سب کچھ ہمارا ہے۔ سب کچھ ہم میں ہے۔ سب کچھ ہم سے ہے۔ اور سب کچھ ہم ہیں۔ اس لئے ہمارا ذکر صرف ان الفاظ میں ہوگا۔ اے کملی اوڑھنے والے اُٹھ۔ رات کو ہماری یاد کر۔ لوگوں کو ہدایت کا رستہ بتا۔ ہماری شان سے اُن کو آگاہ کر۔ مانگ۔ تجھ کو دیا جائیگا۔ بول اس کو سنا جائے گا۔ سفارش کر۔ قبولیت ہوگی۔ اے اندھیری رات کی مثل سیاہ گیسو والے۔ اے صبح کی روشنی کے مانند منور چہرے والے

میں تجھ کو پسند کرتا ہوں۔ تو ازل سے ابد تک میرا ہے۔ تجھ پر میرا سلام۔

فرشتو! تمہارا ذکر یہ ہے کہ اس آدم زاد کو سجدہ کرو۔ مومنو! تم اس کی اطاعت کرو۔ یہی تمہارا ذکر ہے۔

جب حضرتِ قدوس اپنا ایڈریس ختم کر چکے تو ایک گدڑی پوش مست کھڑا ہوا۔ اور اس طرح بولنے لگا۔

جناب باری! و دیگر یاران خراباتی! میں دیوانہ ہوں اور عقل و خرد سے بیگانہ۔ اجازت دیجئے کہ میں اپنے ممدوح کا ذکر اس قاعدہ اور ضابطہ سے نہ کروں جس کا مجمل خاکہ پریسیڈنٹ صاحب نے قایم کرکے دکھایا ہے۔ بلکہ ذوق و شوق اور ولولے میں جو چاہوں کہہ جاؤں۔ چیرز (نعرۂ حق) امید ہے کہ آنریبل چیرز مین مجھ ذرۂ بمقدار کی گستاخی و بے ادبی سے ناراض ہوکر ظلوماً جھولاً سے زیادہ کوئی اور دوسرا خطاب تجویز نہ فرمائیں گے۔ خندہ اور زور شور سے چیرز (نعرۂ حق)

میں حضرت سبحانی سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآنی دعوت نامہ میں جس نبیؐ پر درود و سلام بھیجنے کا ذکر ہے۔ وہ کونسا نبی ہے۔ کیا وہ جس کا خاکی وجود سب سے پہلے بنا۔ اور جس کے متحرک ہونے کے واسطے خود ذات ربانی نے اپنے دم کو بلایا۔ اور آ۔ دم کے حکم کو سنکر سب موجودات نے اس پیکر خاک کو آدم کا لقب دیا۔ یا وہ جس کو نوحؑ کہتے ہیں۔ جس نے حضرت کی شان قہر کو طوفان آپ پر علانیہ جنبش کرتے دیکھا۔ یا نبی مراد آپ فطرتاً ایمان لانے والے ابراہیمؑ سے ہے۔ یا جنھوں نے طور پر راز و نیاز کے کلام کے بعد ذرا بیباکانہ جرأت پردہ اٹھانے کی کی تھی۔ یا نبی کا لفظ ابن مریم کی شان میں فرمایا گیا ہے۔ جو آپ کی حیران کرنیوالی نشانیوں میں ایک نشانی تھے۔

اگر یہ سب نہیں تو کیا وہ یتیم جو امن کی آغوش میں پلا۔ وہ چھوٹے سے قد پر لمبے لمبے بال بکھیرے لکڑی ہاتھ میں لئے بکریاں چراتا تھا۔ وہ جو کمبل اوڑھ کر آیا۔ اور

دوشالہ اوڑھا کر گیا۔ جس نے جَو کا آٹا کھایا اور گیہوں کا کھلایا؛

پروردگار! ہمیں بتا۔ کیا وہی جو امن میں شیر کی طرح شیریں اور صاف۔ اور جنگ میں شیر کی مانند دلیر و صف شکن تھا۔ کیا وہی جو نیزۂ و شمشیر کا مالک اور میدان کارزار کی رونق تھا جس کی پشت دشمن نے کبھی نہیں دیکھی۔ جس کا قدم ہمیشہ آگے بڑھتا رہا۔ وہ جسکو آپ کی گورنمنٹ نے خلقِ عظیم کی ڈگری عطا فرمائی۔ وہ جو غریبوں۔ بیکسوں لاوارثوں کا ولی و سرپرست تھا۔ وہ جو مدینہ کی گلیوں میں معمولی آدمیوں کی طرح چلتا پھرتا تھا۔ آہ۔ آہ۔ آہ۔ وہ تو نہیں۔ جس کی آنکھوں کی یاد نے ہم کو آنسوؤں کے دریا میں ڈبو رکھا ہے؛

اگر وہ ہے تو ہم کو اجازت دی جائے کہ اُس کی محبت کا جام سر جلسہ نوش کریں (چیرز) اور اس دربار میں جتنے مجھ سے مستانے ہیں انکو رخصت ملے تاکہ

خراباتیاں مے پرستی کنند محمدؐ بگویند و مستی کنند

رند خراباتی اس قدر گفتگو کرنے پایا تھا کہ محفل میں گردش پیدا ہوئی۔ اور عاشقان سوختہ تڑپنے لگے۔ تجلی کی بجلیاں چمکنے اور کڑکنے لگیں۔ اور ہوا جو ہوا۔ بیچارہ حسن کی مجال نہیں کہ اس سے زیادہ اس محفل کی نسبت زبان کھولے۔

صاحب بزم میلاد کے اخلاق

اس مستانہ و بیباکانہ بیان کے بعد بزم میلاد کے سالکانہ طریق کو ادا کیا جاتا ہے جس میں میرے عقیدے میں سب سے زیادہ مفید اور ضروری صاحب میلاد کی اخلاقی خوبیوں کا تذکرہ ہے جن کو احادیث کی معتبر روایتوں سے اخذ کرکے لکھا جاتا ہے۔

جس طرح ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام رسولوں پر فوقیت اور فضیلت ہے۔ اسی طرح ان کے اوصاف و خصائل سب پیغمبروں سے اعلیٰ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے

خود اپنے کلام قرآن شریف میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر وصف بھی وہ بیان کیا گیا جو تمام اوصاف کی جان ہے۔ چنانچہ یہ ارشاد ہوا انک لعلی خلق عظیم تمہاری پیدائش (اے محمدؐ) بہت بڑے خلق پر ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حُسن خلق بڑی شاندار چیز ہے کہ حضور رسول مقبولؐ کے اعلیٰ اوصاف میں اس کا شمار ہوا۔ خود حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حُسن خلق کی فضیلت میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کو ذیل میں قلمبند کیا جاتا ہے۔

احمد حاکم اور بیہقی نے حضرت ابی ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کو پورا کروں۔ ابو داؤد اور ترمذی نے ابولدردار سے روایت کی ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ سب سے بھاری چیز جو میزان اعمال میں رکھی جائے گی وہ خدا سے ڈرنا اور خوش خلقی ہوگی۔ ایک دفعہ کسی نے آپ سے دریافت کیا۔ دین کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا۔ خوش خلقی اس شخص نے آپ کے داہنی طرف آکر یہی سوال کیا۔ اور یہی جواب پایا۔ یہاں تک کہ چاروں رُخ سے پوچھا اور ایک ہی جواب پایا۔

ایک اور آدمی نے دریافت کیا۔ اعمال میں افضل کیا چیز ہے؟ فرمایا حسن خلق کسی نے عرض کیا۔ باعتبار ایمان افضل کون ہے۔ فرمایا۔ جو خلق میں سب سے اچھا ہے طبرانی مکارم الاخلاق میں بروایت حضرت ابی ہریرہؓ کے بیان کیا ہے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے تو خندہ پیشانی اور خلقِ حسن میں بڑھ جاؤ۔

حضرت جریر بن عبداللہ کو ایک دفعہ ارشاد ہوا تجھ کو اللہ نے خوبصورت بنایا ہے۔ اپنے خلق کو بھی خوبصورت بنا۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت

جن کے اخلاق اچھے ہیں۔ فرمایا خوش خلقی گناہ کو اس طرح گلا دیتی ہے۔ جس طرح دھوپ برف کو۔ فرمایا۔ کوئی تدبیر عقل کے موافق نہیں ہوتی۔ مگر خوش خلقی۔

بدخلقی کی بُرائی

حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی نے دریافت کیا۔ نحوست کیا چیز ہے؟ فرمایا بد خلقی۔ فرمایا بدخلقی نیک اعمال کو اس طرح خراب کر دیتی ہے۔ جس طرح سرکہ شہد کو بدمزہ کر دیتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ بدخلقی ایسا گناہ ہے جو کبھی بخشا نہیں جائے گا نیز آپ نے فرمایا۔ بدخلق آدمی دوزخ کی تہ میں ڈالا جائے گا۔

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ بیمار کی عیادت کو خود تشریف لیجاتے۔ غلام کی دعوت کو منظور کر لیتے۔ پاپوش مبارک کی خود مرمت کر لیتے۔ کپڑوں میں پیوند لگا لیتے۔ اپنے گھر والوں کے کام میں شریک ہو کر خود کام کرنے لگتے۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ صحابہ کو تکلیف نہ دیتے۔ بلکہ جو کام خود کر سکتے تھے اس کو دوسرے سے کرانا بُرا تصور کرتے تھے۔ جب آپ کا گزر لڑکوں پر ہوتا ان کو سلام کرتے۔

ایک شخص آپ کے پاس آیا۔ وہ آپ کی ہیبت سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا کیوں ڈرتا ہے میں بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو قریش کی ایک عورت کا لڑکا ہوں۔ جو خشک گوشت کھایا کرتی تھی۔ آپ کا دستور تھا کہ اپنے اصحاب میں اس طرح مل جل کر بیٹھتے کہ اجنبی آدمی آپ کو پہچان نہ سکتا تھا۔ آخر صحابہ نے بار بار عرض کر کے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا۔ جس پر آپ تشریف رکھنے لگے۔ اور لوگوں کو اس امتیاز کے سبب شناخت کی دقت جاتی رہی۔

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے آپ سے عرض کیا کہ میں آپ پر قربان جاؤں تکیہ

لگا کر کھانا نوش فرمایا کیجئے۔ تاکہ تکلیف نہ ہو۔ آپ نے ارشاد کیا میں اسی طرح کھاؤں گا جس طرح بندہ کھاتا ہے اور ویسا ہی بیٹھوں گا۔ جیسا کہ بندہ بیٹھتا ہے۔ آپ کے اصحاب میں سے یا اور کوئی آدمی آپ کو پکارتا تو آپ جواب میں لبیک فرماتے جس قسم کی بات کا آپ کے اصحاب میں پہلے سے ذکر ہوتا۔ آپ بھی اُس کے متعلق باتیں کرتے۔ اگر وہ اشعار خوانی کرتے ہوئے ہوتے تو آپ بھی شعر پڑھتے۔ اگر اصحاب ہنستے تو آپ بھی تبسم فرماتے۔ اور سوائے حرام اور ناجائز امور کے اور کسی بات میں صحابہ کو زجر و توبیخ نہ فرماتے تھے۔ فقیروں میں بیٹھتے مساکین کو کھانا اپنے ساتھ کھلا لیتے۔ جو لوگ اخلاق میں افضل ہوتے ان کا احترام فرماتے تھے۔ جو آپ کے سامنے عذر کرتا۔ اس کا عذر قبول کر لیتے۔ خوش طبعی فرماتے۔ مگر جھوٹ کو نہ آنے دیتے۔ مباح کھیل کو دیکھتے اور منع نہ فرماتے۔ اپنے اہل کیساتھ دوڑتے کہ دیکھیں کون آگے نکلے۔ لوگ آپ کے سامنے بولتے تھے۔ جس سے آپ کو اذیت ہوتی تھی۔ مگر آپ صبر فرماتے کسی کو مفلسی و بیماری کے سبب حقیر نہ جانتے تھے۔ کسی بادشاہ سے اس کی دنیاوی شوکت کے سبب خوف نہ کرتے تھے۔

آپ نے کبھی کسی عورت یا ذکر کو لعنت نہیں کیا۔ اگر آپ سے کہا جاتا کہ کسی کے لئے بد دعا کیجئے تو آپ اس کو دعا دیتے۔ سوائے جہاد کے آپ نے کسی پر وار نہیں کیا۔ اگر آپکے واسطے بچھونا بچھوا دیا جاتا تو آپ اُس پر لیٹ رہتے۔ اور اگر بچھونا نہ بچھایا جاتا تو زمین پر لیٹ جاتے۔ جب کوئی آپ سے ملتا سلام میں سبقت فرماتے۔ اور جب تک وہ چلا نہ جاتا آپ کھڑے رہتے۔ اگر کوئی آپ کا ہاتھ پکڑ لیتا تو آپ چھڑانے کی کوشش نہ کرتے۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی چھوڑ دیتا۔ آپ کے پاس کوئی آتا اور آپ نماز میں مصروف ہوتے تو نماز کو مختصر کر دیتے اور پوچھتے کہ تم کو مجھ سے کچھ کام ہو تو کہو۔

کسی مجمع میں تشریف لیجاتے تو جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے کسی کو اُٹھانے کی تکلیف نہ دیتے۔ مجمع میں اس طرح پھیل کر نہ بیٹھتے۔ ہاں گھر میں کبھی کبھی پیر پھیلا کر بیٹھتے تھے۔ جو لوگ آپ کے پاس آتے ان کی خاطر اور تعظیم فرماتے۔ قرابت داروں کے لئے اپنی چادر بچھا دیتے

جس تکیہ کے سہارے آپ تشریف رکھتے تھے آنے والے کو وہ تکیہ عنایت فرماتے کہ اس کے سہارے بیٹھو۔ اگر وہ عذر کرتا تو قسم دے کر تکیہ کے سہارے آرام سے بٹھلاتے۔ ہر شخص سے ایسا برتاوا کرتے کہ وہ یہ سمجھتا کہ مجھ سے زیادہ اور کسی پر مہربانی نہیں ہے۔

قصہ مختصر یہ آپ کے حسن اخلاق کا مجمل سا بیان ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان خاصکر صوفیائے کرام جو حضورؐ کی پیروی و اتباع کو مقصود حقیقی تصور کرتے ہیں۔ آیا واقعی اس قسم کے اخلاق رکھتے ہیں۔ یا کچھ فرق و تفاوت ہے۔ اکثر مشائخ کی محفلیں تکبر امرا کے درباروں سے بڑھ کر پائی جاتی ہیں۔ جہاں غربا و کم حیثیت کے لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اور جو معمولی بات چیت ایسی درشتی سے کرتے ہیں کہ سننے والا خواہ مخواہ مکدر ہو جائے یہی وجہ ہے کہ اب فقرا میں اگلے وقت کے بزرگوں کی سی تاثیریں نہیں پائی جاتیں۔ نہ پہلا سا قال ہے نہ حال۔ ہر چیز میں آسمان و زمین کا فرق پڑ گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عنایت فرمائے کہ آقائے نامدار مرشد حقیقی حضرت رسول العرب والعجم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اخلاق سے سبق حاصل کریں۔ اور یورپ کی خود غرضانہ زندگی میں اسلامی صداقت کے اخلاق کا نمونہ بن کر نمودار ہوں۔ تاکہ روحانیت کی پیاسی دنیا اسلامی چشمۂ حیات سے سیراب ہونے کو آگے بڑھے۔ آمین۔

درویشی مرکز

(از نظام المشائخ جون سنہ [illegible])

آج کل ہر قوم اپنے استحکام اور قرار و جود کے لئے ایک مرکز قائم کر رہی ہے مسلمانوں کا قومی و دینی مرکز تیرہ سو برس سے عرب میں موجود ہے۔ ہر فرقہ و ہر عقیدہ کا مسلمان مکۂ معظمہ و مدینۂ منورہ کو اپنی ہستی کی قرارگاہ سمجھتا ہے۔ مگر ضرورت ہے کہ اس عام مرکز کے

علاوہ اپنے مشرب و طریقہ کے جداگانہ مرکز بھی ہوں جو مرکز اعلیٰ کی شاخیں تصور کی جائیں۔

مثلاً علمی حیثیت سے مسلمانوں کا دینی مرکز ندوہ قرار پایا ہے۔ اور دنیاوی علی گڑھ تو مناسب ہے کہ درویشی مرکز اجمیر شریف مقرر کیا جائے۔ ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ سب سلسلوں سے فروغ رکھتا ہے۔ اور قادریہ و سہروردیہ خاندان بھی بوجہ قربت خاص کے اس ملک میں چشتیوں کے دست و بازو ہیں۔ ان دونوں سلسلوں کو اجمیر شریف کے مرکز بنانے میں ہرگز تامل نہ ہوگا۔

رہ گیا نقشبندیہ طریقہ۔ اس کے متعلق عوام میں مشہور ہے کہ اس خاندان کے مشائخ سرہند کے مقابلہ میں اجمیر شریف کو ترجیح نہ دیں گے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ حضرات نقشبندیہ ایسے ناسمجھ نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ تین سلسلوں سے الگ ہو کر اپنا مرکز جداگانہ بنائیں گے۔ کیونکہ ان میں خدا کے فضل سے بڑے بڑے فاضل اور روشن خیال بزرگ موجود ہیں۔ جو مرکز کی اہمیت اور اجماع کی خوبی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنے ہم مشرب بھائیوں کا اس معاملہ میں ساتھ چھوڑ دیں گے۔

اجمیر شریف کو مرکز بنانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں کے سجادہ نشین کو سب مشائخ ہند کا پیشوا تسلیم کر لیا جائے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ چونکہ اجمیر شریف میں سب سلسلوں کے مشائخ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا جو بات تمام طبقۂ صوفیہ کے مفاد کی پیش آئے وہ اجمیر شریف کے مقام پر مشائخ کے مشورہ میں لائی جائے۔ اور اس اجماع سے جو فیصلہ ہو وہ سارے ملک میں علدرآمد کے قابل تسلیم کیا جائے۔

مرکز کی ضرورت پر وضاحت کے ساتھ لکھنا بجائے خود ایک طویل گفتگو کا محتاج ہے۔ جس کا یہ وقت اور موقع نہیں ہے۔ مشائخ نے خواہش کی تو آئندہ اس کی تشریح کر دی جائے گی۔ میرا تخیل عرصہ دراز سے درویشوں کی مرکزی ضرورت پر گردش کھا رہا ہے۔ اور اس کے متعلق میرے دل میں طوفانی ولولے ہیں۔ میرے لئے وہ دن سب سے بڑا اور

مبارک ہوگا جب کہ میں اپنے مرکزی تخیل کا مجسمہ سرزمین ہند پر دیکھوں گا۔ یا میری روح اپنے مقام پر اس کو محسوس کرے گی۔

میں جانتا ہوں کہ مشائخ میں ابھی یہ احساس بہت کم پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنی ہستی کو خود صحرائے زمانہ کے خاروں سے محفوظ کرنے پر مائل ہوں۔ تاہم مایوس نہ ہونا چاہیے۔ آگاہ کرنے سے آگاہی ہوتی ہے۔ فریاد کرنے سے داد ملتی ہے۔ یہ ہماری پراگندگی کا باعث ہے کہ دوسرے فرقے ہم کو ٹھکراتے ہیں اور زیر و زبر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس دن ہم ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے وجود کو مستحکم کر کے دکھائیں گے۔ پھر کس کی مجال ہے جو ہم کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔

رام اپدیش

(از نظام المشائخ اگست ۱۹۱۰ء)

ہندوؤں کے مشہور و معروف پیشوا سری رام چندر جی کے عارفانہ کلمات یوگ بسشٹ سے محض ناظرین نظام المشائخ کے ملاحظہ کے لئے ترجمہ کرتا ہوں تاکہ ہمارے مشائخ و فقراء کو ہندوؤں کے مقتداؤں کی روش اور ان کی روش سے آگاہی ہو۔ (حسن نظامی)

ایک جلسے میں جہاں راجہ دسرتھ، رام چندر جی کے باپ اور باششٹ جی ان کے گرو و استاد اور بسوامتر جی اس زمانہ کے نامور عارف بزرگ موجود تھے۔ اور رام چندر جی کی عمر صرف ۱۶ برس کی تھی۔ انہوں نے یہ تقریر کی۔

دنیا کی برائی

دنیا ناپائدار ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے۔ مرتا ہے۔ مال اسباب جو دنیا میں ہیں بلا اور

محنت کے سبب ہیں۔ اس کی زندگانی کچھ خوشی اور آرام کی چیز نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ دنیا دار اسے آرام کا گھر سمجھتے ہیں۔ دیکھو۔ عورت۔ مال متاع اور سب دنیا کی موجودات ایک دوسرے سے میل نہیں رکھتے۔ جس طرح لوہے کی کیلیں اکٹھی باندھی جائیں تو چسپاں نہیں ہوتیں۔ پس دنیا دار کیونکر یہ کہہ کر اسباب دنیا سے اصلی جوڑ ملا سکتا ہے کہ فلاں چیز میری اور اسکا ڈھکا میرا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ کون ہوں۔ اور یہ تمام عالم جو دیکھنے میں آتا ہے کس چیز سے ظہور میں آیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ بے حقیقت ہے۔ مگر موجود نظر آتا ہے۔ اس سے نہ کسی کو نفع ہے نہ نقصان۔ وہ چمکتی ریت کی طرح ہے جو پیاسے کو دھوکا دے۔ مگر نہ پیاس کو بجھا سکے اور نہ اس میں ڈوب سکے۔ وہ گھر جو مال اسباب سے بھرا ہوا ہے۔ مگر حقیقت و معرفت کی مایہ سے خالی ہے۔ آرام کی جگہ نہیں ہے۔ جیسے وہ غریب آدمی خوش نہیں رہ سکتا جس کے اولاد بہت ہو حالانکہ اولاد انسان کے دل کو خوش کرتی ہے۔

دولت سب کو پھسلاتی ہے۔ مگر کہیں ٹھہرتی نہیں۔ اور کسی کو حقیقتاً خوش حال نہیں کرتی۔ عیب و ہنر کے بغیر دیکھے جہاں جی چاہا مقام کر دیتی ہے۔ تو اس سے اخلاص پیدا کرکے سانپ کو دودھ پلاتا ہے۔ ایک دن یہ سانپ تیرے دودھ سے پلے ہوئے زہر کو تیرے ہی مار ڈالنے میں خرچ کرے گا۔

آدمی جبتک مفلس ہے سب سے مل کر اور جھک کر چلتا ہے۔ مگر دولت ملتے ہی اپنے بیگانے سب سے بگڑتا ہے۔ اور پتھر کا دل بنا لیتا ہے۔ جیسے ہوا نرم برف کو پتھر بنا دیتی ہے۔ دولت دل کی صفائی اور روشنی کو گدلا کر دیتی ہے۔ جیسے یاقوت مٹی میں رہنے سے بے آب ہو جاتا ہے۔

زندگی

زندگی کا کچھ بھروسا نہیں۔ پتے کی نوک پر رکا ہوا پانی کا قطرہ مضبوط ٹھکانا نہیں ہے۔

پس تو بھی اپنی زندگی کو پائدار مت سمجھ۔

جس طرح ہوا کو پکڑ نہیں سکتے۔ جواہرات کی جگمگ کرتی کرنوں کو ایک لڑی میں پرو نہیں سکتے۔ اسی طرح ابدی زندگانی کسی کے اختیار میں نہیں۔

زندگی معرفت الٰہی کی پناہ میں محفوظ رہ سکتی ہے۔ ظاہری زندگی جانور اور گھاس پھوس بھی رکھتے ہیں۔ مگر حقیقی زندگی اُسی کو ملتی ہے جو حقیقت کی معرفت حاصل کرتا ہے۔

بڑھاپے سے ایک قدم چلنا دوبھر ہے۔ مگر تو زندگانی کی ترقی ہی چاہے جاتا ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ بوڑھا گدھا جب بوجھ اُٹھانے کے قابل نہ رہے تو جنگل میں اکیلا نکال دیا جاتا ہے۔

دل

دنیا کے دھندوں کے سبب دل بزرگوں کے طریق پر نہیں ٹھہرتا جس طرح پرندے کے پر ہوا کے جھونکوں سے منتشر ہو جاتے ہیں۔ دل کتے کی طرح ہر آواز پر لپکنا چاہتا ہے اور اچھائی برائی میں تمیز نہیں کرتا۔

وہم بھرا دل آگ سے زیادہ پرسوز ہے کہ اُس کو پکڑ نہیں سکتے۔ پہاڑ سے زیادہ بلند ہے جس پر کوئی چڑھ نہیں سکتا۔ ہیرے سے زیادہ سخت ہے جس کا توڑنا مشکل ہے۔ سمندر کی سطح آب پر چل سکتے ہیں۔ پہاڑ کھود کر اُس کی تہہ کا پانی نکال سکتے ہیں۔ لیکن دل کو مغلوب نہیں کر سکتے۔ پریشان کرنے والے خطرے اور رواہی تباہی خواہشیں سب دل کی بیماری کے سبب ہیں اس بیماری کا علاج گرو کی صحبت میں ہے۔ اس کو حاصل کر۔

حرص

ترشنا یعنی حرص اندھیری رات کے منحوس اُلوؤں کی طرح دل میں ارمانوں کو جمع کرتی ہے۔ اور اس طرح آخر کار اُس کو ویران کرتی ہے۔

دل کے پاک اور میٹھے جذبات کو حرص اس طرح برباد کر دیتی ہے جیسے چوہا رباب

کے تار کتر کر اُس کو بیکار کر دیتا ہے۔

جو حرص کی آگ میں جل کر مرا ہے اُس کو آبحیات میں ہزار بار بھی غسل دیں تو وہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اپنی دانست میں دنیا کے تمام کاروبار سے آزاد ہو کر بیٹھا ہو۔ حرص پہلے اُسی کو شکار کرنا چاہتی ہے۔ حرص آدمی کے لئے اندھیری رات ہے۔ جس میں ہزاروں خطرے بھرے ہوئے ہیں اور انسان کے دل میں اس کے سبب ہر وقت فکر و اندیشہ رہتا ہے۔

حرص کھلی آنکھ کو بند کر دیتی ہے۔ حرص گھر گھر کی ٹھوکریں کھلواتی ہے۔ حریص آدمی سے کوئی خوش نہیں ہوتا۔ جیسے بوڑھی عورت کے دیکھنے سے کوئی آنکھ خوش نہیں ہو سکتی۔

حریص آدمی اُس ناچنے والی کے مثل ہے جو اپنے ناچ کے سب بھاؤ اور کمالات ایک ہی وقت میں ادا کرنے چاہے۔ اور ایک بھی پورے طور پر ادا نہ کر سکے۔

حرص جسم کے ظاہری اعضاء سے بھی کام لیتی ہے۔ اور باطنی اعضاء سے بھی۔ اور اس کی حکمرانی میں تھوڑے ہی دن بعد یہ سب اعضا بیکار و معطل ہو جاتے ہیں۔

حرص شریف آدمیوں کو اس طرح اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ جیسے حسین عورت متقی و پارسا مرد کو۔ اور سورج کی گرم شعاع نیلوفر کے نرم و نازک پھول کو۔

آدمی کیسا ہی عقیل اور پہاڑ کی طرح بھاری بھر کم ہو حرص کے سامنے سوکھی گھاس کا تنکا بن جاتا ہے

استقبال رسولؐ

(از نظام المشائخ ماہ مارچ ۱۹۱۱ء)

السلام علیک یا رسول اللہ۔ السلام علیک یا حبیب اللہ۔ السلام علیک یا شفیع المذنبین۔ السلام علیک یا رحمۃ للعلمین

غریبوں کا سلام لیجئے۔ گنہگاروں کا مجرا قبول فرمائیے۔ بیکس و لاچار امت کے خیر مقدم پر نظر توجہ ڈالئے آج اوراق نظام المشائخ کے پلیٹ فارم پر ہم سب آپ کا استقبال اور خیر مقدم

کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ یہ ایک طرف آپ کی غریب اُمت کھڑی ہے۔ دوسری جانب عیسائی۔ ہندو۔ آریہ ہیں۔ جو تہنیت کے گلدستے پیش کرنے چاہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ لوگ اپنے حاکم کے سامنے استقبال کے وقت اپنی ضروریات ظاہر کیا کرتے ہیں۔ گزشتہ کارناموں کو سناتے ہیں۔ موجودہ حالات کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور پھر اظہارِ رائے کے طلبگار ہوتے ہیں۔ داد رسی و مراعات و انعامات کا یہی موقع سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم بھی ہندوستان کے پردیس میں اپنے دین و دنیا کے بادشاہ کا استقبال کرتے وقت رسم زمانہ کے موافق عرض حال کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

سرکارِ والا تبار۔ جو زمین اس وقت ہم سب کے زیر قدم ہے۔ چھ سو برس تک ہمارے زیر نگین رہ چکی ہے۔ یہاں ہمارا تاج تھا۔ یہاں ہمارا تخت تھا۔ سکہ بھی ہمارا تھا۔ شان و عزت بھی ہماری تھی۔ تلوار کے بل پر آئے تھے۔ تلوار کے بل پر رہے تھے۔ ہم نے اس ملک میں خدا کے بندوں پر محبت و انصاف سے حکومت کی حضور کے ارشاد کے موافق رعایا کی خبر گیری و حفاظت میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا آج تک ہمارا عہد خوشی راحت اور فارغ البالی کا عہد سمجھا جاتا ہے۔

جہاں پناہ یہ سنکر کمال درجہ مسرور ہوں گے کہ یہ ملک علوم الٰہیہ کے قبول کرنے اور ان میں جی لگا کر مصروف ہونے میں خاص صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں بھی اگلے زمانہ میں توحید کا چرچا رہ چکا ہے۔ اس خطہ میں بھی خدا تعالےٰ نے اپنے مقبول بندوں سری رامچندر جی و سری کرشن جی و مہاتما بدھ کے ذریعہ کلام حق بھیجا تھا۔ جو مادی ایام کے سبب اور نفس و شیطان کی شرارتوں کے باعث خلط ملط ہو گیا۔

ظل سبحانی کی سمع اقدس میں یہ واقعہ پیش ہونا ضروری ہے کہ اس ملک کی آسمانی کتاب وید میں وحدت الٰہی کا یہ کلمہ ارشاد ہوا ہے۔ ” ایکم برہم دوتیو ناستی جس کا عربی مفہوم لا الٰہ الا اللہ ہے۔ اسی وید کے ایک حصہ اتھرون وید میں حضور عالی کی

نسبت اُسی طرح کی پیشین گوئیاں ہیں جیسی زبور۔ توراۃ۔ اور انجیل میں پائی جاتی ہیں۔

جب ہم غلامانِ رسالت اس دیار میں وارد ہوئے اور حضورِ عالی کا پیام یہاں کے باشندوں کو سنایا تو وہ جوق جوق آئے اور آپ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔ چنانچہ اس وقت کروڑوں آدمی ایمان لانے والوں میں موجود ہیں۔

اب ہم موجودہ دور کا فسانہ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ نہایت شرم کے ساتھ۔ نہایت ندامت و پشیمانی کے ساتھ یہ الفاظ ہمارے منہ سے نکلتے ہیں کہ ہمارا چھ صدی کا تاج لٹ گیا۔ تخت اُلٹ گیا۔ ہمارے محل اور قلعے غیروں کے پاس چلے گئے۔ اَب ہم ایک روٹی کو محتاج ہیں۔ ہماری رعیت ہم پر ہنستی ہے۔ ٹھوکریں مارتی ہے۔ ریشمین قباؤں کے بدلے ہم کو میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے بھی میسر نہیں آتے۔

ہماری حرارت برباد ہو گئی۔ ہماری غیرت تباہ ہو گئی۔ اب رسوائی و ذلت کی کوئی حد باقی نہیں رہی۔

آج جہاں پناہ کے حضور میں ایک شکستہ حال امت کھڑی ہے۔ جو کل تاجدار تھی۔ باوقار تھی۔ آج وہ لوگ آپ کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔ جو کشمکش کے میدان میں بے یار و مددگار ہیں۔ جن کا خدا کی ذات کے سوا کوئی سہارا نہیں۔

قدرت نے انگریزی قوم کو ہمارا نگراں بنایا ہے۔ جو چاہتی ہے کہ ہم زبونی و خرابی کے غار سے ہمت کرکے باہر نکلیں۔ مگر زخموں کی تکلیف اور فاقوں کی ناتوانی کے سبب ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ لیکن ہم کو یقین ہے کہ اب گردش کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ اب ہم اقبال و دولت کے سایہ میں پہونچنے والے ہیں۔ کیونکہ آپ کا دیدار۔ آپ کے اوصاف و اطوار کا دیدار ہم سب کی ظاہری و باطنی مصیبتوں کو دور کرنے والا ہوگا۔ آمین

دربارِ رسولؐ

(از نظام المشائخ مارچ ۱۹۱۱ء)

(گستاخ نامہ یعنی سائنس ڈاکو کا خط دربارِ رسالتؐ میں)

از کیمپ یورپ۔ بارگاہ خلافت ہفت اقلیم حضور سائنس بہادر۔ بخدمت جناب معلی القاب

محمد بن عبداللہ بانی مذہب اسلام

جناب من! مجھ کو پیش گاہ سرکار دولت مدار حضور بادشاہ ہفت اقلیم سائنس زمانگیر دام اقبالہ کی جانب سے ہدایت ہوئی ہے کہ آپ کو ان کے دوستانہ خیالات سے آگاہ کروں۔ چونکہ ہمارے بادشاہ جم جاہ آپ کے خیالات میں بہت کچھ صلاحیت اور اپنے خیالات سے نزدیکی ملاحظہ فرماتے ہیں۔ اس لئے ان کی خواہش ہے کہ دوستانہ طریق سے چند امور آپ کے گوش گزار کریں۔

یہ اطلاع غالباً آپ کو مل گئی ہوگی کہ یورپ میں عیسائی مذہب کے مسمار کرنے میں اور اس کو اپنا محکوم بنانے میں ہمارے شاہ کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ آپ یہ سنکر بہت خوش ہوں گے کہ اس زمانہ میں عیسائی مذہب کا جو کچھ غل مچ رہا ہے وہ محض لفافہ ہی لفافہ ہے۔ اندر کچھ بھی نہیں۔ شاہ سائنس نے تمام عیسائی قوموں کے دلوں پر تسلط پالیا ہے۔ اور اب یورپ میں ایسا کوئی سرکش باقی نہیں ہے جو عیسوی مذہب کو بچانے یا اس کا اثر برقرار رکھنے کی شاہ سائنس کے مقابلے میں طاقت رکھتا ہو۔ بدھ مذہب کا جاپان میں خاتمہ کر دیا گیا۔ چین میں کچھ لوگ ہیں ان پر مہم بھیجی گئی ہے۔ یقین ہے کہ وہ بھی عنقریب مفتوح ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں پچاس برس سے معرکہ کارزار گرم ہے۔ اور شاہ سائنس کو اکثر مقامات پر کامیابی

حاصل ہو چکی ہے۔ شاہ سائنس کی خوش اقبالی سے ہندو مذہب کا ایک بڑا گروہ دیانند راجہ کی سرکردگی میں ہندو مذہب پر چھاپے مار رہا ہے۔ اور ہمارے بادشاہ کو اس کی پُرزور اور پُراثر یورش سے امید ہے کہ ہندو مذہب پر بہت جلد ان کا قبضہ ہو جائے گا۔ زرتشتی دین کی نسبت تو آپ کو اچھی طرح واقفیت ہو گی کہ وہ ہمارے شاہ کے قدموں میں آن گرا۔ اور اب اس نے خانہ زاد خاص کا خطاب حاصل کیا ہے۔ مگر حضور ظل زمانی بہت افسوس کرتے ہیں کہ آپ کا مذہب اسلام جگہ جگہ ان کی فتوحات میں سدراہ ہوتا ہے۔ اگرچہ حضور ظل زمانی آپ کے سپہ سالار جنرل اسلام کی قابلیتوں کے قایل اور بہت مداح ہیں۔ لیکن وہ اسلام کی موجودہ روش کو پسند نہیں کرتے۔ اور چاہتے ہیں کہ آپ اپنے سپہ سالار کی حالت میں تبدیلی کا حکم دیں۔ شاہ سائنس کی حکمرانی نسل انسانی کے لئے راحت و شادمانی کا لازوال خزانہ ہے شاہ سائنس نے اپنی سلطنت کے ایسے طریقے مقرر فرمائے ہیں۔ جن سے ہر مذاق اور ہر خیال کا انسان مساوی درجہ میں خوشی اور آسائش حاصل کرتا ہے۔ اگر آپ ذرا غور فرمائیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ مذہب انسان کے لئے اور اس کی زندگی کے لئے بڑی خوفناک اور ضرر رساں چیز ہے۔ مذہب کے باعث ہر ملک ہر قوم یہاں تک کہ ہر گھر میں فساد اور خونریزیاں برپا رہتی ہیں۔ مذہب انسانی فطرت کے جذبات کو قدرتی طور پر اُبھرنے نہیں دیتا۔ اور دبا کر برباد کر ڈالتا ہے۔ مذہب تمیز داری اور شائستگی کا دشمن ہے۔ مذہب بیدار مغزی اور معقولیت سے کوسوں دور ہے۔ مذہب نہیں چاہتا کہ انسان اپنی طاقتیں کام میں لائے۔ مذہب آزادی و مساوات کا مخالف ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے دنیا پر تکلیفات کا جال پھیلا رکھا ہے آپ ملاحظہ فرمایئے کہ یورپ کے اس زمانہ میں جب کہ وہاں مذہب کا دور دورہ تھا اہل یورپ کیسی ذلیل اور کمینی زندگی بسر کرتے تھے۔ پیشوایان مذہب انکو ٹھکراتے

تھے۔ آگ میں جلاتے تھے۔ ان کی عورتوں کی عزت و ناموس کو خراب کرتے تھے اور بیچارے پیروان دین مسیح اُف تک نہ کر سکتے تھے۔ مگر آج جبکہ شاہ سائنس کا دور حکومت ہے ہر شخص آزاد، ہر شخص بااختیار خوش و خرم اور عزت دار بنا ہوا ہے کسی کی مجال نہیں کہ اپنے سے ادنیٰ یا اعلیٰ کی آزادی و اختیارات میں دخل دے سکے اہل یورپ ہمارے شاہ کی تاجداری پر دل سے فریفتہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ سب دنیا والے سائنس تاج کے زیر سایہ آجائیں۔ ایسی حالت میں آپ خود انصاف فرما سکتے ہیں کہ ہمارے شاہ کا تلوار کھینچنا اور مذہبی حکومت کو زیر و زبر کرنا کس قدر ضروری اور کیسا اچھا کام ہے۔ لہٰذا آپ فوراً اپنے اصول جہانداری کو بدل ڈالئے اور سائنس کے قوانین اپنے ہاں جاری کر دیجئے۔ تاکہ ہماری گورنمنٹ کے سامنے سے دشواریاں اور مشکلات دور ہو جائیں۔ اور زمین پر امن و امان کا آفتاب چمکنے لگے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ شاہ زمانہ گیر اُن تدابیر کو عمل میں لائیں گے۔ جن سے آپ کی گورنمنٹ کو سخت نقصان اٹھانا اور بربادی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

میں بے باکانہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ اگر اس آخری اطلاع پر جلدی توجہ نہ کی گئی تو افواج قاہرہ کو حرکت میں لایا جائے اور اسلامی قصر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ ہماری گورنمنٹ کے اسلحہ آتش فشان اور فنون حرب کی ترقیوں سے غالباً آپ بے خبر نہ ہوں گے۔ اور صلح کو جنگ سے غنیمت تصور فرمائیں گے۔

راقم۔ میں ہوں آپ کا ادنےٰ خدمت گار

دہریہ۔ وزیر محکمۂ خارجہ گورنمنٹ۔ سائنس زمانہ گیر

مشورہ

سپہ سالار اسلام فرش خاک پر تلوار ٹیکے کھڑا تھا۔ اور سامنے تمام عہدہ داران فوج دست بستہ ایستادہ تھے۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ اور سپہ سالار کی تقریر صاف سنائی

نہ دیتی تھی۔ لیکن آخر میں سپہ سالار نے ایسے پُرجوش جملے کہے کہ سب نے انکو اچھی طرح سنا۔

یورپ کے مشہور قزاق سائنس کا ایک گستاخانہ مراسلہ دربار رسالت پناہی میں آیا ہے۔ جس میں اس نے لڑائی کی دھمکی دیکر ہماری سلطنت کے قوانین بدلوانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ بولو۔ اب تم کیا ارادہ رکھتے ہو۔

جنرل شریعت وار۔ پہلے یہ فرمایئے کہ دربار قدسی کی جانب سے اس گستاخ کو کیا جواب دیا گیا۔

سپہ سالار۔ وہ جواب تم عنقریب سن لوگے۔ میں تمہارا منشا معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر حالات کی صورت دگرگوں ہو تو تم کن طریقوں سے مدافعت کروگے۔ اور تمہارے پاس کیا کیا ذرائع مقابلے کے ہیں۔

جنرل شریعت وار۔ جس قسم کی ضرورت ہو۔ ہم ہر حیثیت سے تیار ہیں۔ اگر علمی مقابلہ ہو تو حدیث۔ تفسیر۔ فقہ۔ اصول فقہ۔ الغرض معقول۔ منقول جس قرینے کا معرکہ ہوگا۔ ہم مقابلہ کریں گے۔ جنگ کی نوبت آئے تو اس میں بھی ہم کو سب سے آگے ہاتھ مارتے پائے گا۔

جنرل طریقت وار۔ جناب عالی تردد نہ فرمائیں۔ میری کمان میں وہ بہادر ہیں جن کے نعرۂ حق سے آسمان زمین لرزتے ہیں۔ سائنس کی کیا ہستی ہے جو ہمارے شہنشاہ کے قوانین کو ٹیڑھی نگاہ سے دیکھ سکے۔ یہ دیکھئے حضور کے روبرو چشتی قادری۔ نقشبندی۔ سہروردی۔ رفاعی وغیرہ نامور افسر کھڑے ہیں۔ انہوں نے ہزاروں بار نفس امارہ کے لشکروں کو زیر و زبر کیا ہے۔ حرص و ہوا کی کائنات ان کے نام سے تھراتی ہے۔ خود بینی و ناحق شناسی کے سیکڑوں تاج و تخت ان کے نعرۂ ہو سے خاک میں مل گئے۔ سائنس اپنے تمام ابلیسی لشکروں کو لیکر آجائے اور دیکھے کہ شہسواران طریقت کس شان سے میدان کارزار میں نکلتے

ہیں اور کیونکر اس کے دھوئیں اُڑاتے ہیں۔

جنرل طریقت وار کی تقریر سنکر سپہ سالار اسلام کا چہرہ بشاش ہوگیا۔ اور اس نے تبسم خیز انداز سے کہا۔ آفرین بہادرو! شاباش دلیرو! تمہاری ہمت مردانہ سے مجھے یہی امید تھی۔ مگر جس دشمن کا مقابلہ درپیش ہے۔ وہاں یہ ہتھیار کام نہیں دیں گے۔ اب نری جرأت سے کام نہیں چلتا۔ تم کو چاہئے کہ اپنے حریف سائنس کے طرز حرب سیکھو۔ اور پھر مقابلہ کے لئے مورچہ باندھو۔ آؤ پہلے اس کی کوشش کریں کہ ہمارا لشکر سائنس کے قواعد سے خبردار ہوجائے۔ اس کے بعد دو ہاتھ کرنے کو آگے بڑھے۔

تخت رسالت کا فرمان

تمام امت محمدیؐ کے صوبہ داروں اور ادنیٰ و اعلیٰ افراد ملت کو معلوم ہو کہ ماید ولت و اقبال تمدن جدید کی دنیا میں کلمۃ اللہ کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں۔ تم کو لازم ہے کہ دربار رسالت کے فرمان واجب الاذعان کی تعمیل کے لئے دل و جان سے کمربستہ ہوجاؤ۔ وقت آگیا کہ یورپ و امریکہ۔ چین و جاپان اور ان تمام ممالک میں جہاں سائنس اور علوم جدیدہ کی اشاعت ہورہی ہے۔ اسلامی صداقت کی روحانیت پھیلائی جائے لہٰذا تم سب کیل کانٹے سے درست ہوجاؤ۔ پہلے اپنے حالات کی اصلاح کرو۔ اور اپنے وجود کو اسلامیت کا مجسم نمونہ بنالو۔ اور پھر نئے علوم سیکھنے شروع کرو تاکہ تخت کی منشا کے موافق مذکورہ زمین پر امر حق رائج کرسکو۔

مسلم یونیورسٹی کے نام سے جو تحریک ہندوستان میں اُٹھی ہے وہ تاج ملت کے ارادے کے موافق ہے۔ اس کو سرسبز بنانے میں اتفاق و یکجہتی سے کوشش کرو۔ یہ پہلا دروازہ ہے جو تمہارے لئے قدرت خداوندی نے کھولا ہے۔ اس کے اندر بے دھڑک گھس جاؤ۔

قرآن شریف میں سب سے پہلے الٓمٓ کا لفظ تم نے پڑھا ہوگا۔ اسمیں اشارہ ہے کہ آلِ محمد اس کتاب (علم) کو جس میں کچھ شک نہیں۔ عالمگیر کرنیکے لئے کھڑی ہوگی چنانچہ پہلے سید احمد خاں نے جو محمدی آل سے تھا یہ کام شروع کیا۔ اور اب آغاخان جو زمرۂ آلِ رسالتؐ سے ہے اس کی مدد کرنی چاہتا ہے۔ تم سب کو مل کر اس کی اعانت کرنی چاہیئے۔ تاکہ ہدایت کا چشمہ ان قوموں کو سیراب کرے۔ جو روحانیت کی پیاسی ہیں۔

اسی الٓمٓ کے میم میں اس نائب رسولؐ مہدیؑ کے ظہور کی خبر ہے۔ یعنی وہ سنہ ۱۳۴۰ھ میں ظاہر ہوگا۔ اور تمہارے منتشر اور پراگندہ کاموں کو سمیٹ کر یکجا کر دے گا۔ اور سارے جہان کو اسلام کے حقانی دائرہ میں لے آئے گا۔

جناب رسالتمآب کے تخت کی جانب سے اس غلط فہمی کی اصلاح ضروری ہے جو یورپ کی قوموں میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ لوگ ہمارے نائب مہدیؑ کے نام سے طرح طرح کے وہم کرتے ہیں۔ ان کو اطمینان رکھنا چاہیئے۔ ہمارا مہدیؑ ان کی مملکت میں ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ امن وامان کو برہم نہیں کرے گا۔ اُس کا کام صرف یہ ہوگا کہ باطنی اور روحانی تسکین کے ذرائع دنیا میں شائع کرے۔ اور انسانوں کو ظاہری دولتمندی کے ساتھ باطنی تسلی کی دولت بھی بانٹے۔ اور لکھا جاچکا ہے کہ جس وقت وہ دنیا میں آئے گا سب قومیں اس کے طریق روحانیت کو قبول کرلیں گی۔ اور اس کی ہدایت پر عمل شروع کردیں گی۔ بس اسی کا نام مہدی کی حکومت ہے کہ اسلامی روحانیت کل جہان پر مسلط ہوجائے۔ یہ نہیں کہ لوگوں نے تاج وتخت چھینے۔ جس طرح جرمن و وانگریز۔ روس وفرانس وغیرہ کی سلطنتیں اب قایم ہیں۔ مہدی کے وقت میں بھی برقرار رہیں گی۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ یہ سب ان اصول پر اپنی زندگی شروع کردیں گی جو مہدی مقرر کرے۔ اس میں جھگڑا فساد اور خونریزی مطلق نہ ہوگی۔ لہٰذا سب لوگوں کو بیفکر رہنا چاہیئے۔ اور خوشی وخرمی سے ہمارے نائب کے خیر مقدم کے لئے

آگے بڑھنا چاہیئے۔

دنیا میں اس اعلان کی خبر نے جو سائنس کی جانب سے دربار رسالت میں پہونچا ہے۔ ہلچل ڈال دی ہے۔ مگر تخت تم سب کو تسلی دیتا ہے کہ معاملات کی صورت ایسی پیچیدہ اور نازک نہیں ہے۔ سائنس کے اعلان کا جواب دیدیا گیا ہے۔ ہمارا سپہ سالار اسلام میان سے تلوار نکالے بغیر سب خرخشوں کو صاف کر دے گا فکر کی بات نہیں۔ اگرچہ سائنس کے وزیر خارجہ دہریہ کالب ولہجہ سخت تھا۔ مگر اجاب سختی کا جواب سختی سے دینا چاہتے۔ ہماری سرکار کا ہمیشہ سے نرمی وملائمت کا شیوہ رہا ہے۔ اور وہی اب بھی ملحوظ ہے۔

مرحمت نامہ

(یعنی سائنس کے گستاخ نامہ کا جواب دربار رسالتؐ)

از مملکت حجاز۔ خیمۂ رسالت۔ بنام سائنس مدعی زمانہ گیری

تمہارا خط جس میں تخت رسالت پناہی کو اسلام کی موجودہ روش تبدیل کرنے کی جانب توجہ دلائی گئی ہے پہنچا۔ بارگاہ قدوسی میں عرض کر دیا گیا۔

حضور انورؐ نے کمال الطاف ونوازش کے بشرہ سے اس کو سماعت فرمایا۔ تمہارے وزیر نے جس طریقہ سے اپنی کامیابیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ اگرچہ پسندیدہ نہیں ہے لیکن دادین پناہ بوجہ خلق عظیم کے اس سے درگزر فرماتے ہیں۔ اور ہدایت کرتے ہیں کہ غرور وتکبر ہر کامیابی کے لئے سبب ناکامی ہے۔ اس سے احتیاط کرنی چاہیئے۔ ارشاد ہوا کہ مذہب کی مضرتوں کو تم نے بالکل غلط سمجھا۔ یورپ کے مذہبی زمانہ میں جس قدر خرابیاں تھیں وہ مذہب کے غلط استعمال کے سبب تھیں۔ مذہب کا اس میں کچھ قصور نہیں۔ اور اب جن راحتوں کو پیش کیا جاتا ہے وہ بھی موہوم اور

بے اصل ہیں۔ جن کو پائداری نصیب نہیں۔ ذرا لوگوں کے دل سے پوچھو کہ باوجود اس آزادی اور دولت مندی کے ان کو اندرونی اطمینان اور قرار و سکون میسر ہے یا نہیں۔ ہر شخص یہی کہے گا کہ نہیں پھر اس نمائشی راحت سے کیا فائدہ۔ راحت وہ ہے جس کی جڑ آدمی کے دل میں جاگزیں ہو۔

نائب بارگاہ ایزدی تم کو مطلع فرماتے ہیں کہ ان کی امت عنقریب تمہاری اُن مشکلات کو رفع کر دے گی۔ جو درحقیقت سچی مشکلیں ہیں۔ نہ وہ جن کو تم مشکلات تصور کر رہے ہو۔ اس سے زیادہ کچھ فرمانا نہیں چاہتے۔ گو ان کو قلم کے جواب کے علاوہ تیغ و سناں جواب دہی کی بھی ہر طرح قدرت حاصل ہے۔

امید کہ تم ہماری رحیم و کریم سرکار کی مہربانی اور نوازش سے فائدہ اُٹھاؤ گے۔ اور اچھا زمانہ حاصل کرنے کی کوشش کرو گے۔

راقم۔ عبید۔ حلقہ بگوش تخت رسالت۔ محکمہ تحریرات بقلم حسن نظامی

فقیروں کی عید

(از نظام المشائخ ستمبر ۱۹۱۱ء)

قوموں کی زندگی اور ترقی جن ذرائع سے معلوم ہوتی ہے ان میں قومی تہواروں کی شان و شوکت کو بہت کچھ دخل ہے۔ اسلام نے ظاہر ہو کر عرب اور اکثر حصہ عالم کی مراسم قبیح و ناز یبا رواجوں کو زیر و زبر کر ڈالا۔ اور مٹا دیا۔ مگر جو رسمیں بشریت کی فطرت میں داخل تھیں ان کو باوجود اپنے بھاری بھرکم طرز عمل اور تقوے و متانت کے جاری رکھا۔ بلکہ ان میں اور چار چاند لگائے۔

چنانچہ وہ کھیل جو جنگجو قوموں میں بطور مشق جاری تھے اسلام نے ان کو منع نہیں کیا۔ خود بانی اسلام علیہ التحیۃ والسلام بارہا ایسے کھیلوں میں شریک ہوئے ہیں حالانکہ

کھیل تماشہ اور لغو شغلوں سے آپ نے ہمیشہ نفرت کا اظہار کیا۔ اور لوگوں کو اس سے روکتے رہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھیل جن سے قوم میں کوئی کار آمد بات پیدا ہو۔ اسلام نے بند نہیں کئے۔ اور ان کو اپنی متانت و بردباری کے خلاف نہیں سمجھا۔ مثلاً حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیزہ بازی و تیر اندازی کے کھیلوں کا خود بھی تماشہ دیکھتے تھے اور اپنے عیال کو بھی دکھاتے تھے۔ معتبر روایتوں سے یہاں تک ثابت ہے کہ آپ اپنے گھر والوں کے ساتھ دوڑ کے کھیل میں شریک ہوتے۔ اور خود بنفس نفیس دوڑتے اور فرماتے دیکھیں کون آگے نکلے۔

بہادری اور مردانگی کے کھیلوں میں خود ذات رسالت آب صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک ہونا دلیل ہے اس امر کی کہ ہر زمانہ میں جو کھیل دلیری و شجاعت کا جذبہ پیدا کرنے والے ہوں۔ اُن میں ہر ثقہ اور متین مسلمان شامل ہو سکتا ہے۔ اور کوئی شخص اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جو ذات سب سے زیادہ متین اور سب سے زیادہ مہذب تھی وہ بھی ایک مفید حد تک ان کھیلوں کو جائز رکھتی تھی۔

اسی پر ایام خوشی کو قیاس کرنا چاہئیے کہ سال بھر میں ایک دن ایسا ہو نا جس میں قوم کا ہر فرد اپنی حیثیت اور طبیعت کے موافق خوش ہو۔ ضروریات سے تھا۔ اس واسطے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر اور عید الضحیٰ دو دن مقرر فرمائے۔ یہ دونوں دن اسلام کے دو عظیم الشان فرائض کی تکمیل کی خوشی میں مقرر ہوئے۔ عید الفطر مہینے بھر کے روزے ادا کرنے کے بعد۔ اور عید الضحیٰ حج کعبہ کے بعد۔ اس طریقے سے مسلمانوں کی خوشی کو اپنے معبود کی عبادت کے ساتھ جیسی کچھ وابستگی ہو گئی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہر شخص خود غور کر سکتا اور سمجھ سکتا ہے۔

حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے جلیل القدر صحابہؓ دلی

یک جہتی اور شادمانی سے ان تہواروں میں حصہ لیتے تھے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قومی
تہواران کی شان کے موافق متانت اور بھاری بھرکم پن کے خلاف و منافی نہیں ہیں۔
درویش اور مشائخ بھی بشر ہیں۔ اور انسانوں کے دل سینے میں رکھتے ہیں۔ اور حضرت
سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی شان کچھ اعلیٰ و برگزیدہ نہیں ہے
جو اپنے دینی و قومی تہوار کی خوشی کے اظہار میں شریک ہونا اپنے وقار اور منصب کے
خلاف تصور کریں۔ خوشی اور رنج کا حس سے مٹ جانا دوسری چیز ہے۔ اس کا یہ
مطلب نہیں ہے کہ انسان اپنے حواس آدمیت سے معطل ہو جائے۔ بلکہ وہ ایک
مقام رضا و تسلیم ہے جس میں درویش رضائے الٰہی کی طلب میں ایسا بے خبر ہو جاتا
ہے کہ وہ دنیا کی تکلیفات اور خوشیاں اُس کی طلب میں مخل نہیں ہونے پاتیں۔ اور
وہ ایک ہی دھن میں مستغرق رہتا ہے۔

پس عید جیسے قومی و دینی تہوار میں فقرا و مشائخ کا یا اُن کے اخبار و رسالہ کا
شریک ہونا اور اس کی خوشی میں اپنے دیگر ہم مذہب بھائیوں کی مثل برابر حصہ لینا
نامناسب و ناروا نہیں ہے۔ بلکہ لازمی اور ضروری ہے۔

عیدِ میلاد الرسولؐ

(از نظام المشائخ جنوری سنہ ۱۹ء)

ایک سو ایک ضرب الا اللہ کی سلامی دو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف
لاتے ہیں۔ آنکھیں مژگان کی سناں اور ابرو کی تیغ سنبھالے۔ ادب سے پتلیاں جھکائے
کھڑی رہیں۔ زبان درود کا بینڈ بجائے بدن کی سب رگوں کو حکم دو کہ صلواتی جھنڈ
میں ایک جان ہو کر سُر ملائیں۔ یہاں تک کہ ہر بُن مو سے نغمۂ صلو علےٰ محمد نکلنے لگے۔
روزہ کی عید۔ حج کی عید۔ دونوں دست بستہ آئیں اور عید میلاد کا خیر مقدم کریں۔

دودھ۔ سویوں اور قورمہ چپاتی کو اس عید سے کچھ سروکار نہیں۔ جو کی روٹی
کھاؤ۔ اور خوشی مناؤ۔

آج عید ولادت ہے۔ آج وہ پیدا ہوئے جن پر کائنات کی پیدائش کا حصر ہے۔
چاند کو رُخِ انور سے شرمانے والے۔ ظلمت کو گیسوؤں میں اُلجھانے والے شاہ
گدانواز۔ رسول العرب والعجم۔ جن کی ولادت سے تاریکی باطل دور ہو گئی۔ حق کی
روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔ خود سر بے سر ہوئے۔ بے تاج تاجور بنے۔ جنھوں نے بتوں
کو ہلا کر ساری زمین زلزلے میں ڈال دی۔

غریبوں مظلوموں کے غمگسار۔ سرکشوں۔ ظالموں کے زیر کرنے والے وہی جنکا
نام لینے سے ہمارے خون میں حرارت اور دل میں جوش پیدا ہوتا ہے۔

ایسے برگزیدہ و پاکیزہ وجود کے ظاہر ہونے کا وقت ہے کہ آسمان۔ زمین۔
شجر حجر۔ کیف میں ہیں۔ پھر تم کیوں اے مسلمانوں یوم ولادت کو قومی تہوار نہیں بناتے۔
یہ وہ خوشی ہے جس میں ہر فرقہ اور عقیدے کے مسلمانوں کو یکساں حصہ لینا چاہئے
یہاں شیعہ۔ سنی۔ مقلد۔ غیر مقلد۔ صوفی۔ وہابی کی قید نہیں۔ سب یک دلی و اتفاق
سے میلاد کا تہوار مقرر کریں۔ اور دنیا کو دکھائیں کہ جس طرح رسولِ خدا کو اپنی امت
سے محبت تھی۔ اسی طرح امت بھی ان کے نام پر قربان ہے۔ اور ان کی یادگار
میں دل و جان سے حصہ لینا چاہتی ہے۔ دوسری قومیں فرضی اور خیالی تہوار مناتی
ہیں۔ تاکہ قوم میں زندگی کے جذبات پیدا ہوں۔ تمہارے سامنے ایک اصلی اور
شاندار موقع موجود ہے۔ اس سے کیوں نہیں فائدہ اٹھاتے۔

اسلامی ممالک میں جہاں ہمارے خوش قسمت بھائی تخت و تاج کے مالک ہیں
میلاد شریف کے موقع پر بڑے بڑے جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ہم بدنصیب بھی بے تاج ہی۔ ہیں تو حلقہ بگوش شانِ رسولؐ۔ پھر کیوں اپنے تاجدار

جائیوں سے حب رسولؐ میں پیچھے رہیں۔ یہ وقت اس بات کے دیکھنے کا نہیں ہے۔ کہ از روئے فقہ میلاد جائز ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ سوچنے کا وقت ہے کہ میلاد کے جلسوں کو کس طریقہ پر بارونق اور شاندار بنایا جائے۔

یاد رکھو کہ سب کی دینی و دنیاوی زندگی اپنے رسولؐ کی الفت و یاد میں مخفی ہے۔ اگر ہم دنیا میں اپنی عزت محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم کو آخرت میں سرخرو جانا ہے تو آقائے نامدار محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میلاد پاک کی عیدین سے زیادہ خوشی منایا کریں۔ بلکہ میلاد الرسولؐ کی ایک علیحدہ عید مقرر کریں۔ جس میں دھوم دھام سے میلے ہوں۔ جلسے ہوں اور ہر عقیدے کا مسلمان اپنے کلمہ کے شریک بھائیوں کے ساتھ عید الرسولؐ منائے۔ اور کہے۔ "آج اس کے نام کی عید ہے جس نے دنیا کے پردے کو شرک و کفر کے غم و الم سے پاک و صاف کرکے وحدت کے سرور سے آراستہ کیا"

وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

ایکو برہم دوتیو ناستی

(از صوفی - جولائی ۱۹۱۱ء)

یہ فقرہ جس کے سلیس معنی وحدہٗ لاشریک یا لا الہ الا اللہ ہیں۔ ہندو مذہب کے اصول میں داخل ہے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو ہر مذہب کی بنا توحید پر ہے مگر انسان اپنے خیالات کی سیر کرکے اس متفق علیہ اصول کو خراب کر ڈالتا ہے اور وقتاً فوقتاً ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کسی انسان کو بشری خیالات کی اصلاح کیلئے مقرر فرمائے۔ چنانچہ ہر ملک اور ہر قوم میں ضرورت کے وقت مصلح ظاہر ہونے کا ثبوت تواریخ اور مذہبی کتب میں موجود ہے۔ قرآن شریف میں صاف طور پر ارشاد ہوا ہے

کہ ہر ملک و ملت کے واسطے خدا ایک ہادی مقرر کرتا ہے بعض رسولوں کے نام اور حالات کی تصریح فرما دی گئی ہے۔ بعض کی نسبت اشارے کنائے کر دئے ہیں اور پھر ایک کلیہ قاعدہ قایم کرکے حکم دیدیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو خدا کے تمام رسولوں اور تمام کتابوں پر ایمان لانا ضروری اور لازم ہے۔ مسلمان بھی زبان سے نہیں بلکہ دل سے یقین رکھتے ہیں کہ جن رسولوں کی اطلاع ان کو پہونچی اور جن کی نہیں پہونچی وہ سب برحق ہیں۔

اتنا معلوم کرنے کے بعد سوچنا چاہئے کہ ملک ہندوستان جو دنیا میں ایک بڑا ملک کہلاتا ہے۔ اس بات کا مستحق ہے یا نہیں کہ یہاں بھی خدا نے اپنے دستور کے موافق پیغامبر بھیجے۔ اور ان کو ہدایت کرنے کے واسطے کتابیں دیں۔ اگرچہ قرآن شریف میں اس ملک کے رسومات کی بابت کوئی تصریح نہیں پائی جاتی۔ مگر خدا کے اس کلیہ کے موافق کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان بھی ان متبرک آدمیوں سے محروم نہیں ہے۔ جن کو خدائی اصطلاح میں نبی و رسول کہتے ہیں۔

ہندوستان کے نامور بزرگوں سری رام چندر جی اور سری کرشن جی اور مہاتما بدھ کے حالات پڑھنے۔ ان کی طرز زندگی پر غور کرنے اور اُن کی تعلیمات پر منصفانہ نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے وہی حالات تھے جو سیدنا حضرت ابراہیم و عیسیٰ و موسیٰ وغیرہ علیہم السلام کے پائے جاتے ہیں۔ اور وہی تعلیم تھی جس کا ذکر بار بار قرآن شریف میں آیا ہے۔

اسلامی عقائد میں یہ مسلم امر ہے کہ انسان کے لئے فطرتی مذہب ہمیشہ سے ایک ہے۔ جس قدر پیغمبر اور رسول بھیجے گئے وہ سب ایک ہی مذہب اور ایک ہی اصول کی تعلیم کرتے تھے۔ نئے اصول کی شریعت کسی پیغمبر نے قایم نہیں کی۔ یہاں تک سب سے آخر اور سب سے اچھے رسولؐ نے بھی جن کی پیروی کا فخر ہم کو حاصل ہے وہی بتایا جو آگے نبی

بتاتے آئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تعلیم میں ہر ملک و قوم کی سمجھ اور طرز معاشرت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ایسے طریقے سے سمجھایا گیا ہے کہ ہر درجہ کی عقل میں آسکے آپ کو معلوم ہوگا کہ توراۃ و انجیل کا طریقۂ تعلیم تشبیہ اور استعارات پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخر زمانہ کے آدمی عقلی و ذہنی تغیر کے سبب اس کے فہم سے قاصر ہو گئے۔ اور طرح طرح کی غلطیوں اور توہمات میں مبتلا ہونے لگے۔ وید مقدس اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں اور بزرگوں کے بیانات میں بھی اس قدر مشکل استعارات پائے جاتے ہیں، جن کا ٹھیک ٹھیک ذہن نشین کرنا دشوار ہے۔ اگرچہ مثالیں ایسی دی ہیں کہ معمولی عقل والا بھی ذرا سی دیر میں سمجھ جائے۔ مگر افسوس ہے کہ اس ملک کے بعض لوگوں نے اصلی بات کو معلوم کرنے میں توجہ نہیں کی۔ اور ظاہری الفاظ پر عمل کرکے اپنے پاکیزہ اصول کو خراب کر دیا۔

میں ایک مثال دنیا کی پیدائش کی نسبت پیش کرتا ہوں۔ قرآن شریف میں خدا فرماتا ہے کہ ہم نے حکم دیا کن فیکون ہندو مذہب میں اول برہما پیدا ہوا اس نے تمام عالم کو ظاہر کیا۔ غور کیجئے کہ ان دونوں بیانات میں کیا فرق ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ متحد البیان ہیں۔ قرآن میں خدا نے صفت خالقیت کو کُن کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اور وید میں برہما کے لفظ سے۔ برہما صفت ایجاد کا نام ہے۔ جبتک یہ صفت ظاہر نہیں ہوئی دنیا ناپید تھی۔ جس طرح کُن کے ظہور کے بعد یکون کا ظہور ہوا اسی طرح برہما کے ظہور کے بعد سب کچھ ظاہر ہوا۔ یہی کیفیت تمام اصول مذہب کی ہے۔

مورتوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک جسم میں سینکڑوں ہاتھ اور متعدد سر ہیں اور ہر ہاتھ میں مختلف چیزیں ہیں۔ کسی میں تلوار ہے۔ کسی میں پھول ہے۔ کسی میں اناج کا خوشہ ہے۔ اور ہندو ان مورتوں کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ اس وقت آپکو نفرت آمیز ہنسی آئے گی کہ یہ کیسی مضحکہ انگیز صورت ہے۔ اور کیسے احمق ہیں کہ انکے

آگے سر جھکاتے ہیں۔

مگر حضرات ہندوستانی رہبروں نے یہاں کے باشندوں کو سمجھانے کے لئے صفات الٰہی کی حقیقت صاف طور پر ذہن نشین کرنے کے واسطے یہ مورتیں بنائی تھیں۔ تاکہ کم سمجھ لوگ آسانی سے سمجھ جائیں کہ خدا میں قہر کی شان بھی ہے۔ جس کا نمونہ تلوار ہے۔ اور رحم بھی جس کا نشان پھول یا اس قسم کی کوئی اور چیز ہے۔ اسی کے ہاتھ میں رزق ہے۔ اس لئے اناج کا خوشہ دکھایا جاتا ہے۔ مگر ثابت یہ ہوا کہ انسان بہت ہی بے عقل ہے۔ اور مثالوں کو ذریعہ کے بجائے نتیجہ سمجھ لیتا ہے چنانچہ ان مثالی مورتوں کے سبب بت پرستی شروع ہو گئی۔ اور ہزاروں غلط فہمیاں واقع ہو گئیں۔ یہ بات ہندوستان پر مخصوص نہیں ہے۔ دنیا میں اور بھی کئی ملک ایسے ہیں جہاں صرف مثالی خرابی سے بت پرستی کا رواج ہوا۔ روم۔ یونان و مصر میں اس کی کافی شہادتیں موجود ہیں۔

جب تمام دنیا میں عالمگیر غلط فہمیاں واقع ہو گئیں تو خدا تعالیٰ نے ایک ایسا آسان صاف اور سیدھا طریقہ تعلیم سکھا کر ہمارے حضرت صلعم کو بھیجا جو تمام دنیا کی ہدایت کے لئے کافی ہو۔ اور تمام مذاہب عالم میں جس قدر خرابیاں بشری خیالات اور نفسانی جذبات کے سبب پڑ گئی تھیں وہ دور ہو جائیں۔ میں نہیں کہتا کہ میرا دعویٰ خواہ مخواہ تسلیم کر لیا جائے۔ بلکہ تجربہ اور تحقیق سے غور کرنا چاہئے کہ اسلام نے قدیمی اصول جس پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ اس قابل ہے یا نہیں کہ تمام دنیا کے مذہبوں کی خرابیاں آسانی سے رفع کر دے۔ تجربہ مشاہدہ کرا دے گا کہ بے شک اسلام کا طریقہ تعلیم ایسا صاف سیدھا اور آسان ہے کہ قدیمی اصول مذہب عمدگی کے ساتھ ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔

اب میں مجمل طور پر ہندوستان کے دو نامور بزرگوں سری رام چندرجی اور

سری کرشن جی کے حالات پیش کرتا ہوں۔ تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ ان لوگوں کی زندگی اور تعلیم ہمارے مسلمہ رسولوں کے کس قدر مشابہ تھی۔ میں رام کرشن جی کے بعض اقوال کو اپنے حضور صلعم کے ارشاد اور قرآن شریف کے بیان سے مطابق کر کے دکھانا چاہتا ہوں۔ کہ یہ لوگ واقعی ہندوستان کے رسول تھے۔ اور ہمارے رسول گو سب کے بعد بھیجے گئے۔ مگر وہی بیان کیا جو پہلے بیان ہو چکا تھا۔ کوئی نیا دین لیکر نہیں آئے تھے۔ لہٰذا تمام دنیا خاصکر ہندوستان کو لازم ہے کہ پرانی تعلیم کو نئے طریقے سے سیکھے۔ جو سب سے زیادہ آسان اور صاف ہے۔ اور جس میں اکثر وہی باتیں ہیں جو ہندوستانی رسول فرما گئے تھے۔

رام جی اودھ کے راجہ دسرتھ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ہندوستان میں رام لیلا کا مشہور میلا انہیں کی یادگار میں منایا جاتا ہے۔ ابھی سولہ برس کی عمر بھی نہ ہوئی تھی کہ اپنے خاندانی پیشوا بشست جی کے ہمراہ سیاحت کو نکلے اور تمام مشہور اور متبرک مقامات اور اہل اللہ بزرگوں کی زیارتیں کیں۔ قدرتی نظارے دیکھے۔ دنیا کے نشیب و فراز ملاحظہ کئے۔ جب واپس آئے تو عجیب حال ہو گیا۔ ہر وقت سوچ اور فکر میں مستغرق رہتے نہ کھاتے نہ پیتے۔ اور دنیا کے تفریحی مشغلوں سے نفرت ہو گئی۔ اکثر خاموش رہتے۔ اور بولتے تو فرماتے یہ دنیا کیسی بری دنیا ہے بالکل ہیچ و ناپائدار۔ اسی اثنا میں ایک ایسا موقع آیا کہ اس زمانہ کے مشہور بزرگ بسوامتر جی راجہ دسرتھ کے پاس آئے اور رام جی کو کسی سرکش و بدکار کی ہلاکت کے لئے مانگا۔ راجہ نے ان کی کمسنی اور ناتجربہ کاری کا عذر کیا۔ مگر بسوامتر جی کے اصرار سے رام جی دربار میں بلائے گئے۔ اور ایک ایسی عالمانہ و عارفانہ تقریر کی کہ راجہ اور تمام درباری خاصکر بشسٹ اور بسوامتر جیسے عارف لوگ حیران رہ گئے کہ یہ کمسن بچہ کیسی باتیں کرتا ہے۔

رام جی نے اپنی تقریر میں انسانی ہستی کے تمام مدارج اور دنیا کے تغیرات کی نسبت بشسٹ جی اور بسوامتر جی سے سوالات کئے۔ مگر ایسے پیرایہ میں جیسے کوئی شخص تجاہل عارفانہ کرتا ہو خود ہی ایک امر کی نسبت شک و شبہ بیان کرتے اور خود ہی ایک لطیف کنایہ سے اس کا جواب دیتے۔ بسوامتر اور بشسٹ نے رام جی کے سوالات کا جواب دیا۔ مگر انصاف سے دیکھا جائے تو

صاحب عرفان سائل کے سوالات

کی شان کے موافق ان لوگوں کے جواب نہ تھے۔ یہ رام جی کا شروع حال ہے اس کے بعد انہوں نے ایک خاص امتحان کے موقع پر بیسیوں راجوں کے مقابلہ میں ایک مشہور کمان توڑ کر امتحان پاس کیا۔ اور راجہ جنک کی بیٹی سیتا جی کو جیت کر بیوی بنا لیا۔ پھر چند سال تک اپنی سوتیلی ماں کے حسد کے سبب صحرا کی زندگی بسر کرتے رہے۔ یہاں ان کے ہمراہ ان کے بھائی لچھمن جی اور بیوی سیتا جی بھی تھیں۔ یہیں ان کو ایک سرکش و بدکار راجہ نے جس کا نام راون تھا دھوکہ دیا۔ اور ان کی بیوی سیتا کو چرا کر لے گیا۔ اور رام جی کو اس کے ملک لنکا پر حملہ کرنا پڑا۔ چنانچہ ہنومان نامی کوہستان کے راجہ کی مدد سے لنکا فتح کر کے راون کو مارا۔ اور سیتا کو چھینا۔ اس کے بعد اپنے راج استھان دار الخلافہ اجدھیا پوری میں واپس آئے۔ اور راج کرنے لگے۔ اسی راج کے زمانہ میں انہوں نے رسالت کے فرائض کو پورا کیا۔

ایک عجیب بات ہے جس کی بابت حدیثوں میں بھی اشارہ ہے کہ ہر بڑے رسول کو ایک بڑے دشمن سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور وہ دشمن اسی رسول کے ہاتھ سے ہلاک ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم کو نمرود اور حضرت موسیٰ کو فرعون اور ہمارے حضور صلعم کو ابو جہل سے سابقہ پڑا تھا۔ اسی طرح رام جی کو راون اور کرشن جی کو کنس جیسے خونخوار دشمن دئے گئے تھے۔ جو مذکورہ بالا دشمنوں کی طرح ذلت و خواری سے ہلاک ہوئے۔

مگر اس ظاہری خصوصیت کے ساتھ میرے خیال میں ایک اور خصوصیت بھی ہے جس کو حضرت مولانا محی الدین ابن عربی نے بھی لکھا ہے کہ فرعون وغیرہ صفت قہاری کے ظہور رکھتے۔ چونکہ خدا کو صفت رحیمی اور شان رحمت ظاہر کرنی مقصود تھی جو رسولوں کے ذریعے سے ظاہر کی۔ اس واسطے شان جلالت وجبروت کو بھی ہر رسولؐ کے زمانہ میں ظاہر کیا۔ رام جی کے زمانہ میں راون بھی شان قہر کا مظہر تھا۔ چونکہ شان قہر کے ظہور کے لئے مختلف صورتیں اور طریقے ہیں۔ اس لئے راون کے بہت سے ہاتھ اور سر بیان کئے جاتے ہیں۔

اب رام جی کے چند اقوال جو اُن کی تعلیم کا نمونہ ہیں یوگ بسشٹ اور رامائن سے اخذ کرکے بیان کئے جاتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ دنیا کی مثال چمکدار ریت کی ہے جو پیاس نہیں بجھا سکتی۔ مگر پیاسے کو دھوکے میں ڈالتی ہے۔ اسلام بھی دنیا کو سراب کی مثال سے یاد کرتا ہے۔ فرمایا جن کے پاس کتابیں ہیں۔ اور سمجھتے نہیں وہ بوجھ اُٹھانے والے مزدور ہیں۔ قرآن شریف میں اس کی مثال بوجھ اُٹھانے والے گدھے سے دی گئی ہے۔

فرمایا۔ دل کتا ہے۔ جہاں مردار دیکھتا ہے کھانے کو دوڑتا ہے۔ ہمارے حضورؐ نے فرمایا الدنیا جیفۃ وطالبہا کلاب۔ دنیا مردار ہے۔ اور اس کے طالب کتے

فرمایا۔ جو کچھ دریافت کرتا ہے اپنے آپ سے دریافت کر کہ سب کچھ تجھ میں ہے۔ قرآن شریف میں بھی ایسا ہی ارشاد ہے کہ وفی انفسکم افلا تبصرون اپنے آپکو کیوں نہیں دیکھتے۔ اور حدیث میں ہے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔

اور فرمایا۔ بارہا دیکھا گیا کہ ایک اکیلا مرد بڑے گروہ کو بھگا دیتا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ (ترجمہ) بعض دفعہ چھوٹا گروہ

بڑے پر غالب آجاتا ہے۔

فرمایا۔ یہ عالم محسوس وہم خیال ہے۔ مگر تعجب ہے کہ جو نہیں ہے وہ دکھائی دیتا ہے۔ اور جو ہے وہ نظر نہیں آتا۔

فرمایا۔ عمر کی مثال بجلی کی ہے کہ ایک دم چمکی اور ندارد۔

فرمایا یہ کیسا بُرا گھر ہے جس کا دروازہ ہڈی کا اور دربان بندریا ہے۔ بندریا زبان کو فرمایا اس لئے کہ اس کو قرار نہیں رہتا۔ آہنکار یعنی ہماہی آدمی کی دشمن ہے۔

فرمایا۔ دنیا میں رہنا اور اس میں مبتلا نہ ہونا ایسا ہے جیسے دریا میں کوئی ہو اور تر نہ ہوے

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ۔ باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اور فرماتے ہیں (۱) سنتوش پرم لابھ (صبر میں سب سے بڑا فائدہ ہے) (۲) ست سنگ برہم دھنم (اچھی صحبت بڑی دولت ہے) (۳) بچار پرم گیانم (سوچنا بڑی عقلمندی ہے) (۴) سم چہ پرم سکھم (سب کو ایک نگاہ دیکھنا بڑا سکھ ہے)

کیا اچھی تعلیم ہے مگر افسوس زیادہ بیان کرنے کی گنجائش نہیں۔ رام جی کے بعد مختصر حال سری کرشن جی کا بھی معلوم کرلینا چاہئے۔ کرشن جی کے ساتھ بعینہ وہ قصہ پیش آیا ہے جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ پیش آیا تھا یعنی کرشن جی کے ماموں راجہ کنس کو جو متھرا پر حکومت کرتا تھا نجومیوں نے خبر دی تھی کہ تیری بہن دیوکی کا آٹھواں فرزند تیرا قاتل ہوگا۔ اس خبر نے کنس کو ایسا حواس باختہ کیا کہ اس نے اپنی بہن اور بہنوئی کو قید کردیا۔ اور جو بچہ ان کے ہاں ہوتا اُسے مار ڈالتا۔ جب آٹھویں کرشن جی پیدا ہوئے تو ماں باپ نے چپکے سے ایک گاؤں میں جس میں گائے چرانے والے رہتے تھے۔ اس بچہ کو بھیجدیا۔ اور کنس سے بیٹی پیدا ہونے کا بہانہ کردیا۔

کرشن نے گوکل میں گھوسیوں کا گاؤں تھا پرورش پائی۔ جب ہوشیار ہوئے

تو ان سے عجیب و غریب باتیں ظاہر ہونے لگیں اس کی راجہ کنس کو خبر پہونچی اور وہ سمجھ گیا کہ یہ میرا بھانجا ہے۔ ان دنوں کرشن جی رسولوں کی سنت خاصکر حضرت موسیٰ کی سنت کے موافق گائیں چرایا کرتے تھے۔ ماموں نے حیلے سے بلایا اور قتل کرنا چاہا۔ مگر انہوں نے اسی کو ہلاک کر ڈالا۔ اور دنیا کو اس ظالم سے پاک کیا۔

ان ایام میں کرشن جی کا بانسلی بجانا اور گوپیوں سے اختلاط کرنا سب استعارے ہیں۔ جن سے ان کی پاکبازی پر حرف نہیں آسکتا۔ کنس کے مرنے کے بعد انکی زندگی میں نئے آثار شروع ہوئے۔ اور حکومت ظاہری کے ساتھ ہی انہوں نے روحانی حکومت کے اصول بیان کرنے شروع کئے۔ چنانچہ جب ہندوستان کی مشہور لڑائی مہابھارت ہوئی ہے جس میں کرشن جی نے اپنے چیلے ارجن کو اپدیش دیے۔ انہی لکچروں کے مجموعہ کا نام گیتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے مغالطہ کی پیدا شدہ تکلیف سے نجات پاسکتا ہے اگر تین طریقے اختیار کرے۔

(۱) قدرت کاملہ اور قدرتی اشیاء کا عشق (۲) فرائض معلوم کرنیکے لئے تحصیل علم (۳) فرائض کا ادا کرنا بلا خواہش نفسانی انہی تین اصولوں پر بحث کی ہے۔ اور ادھیائے سنیاس یوگ میں فرماتے ہیں۔ ذی علم اور خلیق برہمن گائے ہاتھی۔ کتے اور بدکار آدمی سب کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور فرمایا وہ یوگی سے بھی بڑھکر ہے جو بھلا چاہنے والوں دوستوں۔ دشمنوں۔ قابل نفرت لوگوں نیکیوں اور بدوں سب کو یکساں سمجھتا ہے۔ گیتا ۶-۱ ادھیائے۔

علالت کے سبب سے میں کرشن جی کے اقوال زیادہ تفصیل اور اسلامی مطابقت کے ساتھ جمع نہیں کرسکا۔ انشاءاللہ کسی دوسرے موقع پر پیش کئے جائیں گے۔ البتہ سامعین کی دلچسپی کے لئے ایک وظیفہ بیان کیا جاتا ہے۔ جو کرشن جی کے پیرو کسی سختی کے وقت پڑھتے ہیں۔ وظیفہ یہ ہے۔

کرشنا کرشن پرمہ آتما پرنند یے بھجنم ہرترانگ شرنم بام سے بے بھیتا پرتنگ دیئے

مگر افسوس ہے کہ کرشن جی کے اقوال کے لفظوں کی پوجا کرلی جاتی ہے۔ جس کا نام گیتا کا پارٹ ہے۔ اور بہت کم لوگ اس کے عجیب فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی رسولوں کی پیشین گوئی لکھدی جائے۔ جس سے ہمارے حضورؐ کی نسبت خبر دی گئی ہے۔ ہمارے سلسلہ نظامیہ کے ایک بزرگ مولوی شاہ حکیم محمد حسن صاحب نظامی نے ایک ضخیم تفسیر لکھی ہے جس کا نام غایۃ البرہان ہے۔ اس تفسیر میں تمام دنیا کی مذہبی کتب سے حضرت صلعم کی خبریں لکھی گئی ہیں۔ اور عجیب معلومات سے انکو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ وید کی پوری عبارتیں مع تشریح درج ہیں۔ جن کا نقل کرنا مشکل ہے۔ جن کو شوق ہو مولوی شاہ فضل احمد صاحب نظامی سے امروہہ ضلع مراد آباد کے پتے پر یہ مطبوعہ تفسیر منگا کر دیکھ لیں۔ میں صرف ایک حصہ کا اقتباس کرتا ہوں۔ جہاں کلنگی پورانوں کے حوالہ سے مولانا نے حضرتؐ کی خبر لکھی ہے لکھتے ہیں۔

کلنگی اوتار کے باپ کا نام وشنو لیش ہوگا۔ وشنو کے معنی اللہ اور ولیش کے معنی عبد یعنی عبداللہ نام ہوگا۔ ماں کا نام سومتی یعنی امانت دار ہوگا۔ سو حضورؐ کی والدہ کا نام آمنہ تھا۔ پہلے پہاڑ کے غار میں عبادت کریں گے۔ سو حضرت نے غار حرا میں عبادت کی۔ پھر شمالی پہاڑوں میں ہجرت کریں گے۔ سو ہجرت بھی ہوئی۔ پہاڑ کی کھوہ میں پرشرام سے تعلیم پاویں گے۔ پرش کہتے ہیں روح کو اور رام خدا کو یعنی روح خدا اسم اور جبرئیل فرشتے سے ہے۔ سو حضرت جبرئیلؑ سب سے پہلے وحی لیکر آئے۔ شنبھل نگری میں پیدا ہوں گے۔ شنبھل دیپ کی نسبت مولانا نے ایک زبردست بحث کرکے ثابت کیا ہے کہ شنبھل ملک عرب کو کہتے ہیں۔ کلنگی اوتار کے چار بھائی ہوں گے۔ جن کے ذریعہ وہ فتحیاب ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس بیان سے میری غرض یہ ہے کہ جس طرح سب پیغیبر ہمارے حضورؐ کی تصدیق کرتے آئے ہیں۔ ہندوستانی رسولوں نے بھی تصدیق کی ہے۔ پس ہندوستانی رسولوں کی امت کو بھی حضورؐ کی تصدیق کرنی چاہیئے۔ اور ہم کو بھی ہندوستان کے تمام رسولوں پر ایمان لانا چاہیئے۔ اسی میں ہندوستان کی ظاہری و باطنی بہبودی ہے۔ اور یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہندو مسلمانوں میں دلی اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ہندوؤں کا مسلمان اور مسلمانوں کا ہندو ہونا مشکل ہے۔ نہ اس بیان سے میری یہ غرض ہے میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ان دونوں قوموں کی باہمی نفرت و اجنبیت دور ہو۔ ہر ایک دوسرے کے پیشوا کی عزت کرے۔ اور گلے ملنے کے لئے پہلے مسلمانوں کا قدم آگے بڑھے۔ سلام علی المرسلین والحمد للہ رب العلمین۔

السلام علیکم

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

مسلمانوں کا ذریعہ خطاب ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ تم سلامت رہو۔

ہندوستان میں اس کی جگہ آداب و تسلیمات کا رواج ہو گیا تھا اور اب گڈ مارننگ۔ گڈ نائٹ اور گڈ بائی کے چرچے ہیں۔

یہ زمانہ کا اثر ہے۔ مگر مسلمان وہ ہے جو اپنے دل کو آثار وقت سے محفوظ رکھے۔ اور دینی امور کو اپنا شعار بنائے۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو خدا رسولؐ کے مقرر کردہ سلام کی پیروی کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے جب ملتے ہیں تو سلام علیکم۔ وعلیکم سلام کہکر ہمکلام ہوتے ہیں۔

ہمارے خیال میں جن لوگوں کو خط و کتابت زیادہ کرنی پڑتی ہے وہ بڑے خوش قسمت ہیں کہ ہر روز صبح اُٹھتے ہی سلامتی کی دعائیں ان کو ملتی ہیں۔

ہم جس وقت توحید کے خطوط کھولتے ہیں تو سب سے پہلے جس چیز پر نگاہ پڑتی ہے وہ سلام علیکم ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ آج پچاس سلامتی نامے ہم کو ملے۔ تو خدا کا شکرانہ بیجھتے ہیں کہ اُس نے ہم کو ایسے مذہب میں پیدا کیا ہے جسمیں سلام علیکم جیسی پیاری اور مبارک چیز سے بات چیت شروع ہوتی ہے۔

مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی خط میں سلام علیکم نہیں ہے۔ یا اس کی جگہ کوئی انگریزی لفظ ہے تو بے اختیار ہماری زبان سے افسوس نکلتا ہے۔ کاش وہ جانتے کہ سلام نہ لکھنے سے انہوں نے اپنا اور ہمارا دونوں کا نقصان کیا۔ اگر وہ سلام علیکم لکھتے تو ہم اُس کے جواب میں علیکم السلام کہتے۔ گویا اس طرح دونوں طرف سے دعا ہو جاتی۔

اجنبی ملکوں میں جہاں مسلمان ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے۔ سب سے پہلی اور سب سے بڑی چیز یہی سلام علیکم ہے۔ جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے دینی بھائی سے مخاطب ہیں۔

لہٰذا اے مسلمانو! تم کو لازم ہے کہ جب آپس میں ملاقات کیا کرو یا کسی کو خط لکھو تو السلام علیکم ضرور استعمال کیا کرو۔ السلام علیکم۔

خدا تم کو سلامت رکھے

مرغ کی اذان

از اخبار توحید ۱۹۱۳ء

ہر سچا مسلمان جو رمضان شریف کی سحری کے لئے آج کل پچھلی رات بیدار رہتا ہے۔ مرغ کی اذان سنتا ہوگا۔ اس پردار جانور کی آواز میں غور کرنے والے مومنین کے لئے ایک بڑی نصیحت ہے۔ مرغ کہتا ہے میری اذان نیچرل ہے۔ مگر بے نتیجہ ہے مسجد کے موذن کی اذان اَن نیچرل ہے۔ لیکن با نتیجہ ہے۔ جو مسلمان خدا و رسولؐ کے نام

کو تقریروں میں اثر پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مگر احکام الٰہی پر عمل نہیں کرتے۔ ان کی مثال مُرغ کی اذان کی سی ہے کہ دوسروں کو جگاتا ہے۔ اور خود عمل نہیں کرتا۔ اصل اذان مسجد کے موذن کی ہے۔ جو نماز کے لئے بُلاتا ہے اور خود بھی نماز پڑھتا ہے۔

تیس ۳۰ راتوں کی شان

اندھیرا روشنی پر غالب ہے

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

گیارہ مہینے کے رات دن رمضان کی تیس راتوں کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے۔

لوگ کہتے ہیں روزہ کا دن ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دن دنیا ہے اور رات دین۔ جس طرح دنیا میں انسان اعمال کرتا ہے۔ اور دین یعنی عالم آخرت میں اُس کا بدلہ پاتا ہے۔ اسی طرح رمضان میں دن کے وقت بھوک پیاس کے اعمال ہیں اور افطار کے بعد آخرت کی بہاریں۔

کیا خدا کی شان ہے، رمضان کی تیس راتیں سارے سال کے روشن دنوں پر بھاری ہیں۔ افطار کا لطف رات کے شروع میں۔ تراویح کی کیفیت اسی شب تار میں۔ سحری کی بہار اسی وقت تاریک میں۔ اندھیرا جس قدر فخر کرے کم ہے کہ خدا نے اس کی آبرو کو نور کے سامنے چار چاند لگا کر دوبالا کر دیا۔ رمضان کی راتیں وہ راتیں ہیں جن میں قرآن شریف نازل ہوا۔ جن میں ایک رات ہزاروں راتوں سے بڑھ کر ہے۔

جس کی تجلیات آفتاب و ماہتاب اور تمام برق صفات انوار سے اعلےٰ ہیں۔

نئی روشنی کی دوزخ جنت

(از صوفی جنوری ۱۹۱۵ء)

ایک چیز ہے جس کو روشنی کہتے ہیں۔ وہ مٹی کے تیل یا گیس و برق کے لیمپ نہیں ہیں۔ بلکہ نئے بدلے ہوئے زمانے کے حالات، خیالات اور جذبات ہیں۔ پرانے وقت کے لوگ اس کو اندھیری روشنی کہیں تو زیبا ہے کہ حضرت ابن عربی نے فرمایا نور کی اصلیت سیاہ فام ہے۔ لیکن نئی روشنی والوں کو آج تک نور کی حقیقت میں پس و پیش ہے۔ سورج چاند اور زمین کی مصنوعی روشنیوں کے سوا انھوں نے کبھی کسی کا مشاہدہ نہیں کیا۔ پس ثابت ہوا کہ نور ایک وہمی چیز ہے۔ اور نئی روشنی والوں کو اندھیری روشنی کہنا ایک توہم ہے۔ پرانے لوگ ہمیشہ توہمات کے پانی پر قلعہ بنایا کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی پھر زندہ ہوتا ہے۔ اور اس کو دوزخ جنت میں جانا پڑتا ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے جو چیز مر گئی فنا ہو گئی۔ اُس کی جگہ دوسری آگئی نیچر بغیر ضرورت کوئی کام نہیں کرتی۔ اور چونکہ دوبارہ زندہ ہونے کی کوئی عقلی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا غلط۔ خزاں کے موسم میں درخت کے پتے سوکھ کر گر پڑتے ہیں۔ بہار میں دوسرے پیدا ہو جاتے ہیں۔ قدرت کا یہی قاعدہ ہے۔ مُردہ اور سوکھے پتے دوبارہ نہیں ہرے ہوتے۔

جب قدرت اس پر قادر ہے کہ اور پتے پیدا کر دے تو اُس کو پرانے پتوں کے ہرا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ نہ ضرورت ہے نہ اُس میں طاقت ہے۔ کیونکہ اُس نے کبھی ایسا نہیں کیا پس یہ عقیدہ غلط ہے۔

ہم نے جو اچھے بُرے کام کئے تھے۔ اُنکا بدلہ قانونِ حکمت سے پا چکے۔ اب

دوبارہ حساب کتاب کی کیا ضرورت ہے۔ اور چونکہ کچھ ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا حشر کا ہونا اور میزان حساب میں نیکی بدی کا تولنا عبث ہے۔

جو گناہ ایسے ہوئے جن کی خبر قانون کو نہ ہوئی ان پر ہمارے دل نے جس کو ضمیر بھی کہتے ہیں ملامت کر دی۔ اور ہم کو تکلیف وہ پشیمانی بھی ہو گئی۔ پس یہی حساب اور جزا و سزا ہے۔ اور کچھ ضرورت نہیں کہ ایک عالم آخرت بھی ہو۔ لہٰذا یہ عقیدہ بھی وہم ہے۔

جنت میں جن چیزوں کے دیئے جانے کے وعدے ہوئے ہیں وہ بالکل خلاف انسانیت ہیں۔ ایک مرد کئی کئی بیویاں رکھے گا۔ یہ تکلیف دہ کام ہے۔ حالانکہ جنت میں خوشی ہی خوشی بیان کی جاتی ہے۔

جنت میں سب جوان ہوں گے۔ یہ خلاف نیچر ہے۔ قدرت نے بوڑھے جوان کا فرق بڑی مصلحت سے رکھا ہے۔ سب ایک وضع کے ہوں گے تو لطف ہی کیا آئے گا۔ اور چونکہ یہ خلاف نیچر ہے۔ اس لئے غلط ہے۔ اور غلط ہے اس لئے وہم ہے۔ اور وہم ہے لہٰذا پرانے لوگوں کی بات ہے۔

جنت میں شراب ایک ہی قسم کی دی جائے گی جس کا نام طہور ہے۔ مگر انسان کی خواہش رنگا رنگی چاہتی ہے۔ اس لئے اس نے طرح طرح کی شرابیں بنائی ہیں۔ پس چونکہ یہ بھی خلاف فطرت ہے۔ لہٰذا غلط ہے۔

جنت میں خدمت گار صرف لڑکے ہوں گے۔ اور چونکہ جنت کے باشندوں کو جوان ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ لڑکے جنت سے باہر رہیں گے پس وہ خدمت کیوں کر کریں گے۔ لہٰذا یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔

جنت میں مردوں کو زیور پہنائے جائیں گے۔ اور یہ خاصہ عورتوں کا ہے۔ لہٰذا خلاف فطرت ہے۔ اور جو خلاف فطرت ہے وہ غلط ہے۔

جنت میں دودھ شہد کی نہریں ہوں گی۔ لیکن شہد چھتے میں ہوتا ہے اور دودھ تھن میں۔ زمین میں اس کی نہر کا ہونا خلاف فطرت ہے۔ لہٰذا غلط ہے۔

جنت میں ایک موتی کا محل ہوگا۔ موتی اتنا بڑا ہوتا نہیں۔ اور یہ امر سراسر خلاف قدرت ہے لہٰذا غلط ہے۔

دوزخ میں آگ ہی آگ بیان کی جاتی ہے اور اس میں سانپ بچھوؤں کا ہونا بھی ثابت کیا گیا ہے۔ اور چونکہ آگ میں سانپ بچھو زندہ نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا یہ خلاف نیچر ہے اور غلط ہے۔

دوزخ میں عذاب کے فرشتے بھی ہوں گے اور فرشتے نوری ہیں اور نور کو نار کا عکس بیان کیا جاتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ فرشتے آگ میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور ان کا وہاں ہونا خلاف فطرت ہے۔ لہٰذا غلط ہے۔

فطرت نے ہر چیز کا علاج پیدا کیا ہے۔ پس اگر بالفرض دوزخ میں یہ سب باتیں ہوں گی تو ان کا علاج بھی ضرور پیدا کیا ہوگا۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ انسان کوئی آتش پروف آلہ ایجاد نہ کرے۔ جس طرح کہ پانی سے بچنے کے لئے واٹر پروف کا آلہ نکلا ہے۔ اور سانپ بچھوؤں سے بچنے کے واسطے اس قسم کا اوزار نہ بنالے۔

اس کے علاوہ دوزخ جنت ہوں گی کہاں۔ دنیا کی زمین کا رقبہ انسان نے معلوم کر لیا ہے۔ اگر ابتداء سے سب آدمی زندہ ہو جائیں تو اس زمین میں اتنی گنجائش نہ ہوگی۔ اور اس زمین کے علاوہ کسی دوسرے کرہ میں انسان کا زندہ رہنا محال ہے۔ کیونکہ وہ خاکی نژاد ہے۔ اور جنس خاکی ہی میں زندہ رہ سکتا ہے پس ثابت ہوا کہ دوزخ جنت کو زمین پر ہی ہونا چاہیئے۔ اور زمین میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔ پس یہ خلاف نیچر ہے۔ لہٰذا غلط ہے۔

نئی روشنی والوں کو جواب خود نئی روشنی ہی دیتی ہے۔

چونکہ نیچر و فطرت یکساں حالت پر کبھی نہیں رہتی ۔ بدلتا رہنا اس کا خاصہ ہے اس واسطے ایک عرصہ دراز کے بعد اس میں غیر معمولی اور خلاف دستور تبدیلی کا ہونا لازمی ہے ۔ اور وہ تبدیلی یہ ہے کہ نئے آدمی زندہ کرنے کی بجائے پرانے مردوں کو زندہ کرے ۔ اور چونکہ نیچر خود ضرورت ہے ۔ اس لئے وہ کسی ایسی ضرورت کے ماتحت نہیں ہو سکتی جس کو آدمی کی عقل ضرورت کہتی ہو ۔

قانونِ حکومت کے حق و ناحق فیصلہ کے لئے کونسی عدالت ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ قانون نے غلطی کی ۔ اور فیصلہ ٹھیک نہ کیا ۔ لہٰذا اقتضائے فطرت ہے کہ وہ جمع کرتے کرتے سب ایک دن جزا و سزا پر نظر ثانی کرے اور ٹھیک فیصلے کر دے ۔

بہت سے گناہ ہیں جن کو انسان کا ضمیر گناہ نہیں سمجھتا ۔ اس لئے اس پر ملامت نہیں کرتا ۔ اس کا فیصلہ ہونا ضروری اور نیچرل ہے ۔ لہٰذا ہونا چاہئے اور یوم آخرت کو ہو گا ۔

جنت میں سب کام جنتی کی خواہش پر ہوں گے ۔ اس لئے کہ قرآن شریف میں وفیہ ما تشتہون آیا ہے یعنی جنت میں جس کی خواہش کرو گے وہی ملے گی پس اگر نئی روشنی والوں کو ایک ہی بیوی منظور ہو گی تو ایک ہی دی جائیگی بلکہ وہ چاہیں گے تو ایک ولایتی مس بھی مل جائے گی ۔

جنت میں سب جوان ہوں گے کیونکہ وہ نیکیوں کا کلب گھر ہے جس طرح دنیا میں بوڑھوں کے کلب علیحدہ ہیں ۔ جوانوں کے علیحدہ ۔ مجردوں کے جدا ۔ شادی شدہ لوگوں کے علیحدہ ۔ اور یہ کلب کے ممبر آپس میں ہنسی خوشی سے رہتے ہیں ۔ یہ نہیں کہتے کہ ہم میں ناجنس بھی آئے ۔ بلکہ ناجنس ممبر سے گھبراتے ہیں ۔ پس ثابت ہوا کہ جنتی کلب میں سب کا جوان ہونا حسب فیشن و نیچر ہے ۔

جنت میں خدمتگار لڑکے ہوں گے اور آپ ان کو بوائے کہکر آواز دیسکیں گے ۔

ان کی حیثیت خدمتگاروں کی ہو گی ۔ مالک مکان کی نہ ہو گی ۔ اس واسطے ان کا داخل جنت ہونا اس طرح ثابت ہے جس طرح کلب گھر کے بوائز (لڑکوں) کا ۔

جنت میں ہر قسم کی شرابیں ہوں گی ۔ طہور کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی قسم ایک ہے ۔ بلکہ یہ کہ وہاں کی شراب پی کر آپ گندی موریوں میں اوندھے منہ نہیں گریں گے وہ پاک نشہ ہو گا جس سے پاک جذبات و حالات ظاہر ہوں گے ۔

جنت کے زیور مثلاً بیان کئے گئے ہیں ۔ آپ کو صرف ایک انگوٹھی ملے گی جس میں سونا پیتل ملا ہوا ہو گا ۔ اور نکٹائی و کالر کا پن مل جائے گا ۔ اپنی مرضی پر ہے ۔

دودھ تھن ہی میں نہیں ہوتا ۔ ٹین کے ڈبوں میں بھی ہوا کرتا ہے جس نیچر نے اس کو منجمد کر کے اس قابل بنا دیا ۔ وہی اس کی نہر بھی بہا سکتا ہے ۔ یہی حال شہد کا ہے ۔

ایک موتی کا محل خلاف نیچر نہیں ہے ۔ اپنی خوردبین سے لگا کر دیکھ لینا جس علم نیچر سارے جہان کے سب مرے ہوئے آدمیوں کو رکھے گی وہاں کے سمندر بھی چھوٹے نہ ہوں گے اور ان کے موتی بھی دنیا کے سمندروں کی مانند نہ ہوں گے ۔

دوزخ میں آگ کے اندر سانپ بچھوؤں کا زندہ رہنا عقل کے موافق ہے ۔ آگ کے کیڑے دنیا میں پائے جاتے ہیں ۔

دوزخ کے فرشتے بھی آتشی نوری مخلوق ہیں ۔ اس لئے وہ اس کے اندر زندہ رہ سکتے ہیں ۔

بیشک فطرت نے ان کا علاج پیدا کیا ہے ۔ اور بتا دیا ہے ۔ اور وہ یہ ہے کہ مرکز زندہ ہونے پر یقین رکھو ۔ اور اس خبر کے بیان کرنے والوں کے حکموں کو مانو اور ان پر عمل کرو ۔

تم واٹر پروف کی جگہ اگر آتش پروف نکال بھی لو ۔ تب بھی دوزخ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے ۔ تمہارے لئے آگ نہ ہو گی سانپ بچھو نہ ہوں گے ۔

بلکہ بنک فیل ہونے کی خبریں ہوں گی۔ پیاری مسوں کے انکاری خطوط ہوں گے۔ حقارت کے آوازے ہوں گے شیم شیم کے نعرے ہوں گے۔ تم کو ہر وقت بارش اور کہر کا سامنا ہوگا۔ تمہارے تجارتی جہاز آنکھوں کے سامنے غرق کئے جائیں گے۔ تم کو ہڑتالوں کی خبریں دی جائیں گی۔ تم سے کہا جائے گا کہ تم آزاد نہیں ہو۔ تم کو سنایا جائے گا کہ سلیف گورنمنٹ تم کو نہیں مل سکتی۔ تمہارے خلاف اخباروں میں لمبے لمبے آرٹیکل چھاپے جائیں گے۔ اور تم کو دکھائے جائیں گے۔

تمہارے آگے تھیٹر اور بائسکوپ کے تماشے ہوں گے۔ اور ان میں تمہاری تحقیر و تضحیک کی جائے گی۔ تم کو ڈیم فول کہہ کر ٹھکرایا جائیگا۔ تم کو بغیر کالر و نکٹائی کے کپڑے پہنا کر بازار میں نکالا جائے گا۔ تم کو میلے اور ٹوٹے ہوئے بوٹ پہنا کر مسوں کے کلب میں بھیجا جائے گا۔ اور وہ تم پر قہقہہ لگائیں گی۔

تم کو نہانے کو پانی نہ ملے گا۔ تم کو بٹھا کر پیشاب کرایا جائے گا۔ تم کو کہا جائے گا کہ اپنے نیچر کے خلاف مضامین لکھو۔ اور تم کو چار و ناچار لکھنے پڑیں گے۔

دوزخ میں تمہاری عورتوں کو پردے میں بٹھایا جائے گا۔ اور ان کے ناک کان چھیدے جائیں گے۔ چونکہ یہ سب باتیں تمہارے فیشن تمہاری عادت تمہارے خیالات اور تمہاری خواہشات کے خلاف ہوں گی۔ اس واسطے ان میں تم کو وہی تکلیفیں ہوں گی جو ایک سیدھے سادے آدمی کو آگ اور سانپ بچھو سے ہو سکتی ہیں۔ اور اسی کا نام دوزخ ہے۔

رہا یہ کہ دوزخ ہوگی کہاں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی خاکی زمین پر جسکو نیچر ربڑ کی طرح اتنا لمبا چوڑا بنا دے گی کہ ساری دنیا کے اگلے پچھلے مرنے والے اس میں بخوبی سما سکیں۔

جبکہ فطرت آج کل کے معمولی زمانہ میں زمین کے طویل و مختصر کرنے کے سامان دکھا

رہی ہے تو اس زمانہ میں تو اُس کے کارناموں کی کچھ حد نہ ہوگی۔ کیونکہ نیچر اسوقت ایک غیر معمولی تبدیلی و انقلاب کی جانب ہوگی۔

پس ثابت ہو گیا کہ میدان حشر، جنت، دوزخ سب اس زمین پر ہوں گے اور ان کا ہونا از روئے نیچر ثابت ہے۔

نئی روشنی کی جنت دوزخ کے بحث مُباحثہ کو سنکر ان کو دیکھو جو دعویدار تصوف ہیں اور اپنی دوزخ جنت سارے جہان سے الگ بتاتے ہیں۔ کیا مجذوبانہ بڑ مار رہے ہیں۔ کچھ کچھ تو سمجھ میں آتا ہے۔ ذرا کان لگا کر سننا۔

کسی کی جنت کسی کی دوزخ۔ انہوں نے بیچارے بندوں کو کُن کی انگلی پر نچا رکھا ہے۔ کسی سے کہتے ہیں جنت دوں گا کسی کو کہتے ہیں دوزخ میں ڈالدونگا کہیں دیدار کا وعدہ کرتے ہیں۔ کسی کے سامنے صاف مکر جاتے ہیں کہ بھلا مجھ کو کون دیکھ سکتا ہے۔ میں کہیں دیکھنے کی چیز ہوں۔

مانا کہ تم خدا ہو، تم قدرت والے ہو، تم کو سب کچھ آتا ہے۔ مگر ان اپنی بنائی ہوئی صورتوں کے ستانے میں کیا رکھا ہے۔ اس میں آپ کو کیا مزا آتا ہے ہم تو جانیں جب تک کن فیکون کا خلعہ آمد ہے ہر ہستی دوزخ میں ہے۔ اور جب یہ دور ختم ہو جائے گا۔ ہر وجود جنت میں چلا جائے گا۔

شذرات

(از اخبار خطیب ۳۰ جنوری ۱۹۱۵ء و ۱۰ فروری ۱۹۱۵ء)

قہر خدا پناہ! خدا کا غضب بری چیز ہے۔ خبر آئی ہے کہ اٹلی کے ایک حصہ میں زلزلہ آیا۔ شہروں کی آبادیاں سرنگوں ہو گئیں۔ لاکھوں آدمی مر گئے اور زخمی ہو گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سینٹ پال کی مورت چھت سے گری اور پاش پاش ہوگئی

اٹلی کے دل میں خدا کا خوف نہ رہا تھا اس نے بے گناہ عربوں پر چڑھائی کی تھی اور طرابلس میں ہزاروں معصوم عورتوں اور بچوں کو بیوہ اور یتیم ہی نہیں کیا بلکہ ان کو سنگینوں اور بندوقوں کا نشانہ بنایا تھا۔ اور سمجھتے تھے کہ ہم خودمختار ہیں۔ جو چاہیں کریں۔ اور ہمارا کوئی پوچھنے والا نہیں۔

لیکن آسمان کی سلطنت ان شرارتوں کو حساب کے رجسٹروں میں لکھ رہی تھی۔ آخر وقت آگیا اور فرشتے زلزلہ کا عذاب لیکر نازل ہوئے۔ اور اہل اٹلی کو زیر و زبر کر دیا۔

اٹلی میں بت پرستی کام کرتی ہے۔ وہاں مسیح اور ان کے حواریین کی پرستش ہوتی ہے۔ گرجاؤں میں بت رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قہر نے ان بتوں کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اب تو جناب پوپ کو ہوشیار ہو کر بت پرستی چھوڑنی چاہیے۔

اس واقعہ سے مسلمانوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ وہ ہر وقت خدا کے غیظ سے ڈرتے رہیں۔ اور گناہوں کی توبہ کریں۔ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ اپنے دشمنوں کی تباہی پر خوش ہونا نامردی ہے۔ ڈرو کہ تم ان بلاؤں سے محفوظ رہو۔

صاحب بہادر کا سلام

تم نے سنا ہوگا کہ جب کسی شخص سے کوئی انگریزی افسر ملاقات کرنی چاہتے ہیں تو چپراسی سے کہتے ہیں کہ فلاں کو ہمارا سلام دو۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہماری ملاقات کے لئے بلاؤ۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب مومن بندہ کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو فرشتہ بھی آن کر یہی کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے تجھ کو سلام کہا ہے۔ مومن کی روح یہ سنکر خوشی خوشی جسم سے پرواز کر جاتی ہے۔

مسلمان اپنے سب سے بڑے صاحب پر قربان ہوں۔ کیا ہی مہربان صاحب ہے

ایسے ناچیز مگر ایماندار بندوں کو کیسی محبت سے یاد فرماتا ہے۔ پھر کیوں نہ اس کی چاہت اور وفاداری کا دم بھرا جائے۔

من کہ نازک بدن ہم مستم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا انتقال ہوا تو آنحضرتؐ ان کے دفنانے کے وقت فرماتے تھے۔ یہ نازک بدن لڑکی ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ قبر اس پر تنگی نہ کرے۔ مگر وہ اس پر فراخ ہو گئی۔

امت بھی اپنے رسولؐ کی نازک بدن لڑکی ہے۔ بلکہ اولاد سے بڑھ کر پیاری ہے۔ اس واسطے اس قبر کی مشکل کے وقت ان کی شفاعت کا بھروسہ ہے۔ خدائے تعالیٰ ہر مسلمان کو اس کٹھن وقت میں اپنے رسولؐ کی شفاعت نصیب کرے۔ آمین۔

مرغ کی اذان

مرغیوں نے مرغ کی اذانوں سے دق ہو کر مسجد کے مؤذن سے فریاد کی۔ اس نے کہا کیا تم مرغ کی اذان سنتی ہو میں تو پانچوں وقت محلہ میں چیخ چیخ کر اذان دیتا ہوں۔ مگر محلہ والوں کے کان میں آواز نہیں جاتی۔ ان سے تو تم اچھی ہیں۔

مرغ کو خبر ہوئی تو وہ بھی آیا اور بولا۔ میں اپنی مستی کا یقین دلانے کو اذان دیتا ہوں۔ اس لئے تم کو ناگوار ہے۔ اور مؤذن خدا کی ہستی کا اعلان کرتا ہے اس لئے گوش اغیار بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ مگر خدا پرست دوڑے ہوئے مسجد میں آتے ہیں۔

غفلت کی نیند

سونے میں تم انگریزوں کی ریس نہ کرو۔ کیونکہ وہ اپنا کام کر چکے ہیں۔ اب ان کو آرام کی نیند اور زیادہ سونا زیب دیتا ہے۔ تم امیروں کی نیند پر نظر نہ کرو۔ ان کو دولت نے بے فکر کر دیا ہے۔ تم اگر تندرست اور مضبوط ہو تو ڈاکٹروں کے قول پر نفرت کا ووٹ پاس کرو۔ اور خوب جاگو۔ ڈاکٹر تم سے کہتے ہیں کہ صحت سات گھنٹہ کی نیند مانگتی ہے۔ مگر بڑے بڑے کام کرنیوالے

کبھی چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوئے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا ہے من طلب العلیٰ سہر اللیالی جو بڑا بننا چاہے اسکو راتوں کو جاگنا چاہیئے۔ نپولین زیادہ سونے کا دشمن تھا۔ اسی لئے قدرت نے بڑائی اور ناموری کو اُس کا دوست بنایا۔

سردی کی راتیں بڑی ہوتی ہیں۔ تمہارا جو پیشہ ہو ان کو رات کی بیداری میں ترقی دو۔ اول شب سو جاؤ پچھلی رات اُٹھ کر کام کرو۔ یہ دنیا کام کرنے کیلئے ہے سونے کا دوسرا عالم ہے۔ عمر بھر سوتا رہے گا۔ خاک کے سایہ تلے مشہور قول ہے۔

اول اول شب بیداری سے تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن جب عادت ہو جائے تو خوشی و شادمانی کا ٹھکانا نہیں رہتا۔ ہر وقت انسان بشاش رہتا ہے۔ کیونکہ فرض کی ادائگی اور ترقی ہی بڑی شادمانی کا سبب ہے۔

قال را بگذار کہنے کو سب کہتے ہیں کہ کرنا کہنے سے بہتر ہے۔ مگر یہ بھی قول ہے۔ فعل نہیں ہے۔ اس میں ہم کو انگریزوں سے سبق لینا چاہیئے جو کرتے پہلے ہیں اور کہتے بعد میں ہیں۔ ہندو کانگریس اور مسلم لیگ کے رزولیوشن میدان قال کے بڑے ہونہار جوان ہیں۔ مگر حال کی صف میں آتے ہیں تو نابود ہو جاتے ہیں۔ اگر ان فیشن طراز جماعتوں کو ان قالیہ فوجوں پر فخر ہے۔ تو خدا ان کے فخر کو زیادہ دن تک سلامتی نہ دے۔

ہمارا حال ماضی کی فراموشی اور استقبال کی خاموشی میں درخشان ہونا چاہیئے۔ اگر ہم بڑے تھے تو کیا ہوا۔ اگر ہم بڑے ہو جائیں گے تو کون جان سکتا ہے ہم کو آج کی حالت دیکھنی چاہیئے کہ نہ چھوٹے ہیں نہ بڑے ہیں۔ اور ضرورت ہم کو زندہ رہنے کی ہے۔ خدا کرے ہم قال کو چھوڑیں اور مردان حال بنیں۔

حقہ کے لئے تمباکو۔ ایک دوکان دار نے شکایت کی کہ ایک پیسہ کی بکری

نہیں ہوتی۔ حقہ کا تمباکو بھی گھر سے لانا پڑتا ہے۔

اس سے کہنا چاہیئے کہ گھر میں جو پونجی تمباکو منگاتی ہے وہ بھی اس دوکان کی بدولت ہے۔ گھبراؤ نہیں یہ چیزوں کی تکلیف لڑائی تک ہے۔ اس کے بعد پھر خوش حالی ہوگی۔ انسان کو مصائب اور تکلیفات کے ایام میں صبر کو شیوہ بنانا چاہیئے کیونکہ صبر اگر نیت کر کے کیا جاوے تو بڑا اجر دلاتا ہے۔ ورنہ بے نیت تو ہر شخص کو اسی طرح دل مسوسنا پڑتا ہے جس طرح صابر کو۔ لہٰذا تم تکلیف کی حالت میں صبر کی نیت کیا کرو۔

ہم کو بڑا آدمی بننا چاہیئے اب بت شکنی کا زمانہ نہیں ہے۔ طبیعتوں کا میلان لیڈر شکنی کی جانب رجوع ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ خلقت جن کو لیڈر سمجھتی ہے اور ان کے زور کو توڑنا چاہتی ہے۔ وہ بھی غلطی پر ہے۔ اور جو لوگ چند حاکموں سے میل جول اور ایک خطاب کو لیڈر شپ سمجھتے ہیں وہ بھی غلط راستہ پر ہیں۔ کیونکہ لیڈری اور بڑائی ایک دوسری چیز ہے جس کے ماتحت دلوں کی کنجیاں ہوتی ہیں۔

تم خیال نہ کرو کہ اخباروں میں دو چار مضمون لکھنے والے اور حکومت پر نکتہ چینی کرنے والے لیڈر اور بڑے آدمی ہیں۔ نہیں یہ بھی دھوکا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بھی اپنی ذاتی اغراض کی خاطر بے اصول راستہ پر چلتے ہیں۔

ہم کو بڑا آدمی بننے کی ضرورت ہے۔ مگر اس کی تکمیل کے لئے محنت، جفاکشی، ایثار درکار ہے۔ اپنا وجود کھو کر بڑائی حاصل ہوتی ہے۔ فطرت ہر انسان کی اُس کی خواہشوں میں مددگار ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ رات دن جوانی کے مزے لُوٹو اور خرافات میں مبتلا رہو۔ تو فطرت تم کو طاقت اور دولت دینے کو تیار پائی جائے گی۔ اگر تم کو منظور ہو کہ دوسروں کی خوشامد کر کے عارضی بڑائی حاصل کرو

تو فطرت تمہاری دماغی قوتوں کے بہترین طریقے تعلیم کرے گی۔ اور اگر تم یہ چاہو کہ حاکم و محکوم کو فائدہ پہونچا کر بڑائی حاصل کرو تو اس کے راستے بھی تم کو فطرت ہی کے ذریعے مل جائیں گے۔ پھر تم بہت ہی بد نصیب ہو گے۔ اگر اپنی فطرتی طاقت سے نیک کام نہ لو۔

اگر دوسروں کی بھلائی کے لئے تم مشہور ہونے کی خواہش رکھتے ہو تو قدرت تم کو قرآن کی زبان میں آواز دے گی ورفعنا لک ذکرک۔ اگر تم کو دوسروں کا بوجھ ہلکا کرنا منظور ہو تو ووضعنا عنک وزرک کا نعرہ سنو گے۔ تم چھوٹوں کا حل بڑھاؤ۔ خدا تم کو بڑا آدمی بنا دے گا۔ تم لیڈر بننے کی خواہش کرو اور مخلوق خدا کے کام آؤ۔ قدرت تمہاری مدد کرے گی۔ اور تم بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ نمائش ضروری چیز ہے۔ مگر اس کو ذریعہ بناؤ۔ اصل مقصود نہ سمجھو۔ کیونکہ نمائش تمہاری بڑائی کا آلہ ہے۔

خلافت اور اخوت

اسلامی دنیا کے یہ دو مسئلے آج کل شد و مد سے اہل تدبر کے زیر بحث ہیں۔ اخوت بھائی چارہ ایک رشتۂ روحانی ہے جو بطور نعمت الٰہی کے مسلمانوں کو عطا ہوا۔ قرآن شریف کے چوتھے پارے میں اس نعمت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

اذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین
قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا

خدا کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر مبذول ہوئی جب کہ تم آپس میں دشمن بنے ہوئے تھے تو تمہارے دلوں میں باہمی الفت ڈالدی اس کے بعد تم اس نعمت خدا کے طفیل میں ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔

قومیت رنگت وکثرت وغیرہ کئی جذبے ایسے ہیں جو افراد انسانی کو باہمی

اتحاد کے لئے کھینچتے ہیں۔ مگر اس کشش میں وہ دوام و استحکام نہیں پایا جاتا جو جذبۂ مذہب میں نظر آتا ہے۔ خواہ کوئی مذہب ہو اس کے پیرو اپنے عقائد سے ایک رشتۂ قلبی رکھتے ہیں۔

لیکن اسلام میں بمقابلہ دیگر مذاہب کے ایک نمایاں خصوصیت باہمی ارتباط کی پائی جاتی ہے۔ اس خصوصیت کو اگر مادی اسباب کے معیار سے معلوم کرنا چاہیں تو میں نہیں کہہ سکتا کیا کیا وجوہات ذہن رسا بتائے۔ مگر بادی النظر میں اس کا جواب آسان نہیں ہے۔ ہم اس زمانہ میں بے شمار مثالیں عیسائی اخوت کی دیکھ چکے ہیں۔ خود اپنے ملک میں ہندوؤں اور آریہ سماجیوں کی باہمی الفت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ اگرچہ عیسائیوں کی اخوت زیادہ تر سیاسی تحریکوں سے متاثر ہو کر عمل میں آتی تھی۔ اور ترکی حکومت کی مسیحی رعایا میں ہم اس کی مثالیں دیکھتے تھے۔ کیونکہ بیرونی عیسائی حکمران اپنے ملکی مفاد کی بنا پر ان ترکی محکوموں کو بھڑکاتے تھے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عیسائیوں میں اخوت کا جذبہ ناپید نہیں ہے۔ وہ نہ ہوتا تو بیرونی تحریکیں کارگر کیسے ہوتیں۔

اسلامی اخوت باہر کی تحریکوں اور لیڈروں کی رہنمائیوں سے آزاد ہے۔ ایک گاؤں میں جاؤ جہاں کے باشندے جاہل محض اور تمام احساسات و علم سیاست سے نابلد ہوں۔ پھر ان سے کہو فلاں ملک میں مسلمان پر ظلم ہوا ہے۔ تو وہ ایسے بے قرار ہو جائیں گے۔ گویا خود ان پر کوئی مصیبت آن پڑی ہے۔ ایسے ہی خوشی کی خبر سنکر ان کا مسرور ہونا لازمی ہے۔

یہ کیا طاقت ہے؟ اس کے جواب کے لئے ہم جو مادی دلائل غور و خوض سے پیدا کرتے ہیں۔ وہ سب کی سب دست مادیت سے چھٹی جاتی ہیں۔ اور مجبور کرتی ہیں کہ ہم ہر پھر کر اس آیت کی طرف رجوع کریں۔ اور کہیں کہ سارا

طفیل عنایت رب کا ہے۔ اس کو منظور ہے کہ مسلمانوں میں اخوت کا جذبہ تمام قوموں سے ممتاز رہے۔

اخوت کی مادی دلیلیں چند مذہبی مراسم ہیں جن میں حج اور نماز کو زیادہ خصوصیت ہے۔ مگر لاکھوں مسلمان نماز نہیں پڑھتے۔ کروڑوں آج تک حج کو نہیں گئے۔ لیکن ان میں جذبۂ اخوت کی کمی نہیں ہے۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ رشتہ کسی مخفی طاقت کے ہاتھ میں ہے۔ جیسا کہ خود اُس طاقت نے اس آیت میں دعویٰ کیا ہے۔

جہاں مسلمانوں میں یہ زبردست طاقت اخوت کی ہے۔ وہیں ان میں اختلاف بھی بکثرت ہے۔ اور جو حسب روایات احادیث صحیحہ قیامت تک رہیگا اس اختلاف نے مسلمانوں کو ہمیشہ نقصان پہنچایا۔ ان کی بادشاہتیں خاک میں مل گئیں۔ وہ ذلیل و محکوم بن گئے۔ لیکن ان حالات سے اخوت کی طاقت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ وہ جوں کی توں موجود ہے۔ یہ اختلافات بظاہر ہم کو دھوکے میں ڈالتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہم میں سے اخوت سلب ہو گئی ہے۔ مگر یہ سب ایک دوسری لائن کی باتیں ہیں۔ اور اخوت اور چیز ہے۔ اخوت بنیاد اور جڑ ہے۔ اور موجودہ اختلاف شاخوں اور سطح پر ہے۔ جڑ سے اسے کچھ سروکار نہیں۔

غازی پور کی تازہ تقریر میں سر جیمس مسٹن لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ نے اخوت اسلامی کا تحیر و تعجب سے اعتراف کیا ہے کہ باوجود پیہم صدمات کے اب تک اپنی اصلی حالت پر برقرار ہے۔

کچھ تعجب کی بات نہیں۔ اسلامی اخوت کی ثابت قدمی ظاہری اعتبارات سے بالکل قرین عقل ہے۔ مسلمان نسل اور ملک کے ماتحت نہیں ہیں۔ ان کا اتحادی مرکز

کلمۂ وحدت

ہے۔ جو تمدنی۔ ملکی۔ سیاسی انقلابات سے قدرتاً متاثر نہیں ہوتا۔ لاٹ صاحب نے فرمایا ہے کہ کوئی دوسری قوم اگر ایسی اخوت قائم کرنی چاہے تو نہیں کر سکتی۔ مگر میں کہتا ہوں فطرت الٰہی نے اپنا احسان مسلمانوں کے لئے ریزرو نہیں کیا ہے۔ جو قوم کلمۂ توحید کا اقرار کرکے دل و جان سے اس پر یقین کرے اُس کی قومیت۔ اخوت کی طاقت سے اس طرح مالامال ہو جائے گی۔ جس طرح مسلمان دیکھے جاتے ہیں۔

حاصل مقصد

مسئلہ اخوت کی تحقیق کا یہ ہے کہ برٹش حکومت اس طاقت کو نظر انداز نہ کرے اور سمجھے کہ جرمن اسلامی اخوت سے کام لے رہے ہیں۔ اور ہماری سرکار ابھی تک صرف علمی پہلو سے اس پر بحث کر لینا کافی سمجھتی ہے۔ حالانکہ وقت عمل کا ہے۔ میں یہ سوال سنجیدگی سے کرتا ہوں کہ جرمنوں نے فرضی طریق سے بھی قبول اسلام کا دعویٰ کرکے جو اثر اخوت کی لہر میں حاصل کر لیا ہے اس کا جواب ہماری گورنمنٹ نے کیا دیا؟ یا تو اس کی باضابطہ موثر طریقہ سے تردید ہو یا اور کوئی صورت نکالی جائے۔ ورنہ ان چرچوں کا اسلامی اخوت پر جو اثر پڑ رہا ہے۔ وہ معمولی نظر سے دیکھنے کے قابل نہیں ہے۔

خانۂ رسولؐ کے راز و نیاز

محبت کے راز و نیاز کی معاملہ بندیاں شاعروں نے بہت سی لکھیں۔ زمین آسمان کے قلابے ملائے۔ مگر خانہ داری کی الفتوں کا ان کو کیا مزا۔ جو درختوں اور جانوروں کی مثالوں میں جذبات عشق تلاش کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے سرو نے

قمری کے دل کو جلایا۔ لہٰذا پھل سے محروم رہا۔ کوئی بولا گل نے بلبل کو ستایا۔ اس لئے پژمردہ ہو کر کملایا۔ کسی نے شمع و پروانہ کے سوز و گداز پر آنسو بہائے آؤ اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خانگی راز و نیاز کو سنیں۔ اور اپنے گھروں میں اس محبت کا رواج دیں۔ ذیل کا قصہ صحیح حدیث سے نقل کر کے لکھا جاتا ہے۔

رسولِ خداؐ (حضرت عائشہؓ سے مخاطب ہو کر) ہم جان لیتے ہیں کہ آج تم ہم سے خوش ہو یا ناراض۔

حضرت عائشہؓ کیونکر؟ میں قربان ہو جاؤں ذرا بتایئے تو۔

رسولِ خداؐ جب تم ہم سے خوش ہوتی ہو تو یوں قسم کھاتی ہو "محمدؐ کے خدا کی قسم" اور جب ناخوش ہوتی ہو تو کہتی ہو۔ ابراہیمؑ کے خدا کی قسم۔

حضرت عائشہؓ (متبسم ہو کر) ہاں یا رسول اللہ! خفگی میں آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں۔ نہ کہ آپ کو۔

اس راز و نیاز میں جو پاکبازانہ لطف ہے۔ وہ اہل محبت سے مخفی نہیں۔ کون سا گھر ہے جہاں رنجشیں پیدا نہیں ہوتیں۔ مگر رنج ہو تو بس اتنا کہ فریقین اپنے جذبات اشاروں کنایوں میں ادا کر کے جی کی بھڑاس نکال لیں۔ نہ یہ کہ توڑ پھوڑ اور اکھاڑ پچھاڑ کر بیٹھیں۔

مقصودِ زندگی

ہر ایک کو ہے زمانے میں زندگی مقصود
کسے خبر ہے کہ مقصودِ زندگی کیا ہے (اکبرؔ)

نئی روشنی نے تو اس کا جواب یہ دیا کہ اچھا کھانا۔ اچھا پہننا اور عزت کے ساتھ بسر کر کے مر جانا ہر انسان کا مقصد زندگانی ہے۔

مگر کوئی پوچھے کہ یہ باتیں تو زندگی ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ان باتوں کا حاصل مقصد

کیا ہوا۔ کیا اتنی بڑی دنیا۔ یہ عظیم الشان کائنات یہ عقل کا پتلا آدم زاد اس لئے پیدا ہوا کہ دو نوالے کھائے۔ دو کپڑے پہنے۔ چار سلام لے۔ اور آنکھ بند کر کے موت کے حوالے ہو جائے۔

مذہب کہتا ہے۔ عبادت رب مقصودِ زندگی ہے۔ مگر فطرت کہتی ہے۔ زندگی خود اپنا مقصود ہے۔ زندگی کی شناخت کے لئے زندگی ملی ہے۔ یہ مجہول کی مجہول تعریف نہیں ہے۔ غور کرو ہر ذرہ کی حیات اپنے وجود کے عرفان کے لئے ہے۔

اور انسان جو تمام موجودات کا خلاصہ ہے اپنی اور تمام کائنات کی زندگانی کو پہچاننے اور اس سے خالق کا عرفان حاصل کرنے کو پیدا ہوا ہے۔ جب شناخت ہوتی ہے۔ خود سروں کا سر جھک کر سجدہ میں گر پڑتا ہے۔ اور کہنا پڑتا ہے کہ۔

ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا

پھر عبادت و طاعت بھی شروع ہوتی ہے جو بیان مذہب کی رو سے مقصود زندگانی ہے۔ اور کھانے پینے رہنے سہنے کا بھی اصلی لطف آتا ہے۔ جو نئی روشنی کے عقیدے میں مطلوب حیات ہے۔ واہ عرفان تیری کیا بات ہے۔ میری پہچان میں تجھ پر قربان۔ تو آجائے تو جینے کا مزا مل جائے۔

خاک کا ٹھکانا

جب جان خاک میں ملی تو سب نے شادیانے بجائے ترانے گائے اور ہر ایک نے (جیسے) نورِ چشم لختِ جگر کہہ کر اس خاک آلود جان کو سینے سے لگایا۔ ماں نے گود میں اٹھایا۔ باپ نے آنکھوں پر بٹھایا۔ اور جب جان خاک سے آزاد ہوئی مٹی کی آلودگاری سے نجات ملی تو آہ و بکا کے نالے بلند ہوئے۔ کسی نے کہا کہ ہائے میرا لال۔ کوئی بولا ارے میرے سر کا تاج۔ عورت۔ مرد بچے بوڑھے یکساں رونے پیٹنے میں مصروف ہوئے۔ کیا خدا کی شان ہے۔ یہ انسان بھی کس قدر نادان ہے۔ ہنسنے کے وقت روتا ہے۔ اور رونے کے موقع پر ہنستا ہے۔ کوئی اس کو بتائے۔ خاک اور جان کے رتبوں کا فرق سمجھائے۔ جان جسم خاک میں اپنی خوشی سے نہیں آئی تھی

حکم حاکم سے مجبور تھی۔ حاکم کو خاک کا رتبہ بڑھانا تھا۔ ورنہ جان کا خاک نہیں کوئی اور ٹھکانا تھا۔

خاک نے درجہ پایا۔ کچھ دن امر اللہ کے سانسوں کو پیار کے سینے سے لگایا۔ آخر وقت مقرر نے اپنی جان کو رہائی دی۔ اور خاک کو اس کے ٹھکانے پر بھیجدیا۔

خاک کا ٹھکانا خاک ہے۔ جان کا ٹھکانا شہ لولاک ہے۔ خاک اپنے ٹھکانے میں پہنچکر غمناک بن جاتی ہے۔ اور جان کا جو حال ہوتا ہے اس کا اظہار الفاظ ومعانی کی حد سے باہر ہے۔ پھر کون بتائے۔ سوائے اس کے کہ جناب اکبر کا گیت گائے۔ اور یہ شعر پڑھے ؎

جان جب خاک میں ملتی ہے تو ہوتی ہے خوشی
خاک جب خاک میں ملتی ہے تو سب روتے ہیں

پانچویں منزل

سیاست معاشرت تمدن

تاج اور کلاہِ درویشی

دربار کی یادگار

(از صوفی جنوری ۱۹۱۱ء)

دہلی میں دربار ہے۔ شہنشاہ ہندوستان وانگلستان یہاں آئیں گے جنگل میں منگل ہوگا۔ ادنیٰ اعلیٰ چھوٹا بڑا۔ ہندو مسلمان۔ عیسائی۔ موسائی۔ خوش ہوگا۔ اور خوشی کا اظہار کرے گا۔

آؤ ہم بھی شاہ جارج کو مبارکباد دیں۔ مگر ساری دنیا انگریزی قوم اور انگریزی بادشاہ کو مبارکباد دیتی ہے۔ ہم صوفیوں کی طرف سے اُس چیز کو مبارکباد دیں۔ جو سب خوشیوں کا مرکز ہے۔ بیشمار امیروں کا ملجاو ماوا ہے۔ یعنی

تاج

دراصل تاج ہی وہ چیز ہے جس پر بادشاہی شہنشاہی کی مہر لگی ہوئی ہے بغیر تاج کے سب انسان برابر ہیں۔ وہی دو آنکھیں وہی ایک زبان۔ دل بھی ایک

قد بھی بہت اونچا نہیں۔ سانس بھی وہی۔ پیاس بجھانے کو پانی بھی۔ اور پیٹ بھرنے کو روٹی بھی یکساں۔ حضرت تاج سر پر آجاتے ہیں تو یہ انسانی دو گز کی مورت بادشاہ کہلانے لگتی ہے۔ دیکھنا اس تاج کے اجزا پر غور کرنا۔ یہ کس چیز کا بنا ہوا ہے۔ کیونکہ اسمیں یہ عظمت یہ طاقت۔ یہ تاثیر آگئی کہ جہاں یہ سر پر پہنچا کروڑوں سر اسکے سامنے جھکنے لگے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکو انسانوں نے بنایا ہے۔ اور اسمیں وہی اجزاء ہیں جو ہر کس و ناکس کے استعمال میں آتے ہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ جب وہ اجزا تاج کی شکل اختیار کر لیں۔ تو انسان کو بادشاہ بنا دیں۔ اور گدا کی گدڑی میں رہ جائیں تو حقارت و ذلت کا ہدف بنیں۔ ہو نہ ہو اس کی حقیقت میں اس کے معانی میں کوئی بھید ہے۔ ان سے کہو جو صوفی کہلاتے ہیں۔ جن کی دینی و دنیاوی زندگی حقیقت شناسی ہے۔ تاج کی حقیقت پر غور کریں کہ وہ اس شکل میں آ کر ایسا اثر دار کیوں ہو جاتا ہے۔

اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ و تعز من تشاء و تذل من تشاء والا معاملہ ہے۔ ایسے بادشاہ بھی گزرے ہیں۔ جن کے تاج کی کچھ عزت نہ تھی۔ تلوار کے زور سے ملک لیا۔ اور کچھ دن کے بعد فنا ہو گئے۔ اور ایسے شہنشاہوں کا ذکر بھی تاریخوں میں مذکور ہے۔ جن کو مرنے کے بعد کفن بھی میسر نہ آیا۔

شاہ جارج کی تاجپوشی لندن میں ہو چکی۔ ہندوستان بھی ان کی حکومت کا ایک حصہ ہے۔ اس کے لئے دہلی میں خود تشریف لا کر اپنی تاج پوشی کا اعلان کریں گے۔ اعلان کرتے وقت ان کا دل خوش ہوگا۔ ان کی خوشی سے رعیت بھی شاد کام ہوگی۔ رعیت کے سب طبقے علیحدہ علیحدہ مبارکباد دیں گے۔ درویشوں اور صوفیوں کی طرف سے کلاہ درویشی۔ صدائے قلندرانہ میں تہنیت گزار ہے۔

جارج بابا کی خیر۔ کر بھلا۔ ہو بھلا۔ سانس کی قدر کر۔ آس والوں کی آس پر لا۔ گھوڑے والے۔ جوڑے والے۔ توپوں والے۔ ٹوپوں والے۔ شاد رہ۔ آباد رہ۔

تیرے جہازوں کی خیر۔ اور اس آزادی کا بول بالا۔ جو جہاز کے جھنڈوں میں لہرا رہی ہے۔ فقیروں کی طرف بھی دیکھ۔ یہ وہ ہیں جو مغرور اور متکبر۔ خود سر جفاکار بادشاہوں کو کھری کھری سنا دیا کرتے تھے۔ تو تو نیک دل اور نرم مزاج ہے۔ تیری حکومت میں ہر بات سننے کی صلاحیت ہے۔ دیکھ یہ دنیا ایک تماشا گاہ ہے۔ دو گھڑی کی ٹٹی ہے۔ اس کی شان و شوکت میں جی نہ لگانا۔ اور اس کی طرف متوجہ ہو۔ جس نے تجھ کو یہ شان و شوکت عطا فرمائی ہے۔

اس ہندوستان میں ان ہندو مہاراجاؤں کی اولاد جو ایک زمانے میں اس ملک کے تاجور تھے۔ کس مپرسی کے عالم میں گرفتار ہے۔ تغلق اور خلجی خاندان کے شہزادے اور شہزادیاں دہلی کے گرتے ہوئے اور تغلق آباد کے عالی شان قلعے کی کوٹھریوں میں اپنی گزشتہ عظمت کو یاد کر رہے ہیں۔

تیموری جاہ و جلال کی افسردہ نشانیاں شہزادے اور شہزادیاں دہلی کے محلوں میں فاقہ کشی کر رہی ہیں۔ کیوں اس واسطے کہ انہوں نے دنیاوی عیش و عشرت میں اپنے انجام کار کو بھلا دیا۔ گردش دوراں کو یاد نہ رکھا۔ تو نہ بھول تیری یاد ہمیشہ قایم رہے گی۔ غرور سے اکڑ کر نہ چل۔ تیرے تاج کو دائمی قرار نصیب ہوگا۔

خدا خوش نصیب "ملکہ میری" کے سہاگ کو چار چاند لگائے۔ اور وہ دیکھیں کہ غریبوں کی دعاؤں کے کپڑے کارچوبی چمکدار کپڑوں سے لاکھ درجہ اچھے ہیں انھیں کو ہمیشہ استعمال کریں۔

یہ درویشی کلاہ بھی اقلیم تصوف کی حکومت کا ایک تاج ہے۔ دلوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ ایمان کا سکہ چلاتا ہے۔ خدائی توپوں اور فوجوں کو رکاب میں رکھتا ہے۔ اے بادشاہ! اس کی دوستانہ مبارکباد قبول کر۔ اور سر بلند ہو۔

ٹھکانا ایک بستر کا

(از اخبار زمیندار فروری ۱۹۱۲ء)

انگریزی سرکار! تجھ کو قرار۔ تیرے نرم گرم بستر کو قرار شاد رہ آباد رہ۔ مسلمان فقیر ہیں بے نوا ہیں۔ مگر تیرے اس بستر کو نظر لگانے والے فقیر نہیں ہیں۔ جو شرق و مغرب میں بچھا ہوا ہے۔ ان کو صرف ذرا سی جگہ تیرے دل میں درکار ہے۔ جس میں مسلم کی ہستی مختصر کے لئے ٹھکانا ایک بستر کا ہو جائے۔

اے ہند و سندھ میں پاؤں پھیلانے والی گورنمنٹ! نیند ہماری آنکھوں میں بھی آتی ہے۔ ہم کو بھی گوشۂ عافیت دے۔ زیادہ نہیں فقط

ٹھکانا ایک بستر کا

کل کے دن ہم تاج والے تخت و بخت کے مالک تھے۔ آج کے دن ہم تیرے راج کے سائے تخت کو تخت بنائے بخت و اقبال لٹائے بے یار و مددگار کھڑے ہیں۔ ملک نہیں مانگتے تاج و تخت طلب نہیں کرتے۔ ہمیں تو محض درکار ہے۔

ٹھکانا ایک بستر کا

دہلی بسانا مبارک۔ لیکن ہمارے نشین کو نہ اُجاڑ۔ ہمارے ٹوٹے بوریئے کو حجرے نہ پھینک۔ دیکھ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ بس یہی باقی ہے

ٹھکانا ایک بستر کا

سننے میں تجویز شدہ نئی دہلی کی تعمیر میں وہ سب رقبہ آگیا ہے۔ جسمیں ہم اجڑنے والوں کی مسجدیں ہیں۔ خانقاہیں ہیں۔ مزارات ہیں۔ اور تاریخی چیزیں ہیں۔ جن کو زمین سے اُبھرا ہوا دیکھکر سانس آتا جاتا ہے۔ یہ مٹ جائیں گی تو ہمارا وہ سب کچھ مٹ جائیگا جس کو ہم کہا کرتے ہیں کہ ابھی باقی ہے۔

ٹھکانا ایک بستر کا

حلقۂ مشائخ نے پنجاب گورنمنٹ کو درخواست بھیجی ہے کہ ان مقدس مقامات کی حفاظت کا خاص طور سے خیال رکھا جائے۔ اور حلقہ مجوزہ رقبہ کے اندر آئی ہوئی تمام مسجدوں خانقاہوں۔ مزارات و تاریخی مقامات کی فہرست بنا رہا ہے اس پر جبکہ وہ پیش ہو نظر توجہ کی جائے تاکہ ہم سب گداگران دلفگار جارج سلطان کے ارمان کو خوشی و خرمی سے پورا ہوتے دیکھیں۔ اور کہیں مل گیا ہمارا۔

ٹھکانا ایک بستر کا

عقل دور اندیش رکھنے والے انگریزو۔ ہمیں تم پر بھروسہ ہے اعتماد ہے۔ کہ تم یقیناً ہماری اس شکستہ آواز پر کان دھروگے اور احتیاط کے ساتھ ان نشانیوں کو قایم رکھوگے۔ جہاں ہمارا

ٹھکانا ایک بستر کا

مسلم پریس کو اگر اس سوختہ طلبگاری میں بوئے ادب و وفا شعاری محسوس ہو اور کوئی مصلحت مانع نہ ہو تو اس سے بھی درخواست ہے کہ اس صدا میں سر ملائے اور کہے۔ ہاں۔ باقی رہے"

ٹھکانا ایک بستر کا

چمارزادہ سیّد کی گود میں

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

نیچ زاد چھوکرے۔ آ میری گود میں آجا۔ تو شودر ہے۔ کمین ہے۔ پلید ہے۔ گندہ ہے مگر میرے واحد خدا کا بندہ ہے۔ مجھ جیسا آدمی ہے۔ ناک۔ کان۔ ہاتھ۔ پاؤں۔ آنکھ۔ زبان۔ دل و دماغ رکھتا ہے۔ تجھکو کس نے اچھوت اور ناپاک بنا دیا۔ نہیں تو پاک۔ پوتر ہے۔ عزت دار بلند مرتبہ ہے۔ کون ہے جو تجھکو خدا کی درگاہ میں جھکنے سے روکتا ہے۔ مندر۔ مسجد اور گرجا میں جانے سے منع کرتا ہے۔ کیا ہندو مجھکو اس لئے مندر شوالے میں نہیں آنے دیتے۔ کہ تو نے نیچ ذات کے گھر میں جنم پایا ہے۔ کیا عیسائی گورا اس واسطے اپنے بڑے درجہ کے گرجا میں تیرے گھسنے کو روادار نہیں کہ تو نا شائستہ جاہل اور کالا دیسی ہے۔ کیا مسلمان تیرے میلے میلے ہاتھ پاؤں دیکھکر گھن کھاتا ہے مسجد میں نہیں آنے دیتا۔

تو آ۔ سید فقیر۔ عربی رسولؐ کا فرزند۔ تیرے ہاتھ پاؤں دھوئے گا۔ اور اپنے باپ کی بنائی ہوئی مسجد توحید میں ساتھ لے چلے گا۔

بابا اپنی قدر پہچان۔ میں تجھ پر قربان تو انسان ہے۔ سربلند شان ہے۔ خلیفۃ المسلمین محمدؐ مس کا لخت جگر۔ خاتون الہند۔ جارج خامس کا نور نظر۔ اور تو اے غریب چمار کے پسر۔ خدا کی درگاہ میں سب برابر ہو۔ آؤ عرب دیس کے مہاراجہ اونچی ذات اور نیچی ذات کو برابری کی نگاہ سے دیکھنے والے پتی کی سیوا اور مہا کریں۔ جس نے پریم پرچار میں امیر۔ غریب۔ ادنٰی۔ اعلیٰ۔ چھوٹے۔ بڑے۔ پڑھے۔ ان پڑھ کر کچھ تمیز اور فرق نہیں رکھی۔ اور اپدیش دیا۔ ذات پات نہ پوچھے کوئے۔ ہر کو بھجے سو ہر کو ہوئے۔

تو آ۔ ہر کے نام کی بانسری بجائیں۔ ہر کو ڈھونڈیں۔ ہر کو پائیں۔

جیبی گھڑی کی سازش

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

غلطی یہ ہوئی کہ گھڑی کو بائیں طرف کی جیب میں۔ رکھا۔ وہاں اس شریر چھوٹی کھوٹی فتنی نے میرے دل کو بہکا لیا۔ صحبت کا اثر مشہور ہے۔ دل آخر گوشت کا لوتھڑا تھا۔ گھڑی کے چلتے پرزوں سے کیونکر بچ سکتا۔

گھڑی نے جب وہ جیب کے ہوٹل میں اُتری۔ پاس دھڑکنے والی آواز سنی اس کو معلوم ہوا کہ یہاں قریب میں کوئی بے قرار چیز ٹھہری ہوئی ہے۔ اس لئے اس نے کہا تم کون ہو۔ کیا تم بغیر انٹرڈیوس اور تعارف کے بات کر سکتے ہو۔

دل اس وقت ذکر خدا کر رہا تھا۔ مرشد کا بتایا ہوا پاس انفاس اُس کے پاس تھا۔ اس کو کسی غیر سے مخاطب ہونے کی اجازت نہ تھی۔ نہ یاد الٰہی کے سرور و لطف میں وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہونا پسند کرتا تھا۔

مگر نئے مہمان کی خاطر سے اس نے اتنا کہا۔ میں دل ہوں۔ سینے کے حجرے میں مدت سے رہتا ہوں۔ آپ کب تشریف لائے۔ میرے قابل کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔

کیونکہ مجھ کو میرے رسولؐ نے حکم دیا ہے کہ اپنے پڑوسی کے کام آنا چاہیے۔ اپنے مہمان کی خاطرداری کرنی چاہیئے۔ ولایتی گھڑی نے اس گوشہ نشین اللہ والے کی نرم اور مہربان آواز سنکر ناز و لربایانہ سے کہا۔

تھینکیو مائی ڈیر ہارٹ! شکریہ میرے پیارے دل کیا آپ میرے پاس آسکتے

ہیں ؟ میں آپ کی شرکت سے اپنی بزم کا فخر بڑھانا چاہتی ہوں ۔ آپ کا دم سینے کی اندھیری کوٹھری میں گھبرا گیا ہوگا ۔ باہر نکلئے ۔ میرے فردار سائی کو دیکھئے اور میرے یاقوت کے زیور ملاحظہ فرمائیے ۔ جن کو میں نے پہن رکھا ہے ۔

زاہد خشک مزاج دل نے آہ سرد بھری ۔ لیکن ایٹی کیٹ دآداب فیشن کے خلاف پربزاد گھڑی کے پُرارمان پیام کا جواب نہ دیا ۔

فیشن ایبل گھڑی گھڑی نے اس خاموشی کو اپنی انسلٹ (توہین) سمجھا ۔ اور تیوری پر بل ڈال کر اندر ہی اندر جز بز ہو کر رہ گئی ۔

اب اس نے انتقام لینا چاہا ۔ وہ خلوت نشین عابد کا تقویٰ توڑنے کے لئے تیار ہو گئی اور سوچنے لگی ۔ کیونکہ میں اس نیم وحشی مگر خوبصورت چیز کو اپنے قابو میں لا سکتی ہوں ۔ اتنے میں بارہ بجے کی توپ چلی ۔ گھڑی والے نے اس کو جیب سے نکالا ۔ اور دست شوقین کی انگلیوں سے چٹکی بجاتے کوک بھر دی ۔ یہ کوک گھڑی کی غذا تھی جس نے اس کے دماغ میں کلام کرنے اور دل کے خلاف غصہ نکالنے کیلئے ایک طاقت و پھرتی پیدا کر دی پہلے گھڑی نے اپنا کھٹکا دل کے کھٹکے سے ملا دیا ۔ اور اس طرح گویا اس نے دلکو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا ۔ دل نے جب گھڑی کی صدائے وحدت سنی تو بہت خوش ہوا اور اپنی مشغولی حق سے یکسو ہو کر گھڑی سے یوں خطاب کیا ۔ تمہارا کھٹکا بہت مضطرب جلد باز انہ ہے ۔ ذرا آہستہ آہستہ سانس روک کر ذکر کرو ۔ ورنہ عمر جلدی تمام ہو جائیگی میرے مرشد نے حبس دم کی اس واسطے تلقین فرمائی ہے کہ سانس کی اضطراب کو قرار رہے ۔ اور سکون وطمانیت سے سب کام پورے ہوں ۔

سگھڑ گھڑی بولی ۔ میں بے تہذیب دیسی سے ہمکلام ہونا نہیں چاہتی ۔ تو ولایت کے آداب سے واقف نہیں ہے ۔ تو نے اچھی سوسائٹی کے اعلیٰ رکن عورت ذات کی توہین کی ہے کیوں اُس کی منہ مانگی مراد کو پورا نہ کیا ۔

دل نے جواب دیا میں نامحرم کے پہلو میں ایسے وقت جبکہ تیرا وہاں کوئی نہ تھا کیونکر آسکتا تھا ۔ یہ میرے مذہب کے خلاف تھا ۔ کیونکہ وہ غیر عورت کے پاس خلیہ میں بیٹھنا کجا صورت دیکھنے کی بھی اجازت نہیں دیتا ۔

کواری گھڑی نے دل کی بات سن کر ایک بجلی بھرا تبسم کیا اور کہا معاف کیجئے میں آپ کے مذہب کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتی ۔ کیونکہ یہ تہذیب و شائستگی نیز قانون حکومت کے خلاف ہے ۔ کہ کسی کے مذہبی عقیدے میں دخل دیا جائے ۔ مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ زندگی کے مزے سے محروم ہو گئے ہیں ۔ آپ نہیں جانتے کہ عورت اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ وہ مجلسوں اور محفلوں کی کیفیت اور زیب و زینت کو بڑھائے اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کی عصمت ایک شخص کی جائز ملکیت ہونی چاہئیے ۔ مگر یہ بالکل ظلم ہے کہ وہ اجنبی مردوں کو اپنے ہنس مکھ چہرے اور اپنی میٹھی باتوں سے محروم کردے ۔ ہماری ولایت کا دستور بہت اچھا کہ غیر شخص دوسرے کی بیوی سے خلیہ کی ملاقات کر سکتا ہے ۔ ہوا خوری کو ساتھ لیجا سکتا ہے ۔ اور اُس کے خاوند کے سامنے بیوی کے حُسن و جمال کی تعریف کر سکتا ہے ۔ تم دیسی لوگ بڑے وحشی ہو ۔ اگر کسی کے سامنے اسکی بیوی کی تعریف کردیجائے تو وہ یقیناً چھُری مارنے پر آمادہ ہو جائیگا

دل گھڑی کی جادو بھری تقریر سے موم ہو گیا ۔ اُس نے اپنا مقدس ہاتھ ڈرتے ڈرتے اُٹھایا ۔ اور گھڑی کے ہاتھ کو پکڑ کر چومنا چاہا ۔ مگر یکایک اُسکو خدا کے ڈر نے اس گناہ سے روکا اور اس نے کانپ کر ہاتھ چھوڑ دیا ۔ دل کی اس حرکت سے گھڑی کھل کھلا کر ہنسی اور بلیک فول بلیک فول (بے وقوف کالا بیوقوف) کہہ کر عشق کے کوچے ناآشنا غریب دل کو پریشان کر دیا ۔

آخر دل سے نہ رہا گیا ۔ اور اس نے کہا تم میں ایسی کیا خوبی ہے جو سو روپیہ خرچ کر کے تم کو خریدا گیا ۔ تم جن چیزوں کو ہیرے یاقوت کے زیور کہتی ہو وہ معمولی پتھر کے ریزے

ہیں۔ تمہارے اندر چند پیتل کے پرزوں کے سوا رکھا کیا ہے۔ ہندوستانی درحقیقت کاٹھ کے بے وقوف ہیں۔ جن کو وقت کی پابندی کا تو کچھ خیال نہیں۔ مگر یورپ کی تقلید میں پیتل کے چند ٹکڑوں کو چاندی کے سکے دے کر خرید لیتے ہیں۔ ہندوستان میں صرف یہ بیکار پیتل کے ٹکڑے رہ جاتے ہیں۔ اور ولایت میں چاندی پہنچ جاتی ہے۔

میرا بس ہو تو سارے ہندوستان میں ڈھنڈورہ پیٹ دوں کہ گھڑی وہی رکھے جو وقت کی قدر جانتا ہو۔ ظاہری نمائش کے لئے کوئی اپنی دولت غیر ملکوں میں نہ بھیجے۔ بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ جب تک اپنے ملک میں گھڑی کے کارخانے قائم نہ ہولیں اور یہاں گھڑیاں نہ بننے لگیں کوئی ہندوستانی گھڑی نہ خریدے۔

دل کی اس باغیانہ تقریر سے گھڑی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنے خانساماں کو بلایا اور اس درویش صفت مگر سرکش وجود کو دھکے دے کر نکلوا دیا۔

جنابِ دل نکل تو آئے مگر اب ان پر گھڑی کے عشق کا جنون سوار ہے۔ گھڑی کی طلائی زنجیر کے خیال کو اپنے پاؤں کی بیڑی بنا رکھا ہے۔

میں کیونکر کہوں کہ گھڑی کی سازش نے میرے دل کو کہیں کا نہ رکھا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم ‌‌‌‌ ‌‌ نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا رہا

چھڑکاؤ کی گاڑی

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

گرد آباد سڑک پر دیکھا ہو گا۔ چھڑکاؤ کرنے والی گاڑی کیونکر تپتی ہوئی زمین کو سیراب کرتی ہے۔ راستہ چلنے والے مسافروں کو تکلیف دینے والی خاک کا منہ بند کرنے کے لئے اپنا سارا سرمایہ مٹی میں ملا دیتی ہے۔

تمہارے لئے اس میں عبرت و نصیحت ہے۔ اگر تم ذرا غور و فکر کی عادت ڈالو تو دنیا کی ہر چیز راستہ بتاتی ہے۔ مگر تم تو زندگی کی کشمکش میں آنکھ بند کرکے پڑا رہنا چاہتے ہو۔ کہیں اس طرح زندگی بسر ہوا کرتی ہے۔

ظاہر میں چھڑکاؤ کی گاڑی بڑی فضول خرچ معلوم ہوتی ہے۔ اپنا پانی بے تحاشا بہاتی ہے۔ چنانچہ ایک گنوار کا قصہ مشہور ہے کہ جب وہ کسی شہر میں گیا اور وہاں چھڑکاؤ کی گاڑی کو دیکھا تو کہنے لگا یہ گاڑی والا بھی بڑا بے وقوف ہے۔ پانی بہ رہا ہے۔ اور اس کو خبر نہیں۔ گھر پہنچتے پہنچتے تو ایک بوند بھی باقی نہ رہے گی۔

مگر تم گنوار کی طرح انجان اور ناسمجھ نہ بنو۔ چھڑکاؤ کی گاڑی پر فضول خرچی کا الزام نہ لگاؤ۔ بلکہ خود اپنی دولت دوسروں کی فائدہ رسانی میں خرچ کرنی سیکھو۔

اب تم اپنے عیش و آرام کے لئے۔ اپنے نام و نمود کے واسطے شادی میں غمی میں ہزاروں روپے خرچ کر ڈالتے ہو۔ مگر خدا اور اس کے بندوں کا کوئی کام درپیش ہوتا ہے تو ہاتھ سمیٹ لیتے ہو۔ فضول خرچی کا سہرہ چڑھ جاتا ہے۔

فضول خرچی بہت بری چیز ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے ولا تبذر تبذیرا ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین یعنی اسراف نہ کرو اسراف کرنیوالے شیطان کے بھائی ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا کلوا واشربوا ولا تسرفوا کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو۔

اگر چار آنے گز کے کپڑے میں تمہاری تن پوشی ہو سکتی ہے۔ اگر دو روپے کی دیسی جوتی تمہاری برہنہ پائی کو دور کر سکتی ہے۔ اگر ایک طرح کے دال سالن سے تمہاری روٹی چل سکتی ہے تو تین چار روپے گز کے کپڑے پہنکر اپنے جسم کی عادت نہ بگاڑو۔ دس روپے کا ولایتی بوٹ اور پانچ روپے کی کامدار جوتی نہ پہنو۔ دس دس طرح کے کھانے دسترخوان پر نہ لگاؤ۔ تم ایک غریب ملک کے باشندے ہو۔ تم ایک مفلس قوم کے فرد ہو۔ دوسرے بھائیوں کا بھی خیال رکھو کہ وہ کس حال میں ہیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کے حال میں لکھا ہے کہ سردی کے موسم میں جب ان کو گرم کپڑا پہنایا جاتا تو وہ آنکھوں میں آنسو لا کر فرماتے۔ پہلے مسجدوں اور بازاروں کے گوشوں میں غریبوں کو دیکھ آؤ۔ ان میں کوئی ننگا تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو پہلے اس کو دو۔ وہ حق دار ہے۔

چھڑکاؤ کی گاڑی تم کو یہی نصیحت کرتی ہے کہ اس کا سب کچھ دوسروں کے لئے ہے اپنے واسطے وہ ایک بوند بھی گھر لے کر نہیں جاتی۔

پسینہ

(از اخبار توحید میرٹھ ۱۹۱۳ء)

گرمی کے موسم میں تمہارا جی گھبراتا ہے۔ دھوپ میں باہر نکلو تو دماغ پکنے لگتا ہے۔ گھر میں بیٹھو تو پسینہ چلا آتا ہے۔ جس سے کپڑے تر ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں بساندی بو آنے لگتی ہے۔

جانتے بھی ہو۔ پسینہ کیا چیز ہے۔ یہ تمہارے بدن کی زکوٰۃ ہے۔ اللہ میاں گرمی کا موسم بھیج کر آدمی کے بدن کا وہ میل کچیل جو ساوات اور کھال کے نظر نہ آنے والے چھوٹے سوراخوں میں ہوتا ہے۔ پسینے کے پانی سے دھو دیتے ہیں۔ پسینہ ایک طرح کی بھاپ ہے۔ جو گرمی کے اثر سے بدن کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پسینہ بن کر بہہ جاتی ہے۔

پہاڑوں اور بعض ملکوں میں گرمی کا موسم نہیں آتا تو وہاں کے رہنے والے حمام میں جا کر بناوٹی گرمی سے پسینہ نکلواتے ہیں۔ کیونکہ پسینہ آدمی کی تندرستی کے لئے بہت ضروری چیز ہے۔

پسینہ اللہ میاں کی بڑی نعمت ہے۔ غریب لوگ گرمی کے موسم میں دن بھر جنگلوں اور بازاروں میں محنت اور مزدوری کرتے ہیں۔ اور ہر وقت پسینے میں شرابور

ہوتے رہتے ہیں۔ مگر جب شام کو اپنے گھر جاتے ہیں۔ تو ان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ محنت اور پسینہ سے ان کے بدن کی ساری بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ امیر لوگ خس کی ٹٹیاں لگاتے ہیں۔ پنکھے جھلواتے ہیں۔ اور ہر وقت ہائے گرمی ہائے گرمی پکارتے رہتے ہیں۔ جب شام ہوتی ہے۔ تو اُن کے چہرے پر اُداسی اور پریشانی چھائی ہوتی ہے۔ کیونکہ پسینہ نہ آنے اور بیکار پڑے رہنے سے ان کے بدن کا میل بدن کے اندر رہتا ہے۔ اس واسطے یہ بیچارے ہمیشہ حکیموں اور ڈاکٹروں کے دروازے پر پڑے رہتے ہیں۔ اور رات کو اس چین سے پاؤں پھیلا کر نہیں سو سکتے۔ جیسے ننگے کا آدمی غریب مزدور سوتا ہے۔

اور ہاں یہ بھی یاد رکھو کہ جس طرح موسم کی گرمی پسینے کے ذریعہ بدن کے میل کو دور کرتی ہے اُسی طرح انسان کی روح پر چھایا ہوا میل نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ سے دور ہو جاتا ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب پسینہ آتا ہے تو آدمی کا جی بہت گھبراتا ہے۔ ایسے ہی نماز کی محنت۔ روزے کی مشقت اور زکوٰۃ کے خرچ سے پہلے پہل تو انسان کو ذرا تکلیف ہوتی ہے۔ مگر جب روح کا میل صاف ہو جاتا ہے تو ایسی خوشی ہوتی ہے جس کی کوئی حد نہیں۔

لہٰذا اے اخبار توحید کے پڑھنے والو! آنے والے موسم گرما کو خدا کی نعمت سمجھو۔ جو غریبوں کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اور پسینہ کی قدر کرو۔ اور روح کا میل کچیل دور کرنے کے لئے نمازیں پڑھو۔ روزے رکھو۔ زکوٰۃ دو۔ تاکہ خدا کے گھر جا کر آرام سے رہو۔

پاؤں کا جیل خانہ

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

لوگو! میں ایک آزاد جنٹلمین کا پاؤں ہوں۔ مجھکو صرف صبح کے وقت غسل دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سوتی۔ یا اونی ریشمی قبا پہنائی جاتی ہے۔ جس کو جراب کہتے ہیں۔ اس وقت میں خوش ہوتا ہوں کہ ایک امیر اور خوش حال آدمی کا پاؤں بنا۔ جو یہ لباس میسر آیا۔ غریب کا پاؤں ہوتا تو کیچڑ میں۔ کانٹوں میں۔ دہوپ کی تپتی جھلستی زمین پر چلنا پڑتا۔ لیکن جب مجھکو بوٹ کے جیل خانے میں ڈالا جاتا ہے۔ تو بہت پریشان ہوتا ہوں۔ اپنی عارضی خوشی پر نفرین کرتا ہوں۔ مگر جنٹلمین نہایت بے پروائی سے مجھ کو قفس چرمی میں بند کر دیتا ہے۔ اور مجھ پر زور دے کر کھڑا ہوتا ہے۔ تو لیکچر دیتا ہے کہ اے لوگو! آزادی حاصل کرو۔ آزادی بڑی نعمت ہے۔ اس وقت بے اختیار میرا جی چاہتا ہے کہ زبان ہو تو کہوں کہ تیری آزادی کا دعویٰ جھوٹا ہے تو نے ٹھنڈے اور گورے ملکوں کی تقلید میں جہاں بوٹ پہنا ضروری ہے۔ ہندوستان میں رہ کر خواہ مخواہ اس کو پہنا۔ اور اپنے جسم کے ضروری حصے کو قید کر کے "پابند" ہوگیا۔ اب آزادی کیسی! آزادی جب تھی کہ دیسی جوتا پہنتا۔ پانچوں وقت کی نماز کے وقت پاؤں کو دہوتا۔ اور ہندوستانی شریفوں کی محفلوں۔ مسجدوں میں بے روک ٹوک جاتا۔ اب بوٹ اُتارنے کی مشکل کے سبب سب سے محروم ہے۔

سوئی کی لن ترانی

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

کالے برقع میں چھپی ہوئی کاغذ کی سیاہ پڑیہ میں بند سوئی نے اپنا نوکدار منہ باہر نکالا اور کہا

کون کہتا ہے انگریز ہندوستان کے بادشاہ ہیں۔ یہ ملک میرا ہے۔ اس کے رہنے والے میری رعایا ہیں۔ آئندہ کوئی شخص میرے سوا کسی کو یہاں کا تاجدار نہ کہے نہ سمجھے۔ نہ مانے۔ ورنہ سزا دی جائے گی۔

انگریزوں کا اور میرا صرف اتنا تعلق ہے کہ جہاں میں پیدا ہوئی ہوں۔ وہیں وہ پیدا ہوئے ہیں۔ تو اس کے لئے اتنا ہو سکتا ہے کہ میں ان کو اپنی دوسری ہندوستانی رعایا کے مقابلہ میں کچھ امتیاز دیدوں۔ لیکن نا ممکن ہے کہ ان کے دعوائے ہمسری کو برداشت کیا جائے۔

سب لوگ میرے محتاج ہیں۔ میں نہ ہوں تو گورے کالے ننگے پھریں۔ یا درخت کے پتوں سے اپنا بدن چھپائیں۔ میرا ہم جنس لوہا سوت کا تنا ہے۔ کپڑا بنتا ہے اور میں اس کو سیتی ہوں۔ عزت مجھ سے ہے۔ حرمت مجھ سے ہے۔ اور راحت مجھ سے ہے۔

جب میں پہلے پہل اس ملک پر حملہ آور ہوئی تو دیسی سوئیوں نے جو کچھ نہیں میرا سامنا کیا۔ مگر میں نے ان کو زک دی۔ اور ناپید کر دیا۔

آج میری وہ شان ہے اگر انگریزوں کو اور سب یورپ والوں کو بلکہ سب انسانوں کو نیچا دکھانا چاہوں تو دکھا سکتی ہوں۔ اور ننگا دہڑنگا پھرا سکتی ہوں۔ دیسی کالے بائیکاٹ کا نام لیں تو میں ان کا بائیکاٹ کر کے حیران پریشان کر سکتی ہوں۔ جب وہ جوش کے مارے آپے سے باہر ہوں اور میں ذرا کے ذرا اپنا منہ چھپا لوں۔ تو نشہ ہرن ہو جائے۔ اور ہائے سوئی ہائے سوئی کا غل مچنے لگے۔ ہندوستان سوئی سوئی کا محتاج ہے آواز آنے لگے۔

لہٰذا میں اعلان کرتی ہوں کہ کوئی آدمی دم نہ مارے۔ اور چپ چاپ کام کرتا رہے۔ کیونکہ تاج میرا۔ کاج میرا۔ راج میرا۔

فٹ بال

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

بیچاری گیند میدان فٹ بال میں کھیلنے والوں کی کس طرح ٹھوکریں کھا رہی ہے بڑا ترس آتا ہے۔ چمڑے کا بوٹ چمڑے کی گیند کو ٹھکراتا ہے۔ وہ بھاگتی ہے تو پیچھے دوڑتا ہے۔ ایک طرف سے بچتی ہے تو دوسرا حریف سر پر آتا ہے۔

اس گیند کے اندر ہوا بھری ہوئی ہے۔ اگر ٹھوس ہوتی تو کس کی مجال تھی۔ جو یوں سر بازار ٹھوکریں مار سکتا۔

آدمی کو دیکھو جس کا باطن ایمان حق سے بھرا ہوا ہو۔ اس کو کسی کا خوف نہیں رہتا۔ مگر کھوکھلے ضمیر والے ہمیشہ گردش ایام کے بوٹوں سے ٹھکرائے جاتے ہیں۔

فٹ بال بڑا اچھا کھیل ہے۔ گرمی کے موسم میں شام کے وقت دیکھا ہوگا۔ نوجوان اس سے جی بہلایا کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی ورزش ہے۔ جس سے ہاتھ پاؤں اور بدن میں چستی اور پھرتی پیدا ہوتی ہے۔

اگلے زمانہ میں کبڈی کا کھیل تھا جس میں سانس روک کر دوسرے فریق کے پالے میں کبڈی کبڈی کہتے ہوئے جاتے تھے۔ اب کبڈی کا رواج کم ہوتا جاتا ہے۔ حالانکہ کبڈی میں فٹ بال سے بڑھ کر فائدے تھے۔ اول تو یہ کہ سانس کے روکنے اور دوڑنے سے پھیپھڑہ مضبوط ہو جاتا تھا۔ دوسرے گیند خریدنی نہ پڑتی تھی جرسی فٹ بال کی وردی اور ایک خاص قسم کا جوتہ نہ لینا ہوتا تھا۔ اب یہ عالم ہے کہ دسویں پندرہویں دن گیند خراب ہو جاتی ہے جوتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور غریب ہندوستانی ولایت والوں کی جیب میں چاندی کے سکے ڈال کر چمڑے کے چند ٹکڑے دوبارہ خریدنے

پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بھائی ایسے کھیل کو دے سلام جس سے ملک کی دولت برباد ہوتی ہو۔ گھر پھونک تماشا اچھا نہیں۔

ہاتھ کی بغاوت

سالن کی آزادی

(از اخبار توحید ۱۹۱۳ء)

میرا ہاتھ سالن کی پیالی میں جاتا ہے چلاتا کہتا ہے پیالی کی اونچی دیواروں سے دم گھٹتا ہے۔ شوربے اور بوٹی قتلے کے قید خانے میں نہیں جاؤں گا۔ مجھ کو انگریزی پلیٹ چاہیئے۔ جہاں سالن کو آزادی ہے۔ بوٹی الگ نظر آتی ہے قتلہ جدا معلوم ہوتا ہے۔ شوربا اپنی شان علیحدہ دکھاتا ہے۔ ہاتھ کو اختیار رہے۔ پلیٹ کے کھلے میدان میں جس طرف چاہے جائے۔ پیالی میں انگلیوں کو غوطے مار مار کر بوٹیاں نکالنی پڑتی ہیں۔

الٰہی خیر ہاتھ ہی باغی ہو گیا تو پیٹ بھوکا مر جائے گا۔ اسکو سمجھاؤ اور کہو دیوانے غریبوں میں پیدا ہوا ہے غریبوں کی سی باتیں کر۔ ہمارے ہاں بھی پلاؤ زردہ کھلی قاب اور میدانی رکابی میں ہوتا ہے۔ مگر دال اور غریبانہ سالن پیالی کی دیواروں کے پردہ میں اچھا۔ پردہ سے باہر آتا آبرو میں بٹہ لگائے گا۔ انگریز ملک کے بادشاہ ہیں۔ دولت حشمت ان کی غلام ہے۔ وہ تر بتر کھانے کھاتے ہیں۔ اس لئے کھلی رکابیاں ان کو زیبا ہیں۔ تو مفلس کنگال ابالی دال کھانے والا تجھکو یہ فضول خرچیاں مناسب نہیں۔ جبتک پلاؤ زردہ میسر نہ آئے صبر شکر سے پیالی پر گزارہ کر۔ آج تو بغاوت کرتا ہے۔ کل عورتیں سرکشی اختیار کریں گی کہ ہم کو بھی پردہ سے

نکالو۔ اُس وقت کیا ہوگا۔ اب تو پردہ میں پھٹے پرانے پیوند لگے کپڑے چھپے ہوئے ہیں۔ پر وہ نہ رہا تو ملک کا سارا بھرم کھل جائے گا۔ اور غریب شوہر بچے کپڑے بناتے بناتے پاگل بن جائیں گے۔ ناداں بات کو سمجھ اور دوسروں کی ریس چھوڑ۔

پیاسے گلے پر چھری

حاملہ کا قتل

(از اخبار توحید میرٹھ ۱۹۱۳ء)

مسلمان کہتے ہیں۔ بلغاریوں اور سرویوں نے ترکی عورتوں کو اُن کے بچوں کے سامنے قتل کیا۔ انگریز کہتے ہیں کہ غدر میں ہندوستانیوں نے اُن کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ فقیر کہتا ہے کہ اُس بے زبان جانور کو بھی کسی نے دیکھا جس کا نام بکری ہے۔ جو شہروں کے قتل خانوں میں ہزاروں بھوکی پیاسی بے دردی کی چھری سے ذبح ہو جاتی ہیں۔ تم اپنی بیوی بچوں کو لیکر خوش خوش آراستہ دسترخوان پر کھانا کھاتے ہو۔ تمہارے سامنے قلیہ۔ قورمہ۔ کوفتے پسندے کی قابیں ہوتی ہیں ہاتھ بڑھاتے ہو۔ مظلوم بوٹیوں کو دانتوں سے بھنبھوڑتے ہو۔ مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ گوشت کہاں سے آیا۔ اور کیونکر آیا۔

کسی دور کے گاؤں سے بکریوں کا ریوڑ چلا۔ مئی کی دھوپ ان کے سر پر تھی۔ بیچاریاں دن بھر کی منزلیں طے کرکے شام کو شہر میں پہنچیں۔ جلادوں نے ایک تنگ مکان میں بند کر دیا۔ اور وہ ہستیاں جن کو دیہات کے کھلے میدانوں میں رہنے کی عادت تھی۔ شہر کے تیرہ و تاریک جیل خانہ میں بھوکی پیاسی مقید رہیں۔ صبح کو مقتل کی

جلاؤ ہوئی دیسی ڈاکٹر کی نظر طلوع نے ایک سرسری معائنہ کیا۔ لین دین کے خفیہ اشارے ہوئے۔ اور ناتوان مظلوم قیدی جن کی زبانیں پیاس کی شدت سے نکل پڑتی تھیں جو حسرت اور مایوسی سے اپنے جلادوں کو دیکھکر رحم کی درخواست کرتے تھے۔ ڈنڈوں اور لاتوں کے زور سے کان اور دُم کھینچ کھینچ کر قتل گاہ میں پہنچائے گئے۔ جہاں جلاد چھری تیز کئے بغیر بے پروائی سے آستینیں چڑھائے کھڑا تھا۔ ان میں ایک بکری حاملہ تھی۔ اُس کو دو دو قدم چلنا دو بھر تھا۔ وہ ظالموں کی لاتوں سے حواس باختہ تھی دم چڑھا جاتا تھا۔ مڑ مڑ کر دیکھتی تھی کہ کوئی خدا کا بندہ ترس کھائے اور پیٹ میں بچہ رکھنے والی کو موت سے بچائے۔ وہاں کون سنتا تھا۔ سب کے کلیجے پتھر کے تھے کسی نے رحم نہ کیا۔ یہاں تک کہ سب کے ساتھ وہ بھی مقتل کی زمین پر پچھاڑی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پیاس کے مارے حلق سوکھ گیا تھا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی۔ مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ اُس نے چھری کو دیکھا اور سمجھی کہ اب اس کی دھار پانی پلائے گی۔ آخر یہی ہوا۔ جلاد نے گلے کی کھال پر چھری رکھ دی۔ حاملہ بکری نے کانپ کر اور لرز کر ایک دفعہ چیخ ماری۔ چھری نے اس کے بالوں کو کاٹا۔ کھال کو کاٹا۔ رگوں کو کاٹا۔ اور ہڈی کے پاس جا کر دم لیا۔ خون کے فوارے اُبلے۔ ہاتھ پاؤں سے دم کھنچنا شروع ہوا۔ بے جان لاش چند منٹ تڑپی اور ٹھنڈی ہو گئی۔ اس کے بعد لاش کھینچی گئی۔ پیٹ چاک کیا گیا۔ اور دو بچے نکالے گئے۔ جو مرنے والی کے پیٹ میں تھے۔ اُس وقت سفاک جلاد نے اتنا کہا او ہو یہ گابھن تھی۔ بچوں کو جلدی سے چھپانے کی کوشش کی گئی۔ کیونکہ اب قانون کی گرفت کا ڈر تھا۔ اس گوشت کے ٹکڑے پارچے ہوئے۔ کوئی حصہ قلیے کے کام آیا۔ کوئی قورمے میں بھنا۔ کسی کا قیمہ بنا۔ پسندے کوٹے گئے۔ کسی کو کوفتے کی کوفت اُٹھانی پڑی۔

یہ ہے تمہارے دسترخوان کی بہار جس کو فخر اور گھمنڈ سے کھا رہے ہو۔ کھا چکو گے

تو اخباروں میں بلقانی سفاکیوں پر مضمون لکھو گے۔ اور خیال کرو گے کہ تم نے قوم کا ایک بڑا فرض ادا کیا ہے۔ ہاں بے شک تم نے فرض ادا کیا ہے۔ تمہاری تعریف کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ فرض خودغرضی کا فرض تھا۔ ورنہ تم ان بے زبان ہستیوں کا بھی خیال کرتے۔

کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تم ذبح خانوں کی نگرانی پر زور دیتے۔ اور پبلک سے کہتے کہ وہ بے زبان جانوروں کی خبر گیری کا انتظام کریں۔ اس میں تم پر بغاوت کا الزام نہ لگتا۔ اگر تم لکھتے کہ جن پر چھری چلائی جائے ان کو پانی پلا دینا چاہیئے۔ ان کو حبس بیجا نہ رکھا جائے۔ گابھن اور حاملہ کی تحقیق خاص طور پر ہو۔ اور جو لوگ اس کے خلاف کوئی حرکت کریں ان کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں۔ مگر تم سب (جن میں راقم فقیر بھی شامل ہے) دوسروں کو کہتے ہو اپنی خبر نہیں لیتے۔ کل قیامت کے دن احکم الحاکمین تم سب سے اس کا جواب طلب کرے گا۔

میں جانتا ہوں کہ جانور تمہارے لئے حلال کئے گئے ہیں۔ بے شک تم اُن کا گوشت کھا سکتے ہو۔ مگر ان سفاکیوں کی کسی مذہب نے اجازت نہیں دی۔ خصوصاً اسلام نے ان ناروا ظلموں کو نہایت سختی کے ساتھ روکا ہے۔

حضرت خواجہ اجمیریؒ کے غلاموں کو چاہیئے کہ وہ اپنی صوفیانہ نرم دلی کو کام میں لائیں۔ اور ہر شہر میں ایسی انجمنیں قایم کریں۔ جن کے ممبر روزانہ صبح کے وقت ذبح خانوں میں جاکر حاملہ۔ بیمار۔ کمزور۔ کم سن۔ بھوکے پیاسے جانوروں کو ذبح ہونے سے بچائیں۔ اور اس کا خیال رکھیں کہ ایک جانور دوسرے کے سامنے ذبح نہ ہو۔ چھریاں تیز کرلی جائیں۔ تاکہ ذبح کے وقت زیادہ تکلیف نہ ہو۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو مظلوم اور غریب نواز خواجہؒ اور حضرت رب العلمین کی خوشنودی حاصل کریں گے۔

تخت گاہ کے ایک تختہ کا پیام

وائسرائے کے نام

(از زمیندار۔ جنوری سنہ ۱۹۱۳ء)

مائی لارڈ ہارڈنگ! سنہ ۱۹۱۲ء جاتا ہے اور تم آتے ہو۔ بارہ مہینے پہلے ان ہی دنوں میں تم اور سنہ ۱۹۱۲ء ایک گاڑی میں سوار ہوکر خبر دینے آئے تھے کہ دہلی برٹش راج کا پایۂ تخت بن گئی۔

اب تم دسمبر میں بحیثیت نائب السلطان مستقل سکونت کے ارادے سے دہلی میں داخل ہوتے ہو۔ اور تمہارے ساتھ ساتھ سنہ ۱۹۱۲ء کے بدلے سنہ ۱۹۱۳ء پہلو میں بیٹھا نظر آتا ہے۔

گورے ملک کے وہمی ۱۳ کے عدد سے بدشگونیاں لیتے ہیں۔ مگر ہم کالوں کے خیال میں یہ خام خیالیاں ہیں۔ تمہارا اور تمہاری حکومت کا بول بالا ہوگا۔ اور تیرہ کا عدد منحوس نہ رہے گا۔

لاٹ صاحب! لوگ کہتے ہیں کہ دنیا بدل رہی ہے۔ ہر وجود تغیر و انقلاب کے میدان میں دوڑا چلا آتا ہے۔ زمانہ نے تمام کائنات کی چھوٹی بڑی اشیاء میں حرکت پیدا کرکے ان کی کایا پلٹنے کا سامان کیا ہے۔

گو فقیر نہیں جانتا کہ خلقت کا یہ کہنا سچ ہے یا جھوٹ۔ جھوٹ اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ تم نے اور تمہاری حکومت کے اکثر بڑے بڑے آدمیوں نے بارہا یہ بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں ایک زبردست انقلاب برپا ہے۔ اور حالات و کیفیات میں تبدیلی ہو رہی ہے ہر قدیمی ہستی جدت کا جامہ پہن رہی ہے۔

سچ یوں نہیں مان سکتا کہ تم سب کی یہ باتیں نیچرل مشاہدہ کے خلاف ہیں۔ یاد ہوگا کہ گزشتہ دسمبر میں بھی سردی تھی۔ آسمان کا رنگ نیلا۔ رات کالی۔ دن اُجلا۔ اور ہوا خنک تھی۔ اور آج کل بھی وہی سماں ہے۔ تارے نکلتے ہیں۔ چاند گھٹتا بڑھتا ہے۔ سورج طلوع و غروب کے دور میں پھنسا ہوا ہے۔ اس زمانے میں بھی انسان رات بھر سوتے اور دن بھر جاگتے تھے۔ کانوں کا کام سننا۔ آنکھوں کا دیکھنا۔ ناک کا سونگھنا اور زبان کا بولنا تھا۔ غذا چبا کر کھائی جاتی تھی۔ وہاں غذا کی جتنی مقدار سے پہلے پیٹ بھرتا تھا اب بھی اتنے ہی نوالے درکار ہیں۔ اس میں ذرہ بھر فرق و تفاوت نہیں ہوا۔ پھر تغیر و تبدیلی کس چیز کا نام ہے۔

یہ تو نہیں کہ اگلے وقتوں میں پانی مٹی۔ لکڑی اور تانبے کے پیالوں میں پیا جاتا تھا اب شیشے کے گلاس چل گئے ہیں۔ اُس وقت زمین پر بیٹھ کر روٹی کھائی جاتی تھی۔ اب میز کرسی کا رواج ہے۔ ان دنوں اونٹ بیل گھوڑے کی سواریاں تھیں۔ آج کل ریل موٹر کار ٹرام کا زور ہے۔ اگر اس کا نام زمانہ کی تبدیلی ہے تو میں ان کو نہیں مانتا کیونکہ میرے نزدیک تبدیلی جب ہوتی کہ بغیر پانی کے پیاس بجھ جاتی۔ کھانے کی خواہش جاتی رہتی۔ نقل و حرکت کے واسطے ریل اور موٹر کار کا محتاج نہ رہنا پڑتا۔

میرے پیارے جارج سلطان کے قائم مقام تم پر سلام۔ ذرا سننا۔ اس دہلی کے در و دیوار کیا پیام دیتے ہیں۔ جس میں قدم رکھتے ہو وہ کہتے ہیں۔

ہارڈنگ بابا کی خیر تخت گاہ کے ایک تختہ کی دعا لیتا جا۔ بھلا ہوگا۔ شاد رہ۔ آباد رہ۔ تیری امیدوں کا چمن پھلے پھولے۔ تیرے ارمانوں کا تختہ سرسبز و شاداب ہو۔ دُنیائے فانی میں جی نہ لگا۔ اس خاک پر ہزاروں دفعہ کروڑوں اور شاہوں کے ہجوم میں جھومتے جھامتے سورج کے جلوس نکلتے ہیں۔ مگر شام کو ان کی روشنی ہمیشہ ناپید ہو گئی ہے۔ اپنے فرض کو پہچان جس طرح سورج خلقت کی فائدہ رسانی کے خیال

میں اپنی آن بان اور شکل و صورت کو نہیں دیکھتا۔ اور دن بھر خدا کے بندوں اور اس کی تمام مخلوقات پر نعمتوں کا مینہ برساتا رہتا ہے۔ تو بھی اے اس بادشاہ کے نائب جس کے ملک میں سورج غروب نہیں ہوتا۔ ان ظاہری کھیل تماشوں میں مشغول نہ ہو۔ اور رحم و انصاف کی طرف توجہ کر۔

ان ہاتھیوں سے جن پر تو سوار ہے تیری ذمہ داریاں زیادہ بوجھل ہیں۔ توقع نہ رکھ کہ رعیت تیرے آگے جھکتی ہے یا نہیں۔ تیرے احسان کا بوجھ اُن کی گردن کو جھکائے۔ تیری انصاف کاریاں سب کے سروں کو خم کرائیں تو بات ہے۔

آج وہ دن ہے کہ دہلی ظاہری اور نمائشی شان و شوکت کے بدلے باطنی اندرونی دبدبہ و تمکنت کی خواستگاری کرتی ہے۔ پایہ تخت کی خشتی و سنگی عمارات کے ساتھ باشندوں کے دلوں میں محبت و الفت کی بنیاد بھی رکھ۔ تاکہ انگریزی تاج کے ہیروں کو اصلی درخشانی نصیب ہو۔ اور دکھائے کہ تو اس خدا کا سچا اور نیک بندہ ہے۔ جس کی مندر مسجد اور گرجا میں عبادت کی جاتی ہے۔ مسجد و گرجا کی نماز میں شریک نہ ہو۔ مندر کے ناقوس اور شوالے کے گھنٹے سے بھوائی نہ کر۔ مگر اے خدا پرست ہندوستان کے مجازی بادشاہ اپنے دل کو ہر وقت شہنشاہ حقیقی کی باز پرس سے خبردار کرتا رہ۔ بھول مت یاد رکھ۔ تاکہ تیری اور انگریزی قوم کی یاد ہمیشہ نیکی سے برقرار رہے۔

درکار ہیں مستانے چند

(از خطیب ۳۰ر اپریل ۱۹۱۲ء)

ہوش سے بیگانے چند۔ دین کے دیوانے چند۔ درکار ہیں مستانے چند۔ ترک خانہ کریں۔ بیخانہ میں رہیں۔ جام کو نظر لگائیں۔ ہاتھ اور منہ کو بچائیں۔ زخموں کے گلقند

نوچیں۔ اور حرم والوں کو دکھائیں۔

بھوک جن کی دائی ہو۔ پیاس جن کی ماں ہو۔ بے سروسامانی جن کی ماں جائی ہو۔ وہی درکار ہیں۔ وہی اس میدان کے شہسوار ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ یکتائی اور توحید کی آواز آندھی کے شور میں دنیا تک پہنچاؤ۔ مجھے وہ چاہیے جو کہے کہ پیاری گھٹا کی بوندوں میں اس لیلی کا محل بناؤ۔ جرس بجاؤ۔ گھر گھر پہنچاؤ۔ سوکھی زمین سوندھی خوشبو سے مہک اٹھے۔ گھر والے مستی میں آئیں۔ جھولے ڈالیں۔ گائیں بجائیں۔ آندھی ہوگی تو کواڑ بند کئے جائیں گے۔ آنکھ۔ ناک۔ کان کو ڈھکا جائے گا۔ پھر کیا خاک توحید بتانے کا مزا آئے گا۔

انگریز کا لندن ہو یا ہند کا معدن۔ برما کا رنگون ہو یا نجد کا مخزن۔ سب کو پریم نگر لے جانا ہے۔ وحدت کی سیج پر سلانا ہے۔ مگر یہ لڑنے جھگڑنے کی سند نہیں تو تکار۔ چیخ پکار سے حاصل نہیں۔ جو لوگ مناظرہ کی تلوار سے لڑتے ہیں اور اس پر ہادی مہدی بنتے ہیں۔ انہوں نے کتنے کافر مسلمان کئے۔ ان کے آگے کس قدر منکر گردنیں خم ہوئیں۔ تجربہ کہتا ہے ایک بھی نہیں۔ بلکہ انکار بڑھا۔ ضد زیادہ ہوئی۔ بگاڑ کی دیواریں اونچی ہوگئیں۔ نہ عیسائی نے مانا نہ موسائی نے۔ نہ ہندو نے تسلیم کیا۔ نہ آریہ نے۔ نہ سکھ قائل ہوئے نہ پارسی گھائل ہوئے۔ ہاں چرچے بہت رہے۔ روپے جیبوں سے نکلکر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آتے جاتے رہے۔ دسترخوان پر کھانے بھی رنگ برنگ کے آئے۔ نوالے بھی نرم گرم چکنے چپڑے دانتوں پر چڑھے اور معدے میں اترے۔ لیکن دل و جان توحید کا ارمان نہ نکلا۔ نہ اس کو کسی نے دیکھا نہ وہ کسی کو دیکھ سکی۔ ہر کبھی گھڑی تکتی رہی کہ پیا کا اشارہ پاؤں تو لیلی کو مسند پر لاؤں۔

جب ہی تو کہتا ہوں۔ ارے دیوانوں کو بلاؤ۔ مستانوں کو پکار دو۔ جو انجمن طلب گار اسلام کے ذاکر ہوں۔ جو اپنے مطلوب کی چشم پوشی رضا کو تنخواہ بنائیں۔ کفنی پہنیں۔ ہر ہر جپیں۔

شام کی مرلی بجائیں۔ گھر گھر دہائی مچائیں۔ روتوں کو ہنسائیں۔ ہنستوں کو رلائیں۔

پوچھو ان کا ذکر کس اخبار میں چھپے۔ کس جریدہ سکوت میں۔ دریافت کرو ان کا خیر مقدم کیونکر ہو۔ جواب دو۔ کس بیری سے نہ کوئی ان کو جانے۔ نہ وہ کسی کو جانیں۔ بس ایک جاناں کی دید ہو۔ اسی کی گفت ہو۔ اسی کی شنید ہو۔ تب دیکھنا ہر گھر میں ہولی دیوالی ہر گھر میں عید ہو۔

اسلام غیر نہیں۔ ہر آدم زاد کے لئے خیر ہے۔ اس کو زہر نہ بناؤ۔ خود شکر بنو۔ اسلامی شیر میں گھل کر فنا ہو جاؤ۔ تب مزے سے کر لوگ پئیں گے۔ کیا لیکچروں اور مباحثوں کے قم سے مردے جئیں گے۔

تمہاری مسیحائی خود بینائی کی محتاج ہے۔ اندھوں کو نہ بلاؤ۔ پہلے اپنی آنکھیں بنواؤ۔

سنتا ہے کس نے پکارا۔ رنگون میں آؤ۔ اور برما کو مسلمان بناؤ۔ ذرا الکبد بنا کہ یاد کر رہا ہوں اور کلمہ والے کا دل شاد کر رہا ہوں۔

ابھی خود مجھکو یہ بات معلوم نہیں کہ اس اونچے لا کو کیونکر عبور کروں۔ اس پہاڑ سے اتر لوں تو دامنوں کو سمیٹ کر الا اللہ کا نعرہ بلند کروں گا۔

مگر ہاں میں نہیں تو کیا اور بھی نہیں۔ بہتیرے مستانے دیوانے موجود ہیں۔ گڑگڑانے کی دیر ہے۔ کلبلانے والے نکل ہی آئیں گے۔

تو ہاں انہیں کیا کرنا چاہئے۔ یہ کہ جو گھر بار سے آزاد ہوں۔ وہی میدان میں آئیں۔ ہرا چلیں۔ جنگل میں منگل رچائیں۔ درختوں کے سایہ میں بسیرا جمائیں۔ ملے تو کھائیں۔ نہیں تو مگن ہو کر سو جائیں۔ عبادت رب ان کا شعار ہو۔ پھر چھوٹا بڑا ادنے اعلے ان کا یار ہو۔ برمی زبان آتی ہو تو واہ ہے۔ ورنہ عشق کی زبان سب سمجھتے ہیں۔ اسی میں بات چیت ہو۔ کوئی دس بولے تو وہ ایک اشارہ ابرو سے سب کا جواب

دیں۔ پانچ وقت کی نماز حلقۂ ذکر و شغل و ماسوا کی ضرر درتوں سے بے خبری اور ذات الٰہی پر توکل کوئی بیمار ہو۔ تو اُس کی خدمت کریں۔ اپنے دُکھ کی جگہ اُس کا دُکھ سمجھیں۔ دو جسم ایک جان بن جائیں۔ کسی کے کانٹا لگے تو اپنی پلکوں سے نکالیں کوئی ترشی سے پیش آئے تو یہ اپنے اخلاق کی مٹھائی اُسے کھلائیں۔ بات میں سچ ہو گھات میں سچ ہو۔ غرض جو چیز ہو صداقت و راستی کی تصویر ہو۔ پھر دیکھو کہ کیوں نہ ہر بری کا دل زلفِ اسلام میں اسیر ہو۔

وہ جو کہتے ہیں کہ ہم روپے دیا کرتے تھے۔ اب بھی دیں گے۔ ذرا ورے کو آئیں ہم ان کا منہ چوم لیں۔ اور ہو سکے تو ان کے خیال کو بھی بوسہ دوں کہ کارِ خیر کے لئے روپے جیسی دلنشین چیز کو اپنے سے جدا کرنا چاہتے ہیں۔

مگر دلدار من یہ کوچہ دوسرا ہے۔ یہاں روپے کی ضرورت نہیں۔ نہ انجمن سازی کی نہ غل شور کی۔ نہ ہاہو کی۔ یہاں تو بس پھٹے پرانے کپڑے پہننے والے یا چاک گریباں متوالے کام کر سکتے ہیں۔ ان کو ڈھونڈو اور پہلے اپنے رنگوں کے مسلمانوں کو مسلمان بناؤ۔ میں بھولا۔ ان کو یہ بتاؤ کہ وہ مسلمان ہیں۔ اور ایک شرمیلے سجیلے سلطان کے تابع فرمان ہیں۔ وہ جو کھجوروں کے جھنڈ میں اپنی پیاری بکریوں کو جنگل کے پتے کھلاتے تھے۔ اور دیکھنا لمبے لمبے بال شانوں پر ڈالے سورج سے آنکھ لڑاتے تھے۔ لکڑی پر سہارا دے کر کھڑے ہوتے اور کہتے۔ کھاؤ میری بکریوں کھاؤ میری پیاریوں۔ میں تمہاری چوکسی میں کھڑا ہوں۔ کوئی دشمن تمہارے پاس نہ آنے پائے گا۔

اور ہاں وہ جو حرا نامی غار میں جاگتے تھے۔ اور امت کے ہونے کا سامان کرتے تھے۔ اور وہ جو راتوں کو کھڑے ہو کر نمازیں پڑھتے اور رخساروں پر آنسو بہاتے اور فرماتے۔ الٰہی میری امت کو سنسار کیو اور وہ جو آج بھی آٹھویں دن تمہاری

رپورٹ سنتے ہیں۔ اور جب کوئی برائی پاتے ہیں تو اس کو چھپاتے ہیں۔ اور دل ہی دل میں فرماتے ہیں۔ کاش میرے پیارے تو ایسا نہ کرتا۔ ارے میری امت کو کہلا جھوٹ بولا۔ دیکھ فرشتے مجھ پر ہنسیں گے۔ ارے مجھ سے منسوب ہو کر شراب پیتا ہے زنا کرتا ہے۔ جوا کھیلتا ہے۔ دل جان میرا کہنا مان۔ ان سب کو چھوڑ۔ میرا بن۔ دیکھ تیرے سبب مجھ کو شرمانا پڑتا ہے۔ فرشتوں کے سامنے نظریں نیچی ہوتی ہیں۔ تو میرا ہو کر میری آبرو نہیں بچاتا۔

یہ نیں گے تو رنگون کے مسلمان اصلی بنیں گے۔ اور جب اسلام اپنی اصلی حقیقی شکل میں نمودار ہوگا۔ تو ہر وجود غیر مسلم اس کا شیدا و طلبگار ہوگا۔

مگر کہنے کو سب ہی کہتے ہیں جو میں نے کہا۔ ضرورت کرنے کی ہے۔ جو عمل کی بولتی تصویر ہو۔ اور عمل کی تکمیل بغیر ترک تعلقات ماسوا اور جنون مخصوص کے محال ہے اسی واسطے تو اس مضمون کے دروازہ میں میں نے پہلی صدا یہ لگائی تھی۔

درکار ہیں ستانے چند

غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا؟

(از اخبار خطیب ۱۲ مئی ۱۹۱۵ء)

اگر ہوتا تو خدا ہوتا۔ جس نے سورج کی روشنی۔ دریا کا پانی۔ ہوا۔ آگ۔ مٹی سب کو برابر دی تھی۔ امیر۔ غریب۔ چھوٹے بڑے کا امتیاز نہ رکھا تھا۔ مگر اس نے اپنے وجود کو مخفی کر لیا۔ ہر مخلوق کا سہارا اور آسرا بنا۔ مگر پردہ کے پیچھے رہ کر نظروں سے

پوشیدہ ہوکر۔ اور انسان بنا تھا دیدباز۔ ظاہری ذریعہ پرمٹنے والا۔

اس لئے کشمکش ہونے لگی۔ کوئی بڑا بن گیا کوئی چھوٹا رہ گیا۔ کسی نے اتنی دولت پائی جس کی تاہ نظر نہ آئی۔ کوئی رات کی روٹی کو ترسا۔ اگرچہ رزق کا مینہ گھر گھر برسا۔

میں نے اپنے ملک پر نگاہ دوڑائی تو ایک عالمگیر بے قراری سامنے آئی کوئی نائی کہلاتا تھا۔ پاؤں دباتا تھا۔ خوان سر پر اُٹھاتا تھا۔ حجامت بناتا۔ کمین کہلاتا کوئی قصائی تھا۔ صورت آدمی کی رکھتا تھا۔ مگر ذات میں بیٹا شودر تھا۔ کوئی چمار تھا۔ چوڑا تھا۔ کھٹ بناتا تھا۔ غرض بڑے کم اور چھوٹوں کی بھیڑ تھی۔

پوچھا بھئی انسانوں میں یہ فرق کیسا؟۔ جواب ملا۔ قدرت کا یہی دستور ہے۔ کسی کو سنوارتی ہے۔ کسی کو بگاڑتی ہے۔ خدا نے پکارا۔ نہیں۔ تمہاری تکلیفیں خود تمہارے ہاتھوں سے ہیں۔ محنت کرو تو بڑے بن جاؤ گے۔ میرے دربار میں کسب اور کرم کی پوچھ ہے۔

نائی نے کہا اے خدا! آج عربی میں یہ حکم سناتا ہے اور کل سنسکرت میں منوجی کی زبانی یہ حکم بھجوایا تھا کہ برہمن میرا سر ہیں اس لئے علم و عقل کا کام وہ کریں۔ چھتری میرے بازو ہیں۔ جنگ اور حکمرانیاں ان کے حصے کی۔ ویش میرا شکم ہیں۔ لین دین کاروبار۔ ان کے ذمہ۔ شودر میرے پاؤں ہیں۔ خدمت چاکری ان کا کام۔ خود ہی ذات پات کی قید لگاتا ہے۔ پھر نئے حکم تبدیلی کے سناتا ہے۔ خدا نے اپنے عربی بندے سے کہلوایا۔ نہیں تمہاری سمجھ کا پھیر تھا۔ میں نے کام بانٹے تھے۔ ذات تقسیم نہیں کی۔ تم سب ایک ہو۔ بشرطیکہ نیک ہو۔ بد میرے ملک میں سب سے چھوٹا۔ نیک۔ سب سے بڑا۔

یہ باتیں سنکر ایک خاکروب گری میں جھاڑو دیتے دیتے ذرا سیدھا کھڑا ہوا پسینہ میں غرق۔ آنکھوں کو آسمان کی جانب اٹھایا۔ اور کہا یہ تو بتا۔ ہمارا آسرا کون ہے۔ صبح سے دوپہر ہوگئی۔ غلاظت اٹھائی۔ جھاڑو دی۔ کمیٹی کے جمعدار کے ڈنڈے کھائے۔ گالیاں سنیں۔ اب گھر جاتا ہوں۔ سیلی کوٹھری میں پڑنا ہوگا۔ جھوٹے ٹکڑے۔ سڑی بسی دال کھانے کو ملے گی۔ گرم پانی پینے میں آئے گا۔

ادھر دیکھو۔ یہ امیر ہیں۔ رات بھر بجلی کے پنکھوں میں سوئے۔ آٹھ بجے جاگے انگڑائی لی۔ آنکھیں ملیں۔ نوکروں کو صلواتیں سنائیں۔ ناشتہ کیا۔ بیت الخلا گئے۔ نہائے پھر آراستہ کمرے میں آئے۔ شطرنج کا دور ہوا۔ کھانا کھایا۔ گانا سنا سو گئے۔ شام کو ہواخوری کے لئے موٹر آئی۔ لینڈ و منگائی۔ غرض کوئی گھڑی محنت و تکلیف کی نہ پائی۔

ایک وہ ایک میں دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

خاکروب کا شکوہ ختم نہ ہوا تھا کہ سامنے بیگاری چمار آیا۔ سر پر بوجھ۔ دھوپ میں ننگے پاؤں۔ ساتھ میں سپاہی۔ جلدی چلنے کا تقاضہ۔ اس نے دیکھا کہ خاکروب اور خدا میں گفتگو درپیش ہے۔ تو اس نے بھی آہ کی صدا میں آمین پکاری۔ اور کہا اے میرے باری۔ ہے میری باری۔ دو وقت سے بچے بھوکے ہیں۔ اندھی ماں بخار میں پڑی رہی ہے۔ گھر سے روزی کی تلاش میں چلا تھا کہ اس فرشتے کے ہاتھ میں پڑا۔ اس نے طمانچے بھی مارے۔ بُرا بھی کہا۔ اور جانور کی طرح ہانک کر خبر نہیں کہاں سے چلا۔

اتنے میں ایک برقعے والی پاس سے گزری۔ دامنوں میں سیکڑوں پیوند ٹوٹی ہوئی جوتی۔ بغل میں ٹوپیوں کی بقچی۔ بازار گئی تھی۔ بیوپاری نے خریدنے سے انکار کیا۔ اور کہا مندا ہے۔ لڑائیوں کے موسم میں کسی چیز کی نکاسی نہیں۔ حیران پریشان

گھر چلی ہے۔ یتیم بچوں کی بھوک۔ اپنی بیکسی کا خیال کرتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو اُبلے چلے آتے ہیں۔

دو فریادیوں کو دیکھ کر وہ بھی پروردگار کی رہائی دینے کھڑی ہو گئی۔

تین عرضیاں گزریں تو عدالت آسمانی نے بغیر سمن جاری کئے دروازہ کھولا۔ اور کہا میرے بندو! مایوس نہ ہو۔ ہر تکلیف کے بعد راحت ہے۔ میرے دفتر میں امیروں کے عیش بھی لکھے جاتے ہیں۔ اور غریبوں کے مصائب بھی۔ ذرہ ذرہ اور نکتہ نکتہ پر بحث ہوتی ہے۔ اس دنیا میں بھی عوض ملتا ہے۔ اور آخرت کے واسطے بھی معاوضہ کی فراہمی ہوتی ہے۔ بے انصافی نہ ہو گی۔ جس کو یہاں نہیں اُس کو وہاں ملے گا۔ اور جو یہاں پا چکا اس کو وہاں کچھ نہیں۔

فریادیوں نے کہا ہمیں محنت اور مفلسی کی شکایت نہیں۔ شکوہ اس کا ہے کہ امیر ہم کو حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں۔ پاس نہیں بٹھلاتے۔ بات نہیں کرتے۔ آدمی نہیں سمجھتے۔ ستاتے ہیں۔ ٹھکراتے ہیں۔ اور بعضے ہمارے سایہ تک سے کتراتے ہیں۔

یہ سنکر آسمان لرزنے لگا۔ ہوا ہم کردم بجود ہوئی۔ فرشتوں نے کچھ اشارے پائے۔ دوزخ کے انگارے اٹھائے۔ دوزخ بھی چیں بجبیں ہوئی۔ سانپ بچھوؤں کو یورش پر آمادہ کیا۔ جنت نے دروازے بند کئے۔ ایسے امیروں پر حرام کے بورڈ لگائے۔ آسمان چہارم پر جناب مسیحؑ نے سنا۔ غیرت خداوندی کو جوش میں دیکھا تو وہ بھی تھرائے۔ مگر خیر ہوئی کہ اُن کی امت کی ٹکنی فوج دلاسہ کو دور کھڑی نظر آئی۔ جس نے ہزاروں غریبوں کو سہارا دیا تھا۔ تاہم وہ ڈرتے کہیں آج ہی یہ سوال نہ ہو جائے کہ کیوں جی تم نے انسے کہا تھا کہ مجھکو خدا کا بیٹا کہنا۔ اسوقت کیا جواب دوں گا۔ شرم کے مارے گردن جھک جائے گی۔ غریب پروری کی۔ مگر خدا کے راستہ سے بھٹکا دیا۔

زمین پر جب غضب الہیٰ کی شعاعیں نمودار ہوئیں۔ بصیرت والے گبھرا گئے۔ امیروں اور خودسروں مغروروں پر دانت پیسنے لگے۔ کلیجے پر ہاتھ رکھ کر غریبوں کی تکلیف محسوس کرنے لگے۔

یکایک حجاز سے برقابی کی خبر آئی۔ ایک بڑے سلطان نے ہمت بندھائی۔ کہا میں تمہارا ان غریبوں کا آسرا میں ہوں۔ لاچاروں بے سہاروں کا سہارا میں ہوں۔ ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں۔ جو سوکھی روٹی کھاتی تھی۔ خدا نے بادشاہ بنایا۔ مگر میں نے رعیت کی طرح وقت گزارا۔ مسکینوں میں رہا۔ مسکین بنا۔ اور مسکینوں میں حشر کی تمنا کی۔

آؤ تم میرے ہو۔ تم چمار ہو یا بھنگی۔ نائی ہو یا قصائی۔ کنجڑے ہو یا جلاہے۔ پھٹے حال ہو۔ مفلس کنگال ہو۔ مگر میرے دل کی ٹھنڈک اور فرزند نونہال ہو۔ تم کو گلے لگاؤں۔ پیار کروں۔ بہلاؤں۔ پاؤں دباؤں۔ پنکھا جھلوں۔ آپ بھوکے رہوں تمہیں پیٹ بھر کر کھلاؤں۔

ارے خدا کو ایک مانو۔ اس کی مرضی پر چلو۔ پھر تم میرے راج دلارے ہو۔ آنکھوں کے تارے ہو۔ روپیہ پیسہ کیا چیز ہے۔ مجھکو ایمان عزیز ہے۔ ایمان عزیز ہے۔ کہنا حسن نظامی سے کہنا۔ ہر دعوی دار غلامی سے ذات پات کی قید اٹھاؤ۔ مغل سید پٹھان کا نام مٹاؤ۔ مسکینوں کو اچھوتوں کو پاس بلاؤ۔ بیٹیاں دو۔ ساتھ کھلاؤ۔ ان کا آسرا بنو گے تو خدا کو پاؤ گے۔ ورنہ ہاتھ ملتے قبر میں جاؤ گے۔

حسن نظامی نے گردن جھکائی۔ اپنے مالک اپنے داتا کی مرضی سر آنکھوں پر اٹھائی۔ پہلے خاکروب کے قدم لئے۔ اس کی کوٹھری میں خرقہ بچھایا۔ اور ساتھ بیٹھکر جھوٹی روٹی اور باسی دال کا نوالہ کھایا۔ میرا بھائی۔ میرا بھائی کہہ کر جی بڑھایا۔ پھر بیگاری چمار کے گھر پہنچا۔ اپنا کھانا اس کے بچوں کو بانٹا۔ اس کی نابینا ماں کو دوا پلائی۔ اور جب تک رُت کا لال بیگار سے اٹھا نہ پھرا۔ اس کا جی بیمار چماری کو پنکھا جھلنے اور پاؤں دبانے سے نہ بھرا۔

برقعے والی عورت کا گھر بار تھا۔ لوگوں سے کہا۔ اس کی ٹوپیاں خریدو۔ شریف ہے خیرات نہ لے گی۔ اس کا دل نہ ٹوٹے ایسی مدد کرو۔

جہاں پناہ۔ محمد مجتبیٰ۔ امیر دو جہاں۔ خاقان الانس والجان۔ سلطان العرب والعجم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گورنمنٹ ناظر غیب تھی۔ اس نیت کی کارگزاری سے مسرور ہوئی۔ سبز نشان انعام میں بھجوایا۔ اور فرمایا۔ اس کو کھڑا کرو۔ اور غریبوں سے کہو۔ یہ ہے تمہارا آسرا۔ یہ ہے تمہارا سہارا۔ یہ ہے تمہارا ٹھکانا۔ اس کے نیچے آؤ۔ پھر کوئی تم کو حقیر و ذلیل نہ کہہ سکیگا۔ کسی کو پاس بٹھانے ساتھ کھلانے سے عار نہ ہوگا۔

یہ جھنڈا وحدت کا ہے یہاں دوئی نہیں
سوائے یہاں کے اور کہیں یکسوئی نہیں

کوئی ہے جو حسن نظامی کی طرح اس حکم پر ایمان لائے۔ اور بھنگی چماروں کے ساتھ کھانا کھانے پر آمادہ ہو جائے۔ جس کو انکار ہوگا قہر خدا کا سزاوار ہوگا۔ زمین اس کو نگل جائے گی۔ دولت اس کی چھن جائے گی۔ عزت اس کی لٹ جائے گی۔ در بدر رسوا ہوگا۔ پھر بعد کے پچھتانے سے کیا ہوگا۔

کہہ دو انسان کا جسم گندہ نہیں۔ اگر ظاہری ناپاکی نہ ہو تو ہر ولد آدم پاک ہے شاہ و گدا مساوی بحکم شہ لولاک ہے۔ غریب کے آگے جھکو۔ متکبر امیر کے سامنے اکڑو۔ ٹوٹے دل کو جوڑ دو۔ سنگین دل کو توڑ دو۔

جب غریبوں کا یہ آسرا پیدا ہو جائے گا۔ پھر دیکھنا مسلمانوں کے تمدن۔ سیاست وغیرہ میں انقلابی مزہ آئے گا۔ اور اس وقت اس سوال کا جواب بچہ بس آجائے گا کہ غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا؟ جب علم سبز کے نیچے کا ہر سپاہی بتائے گا کہ یہ ہوتا۔ یہ ہوتا۔

شذرات

ہماری بری نیکیاں

یہ طرز احسان کرنے کا تمہیں کو زیب دیتا ہے
مرض میں مبتلا کر کے مریضوں کو دوا دینا

ہندوستانی بڑے مخیر ہیں۔ خیر خیرات کرنے میں ان کا درجہ بڑی بڑی دولتمند قوموں سے بڑھ گیا ہے۔ مگر ان کی یہ نیکیاں بعض اوقات برائیوں سے بڑھ جاتی ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ہندو چڑیماروں کو دام دے کر پرندوں کو آزادی دلایا کرتے ہیں۔ ظاہر میں یہ بڑا نیک کام ہے کہ بے زبان جانور ظالم صیاد کے پنجہ سے رہائی پاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت جانوروں پر ظلم کرانے کا اور چڑیماروں کو جانوروں کو گرفتار کرنے کا اس سے زیادہ کوئی رغبت دلانے والا سبب نہیں ہو سکتا۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ ہماری ستمگاری کی "نقد داد" ملتی ہے تو وہ اور زیادہ محنت و جستجو سے اپنی سفاکیوں کا سلسلہ دراز کرتے ہیں۔

اسی طرح موٹے مسٹنڈے بھک منگوں کو خیرات دینا بے کار بناتا ہے۔ ملک میں گداگروں کی تعداد بڑھانے کے ذمہ دار زیادہ تر یہی نیک لوگ ہیں جو پہلے لوگوں کو بیمار کرتے ہیں۔ پھر دوا تقسیم کرنے کھڑے ہوتے ہیں۔

ایسی بری نیکیوں کا انسداد لیڈران ملک کو سیلف گورنمنٹ کے حصول سے زیادہ ضروری ہے۔ مگر ہم کو لیڈروں کے بھروسہ پر نہ رہنا چاہیے۔ جس ملک میں فرض ادا کرنے والے لیڈر نہ ہوں۔ اس کا ہر باشندہ اپنے ذاتی فرائض کا ذمہ دار ہے

لہذا ہندوستانیوں کو اس خیرات ناجائز کی رسم پر نظر ثانی اور زبان و قلم کو حرکت میں لا کر حق العباد کے بارے سبکدوش ہونا چاہیئے۔

صبا نے کلیوں کو جگایا

کل صبح باغ میں سوتی کلیوں کو صبا جگاتی تھی۔ شانہ ہلاتی تھی۔ یہاں تک کہ گدگدیاں کر کر کے ہنساتی تھی۔ یہ جگانے کا نرالا انداز دیکھکر میں نے اُس سے کہا تو بڑی ملنسار ہے۔ برگِ گل رخسار پر سر رکھ کے بولی۔ تم سیکھو کہ بچوں کو یوں پرورش کیا کرتے ہیں۔ یہ برتاؤ ہو گا تو ہر طفل غنچے کی طرح کھلے گا۔

میں اپنی نیند خراب کر کے پہلے بیدار ہوئی۔ جنگلوں پہاڑوں کی تازگی چُنتی دامنوں میں بھرتی۔ یہاں آئی۔ تب ان کلیوں کی خدمت بجا لائی۔ تم خود سورج نکلنے کے بعد تک سوتے رہتے ہو۔ تو بچوں کی تر و تازگی کہاں سے آئے گی۔

شمع کا مرقد زیبا

حضرت اکبر کی میز پر مومی شمع گورے سنتری کی طرح تنی کھڑی تھی۔ اس کا قد زیبا سر سے پاؤں تک سڈول پناجی کو بھا گیا۔ چکنی چپڑی صورت پر دل آ گیا۔ چاہتا تھا کہ اس مس خاموش کو گویا کروں۔ اور اپنی محبت کے پھندے میں پھنساؤں کہ کسی نے اُس کے سر پر شعلہ کا تاج رکھ دیا۔ آ ہا ہا۔ عالم ہی بدل گیا۔ کلاہ زریں شمع پیاری کی شکل کیسی دلفریب بن گئی۔ پروانے باغ کی ڈالیوں سے اُڑ اُڑ کر کے منہ آنے لگے۔

میرا لطف دید ختم نہ ہوا تھا کہ جناب اکبر کا شعر کان کی راہ آنکھوں میں سما گیا ؎

زینت مقدمہ ہے مصیبت کا دہر میں
سب شمع کو جلاتے ہیں سانچے میں ڈھال کے

صورت شعر کی حالت اتفاقی شمع کو بھی رُلا گئی۔ آنسو بہا کر بولی دنیا کی زینت چاہنے والے میرے جلاپے کی مصیبت کو دیکھیں۔ قدرِ عنا زیبائش کے ہاتھوں مٹا جاتا ہے نہ ظاہری ٹیپ ٹاپ ہوتی نہ یہ وقت پیش آتا۔

تغیر فطرت کا سبب

فطرت ہر وقت تبدیلی و تغیر میں مصروف رہتی ہے۔ انسان کے ذرات جسم و حواس کو دیکھو وہ بھی سکنڈ سکنڈ میں بدلتے رہتے ہیں۔ پوچھا اس کا سبب ہُد ہُد نے جواب دیا ہستی مطلق کے گوش تک رسائی پانے کے لئے رنگا رنگ طریقے بدلے جاتے ہیں۔ مگر وہاں ایسے پُر حجاب پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اس طرح پہنچ نہیں ہوتی۔ بقول اکبر ؎

نہیں باقی نہیں باقی رسائی گوشِ جاناں تک
بدلتی ہے طریقہ سو طرح میری خبر اپنا

دنیا میں دُکھ سکھ کی تبدیلیاں بھی اسی اصول کی ماتحت ہیں۔ جو ان تغیرات سے دل برداشتہ نہیں ہوتے۔ اور عبادت رب میں مصروف رہتے ہیں۔ انکی خبر گوشِ جاناں تک بلا تردد پہنچ جاتی ہے۔

جرمنی کا فلسفۂ کائنات

ڈاکٹر ہیگل جرمنی کا مشہور فلاسفر ہے۔ جس کی فلاسفی جرمنی درسگاہوں میں رائج ہے۔ اہل جرمن اس کو افلاطون سے بڑھ کر سمجھتے ہیں۔ اور بقول ڈاکٹر اقبال باعتبار تخیل کے ہیگل افلاطون سے یقیناً بڑا ہے۔

ہیگل موجودات عالم کی ہستی محدود کی زندگانی اصول متناقض پر منحصر بتاتا ہے اور

کہتا ہے کہ کائنات کے تمام محدود وجود آپس میں کٹتے مرتے اور ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوتے ہوئے ایک دن ہستی مطلق میں مل جاتے ہیں۔ جب تک ہستی میں ترکیب متناقص موجود ہے کش مکش لازمی ہے۔

اہل جرمنی ہیگل کے اس فلسفہ پر ناز کرتے ہیں۔ جو ضخیم کتابوں میں قلمبند کیا گیا ہے۔ مگر ہندوستان میں اس کو بچہ بچہ جانتا ہے۔ ذوق مرحوم نے ایک شعر میں اسی کے قریب ایک مضمون لکھا تھا کہ اس جہان کو اختلاف سے زیب ہے۔ مگر حضرت اکبر الٰہ آبادی نے تو ہیگل کے سارے سمندر کو اس طرح اس شعر میں بند کیا ہے جیسے انگریزی بیڑے نے جرمنی بیڑے کو ہر کیل میں کیل رکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

جرمن والوں کو معلوم ہو کہ ہند میں ہمارا فلسفہ مفتوح ہو چکا ہے تو ان کی جرمن فتاحی شکست ہو جائے۔ حضرت اکبر کو تو شاید معلوم بھی نہ ہو گا کہ جو شعر ان کے قلم سے بیساختہ نکلتا ہے۔ اُس پر جرمنی کی تمام ساخت پرداخت منحصر ہے۔ انہوں نے اس شعر میں روح و مادہ اور ان کے تمام لوازمات کو کس آسانی سے ادا کر دیا ہے۔

ہندوؤں کے مہابھارت کے وقت سری کرشن جی نے جو فلسفیانہ لکچر ارجن کو سنایا تھا اور جو اب گیتا کے نام سے ہندوؤں کی پوجا پاٹ میں شامل ہے ہیگل کے اس فلسفہ سے کہیں زیادہ لطیف و پر معانی ہے۔

مسلمانوں کے فلسفہ تصوف کو دیکھا جائے تو اس کے جزئیات میں ہیگل کے کلیے بکھرے ہوئے ملیں گے۔ تشبیہ و تنزیہ کے اشارات میں محدود پیکروں کو وجود مطلق کے جلوے علانیہ نظر آ جائیں گے۔

اس میں شک نہیں محدود ہستیوں کی باہمی کش مکش فطرت و نیچر کے حکم سے ہے

جہاں زہر پیدا ہوتا ہے وہیں تریاق بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ گرمی و سردی، خشکی و تری، نیکی و بدی، نور و ظلمت، جڑواں پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ قدرت نے دنیا کو دارالامتحان بنایا ہے۔ جہاں سلیم الفطرت انسانوں کو آزمائش کے بعد منتخب کیا جاتا ہے۔ پس ہستی مطلق کے دربار میں مقبولیت ان ہی کی ہے۔ جو نیچر کی مقررہ حد توازن سے آگے نہیں بڑھتے۔ اور اس توازن کو تقدیر الٰہی سمجھ کر مصائب پر صبر اور تعیش پر شکر کرتے ہیں ان کا قدم ظلم و زیادتی کی جانب جنبش نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ ہستی مطلق کے آداب و سامان کا عرفان رکھتے ہیں۔

آرام کہاں ہے؟

نئی روشنی اور پرانی روشنی بحث کر رہی ہے کہ انسان کی آسایش و راحت خودی میں ہے یا بیخودی میں؟ ایک فریق کہتا ہے۔ خودی مٹانے کا عقیدہ عیش زندگانی کا دشمن ہے۔ دوسرا بیان کرتا ہے زندگی حقیقی کامرانی خودی میں میسر نہیں آسکتی۔

یہ کیسی مشکل بات ہے یہ لوگ تو آپس میں علم کے ہتھیاروں سے لڑتے ہیں اور بے علم جینے کے مزے کو ترستے ہیں۔ ان کے لئے حضرت اکبر الٰہ آبادی نے کیا خوب مثال ارشاد فرمائی کہ نیند دن بھر کی محنت کے ذریعہ آرام ہے۔ مگر اس آرام میں آدمی کی خودی باقی نہیں رہتی۔ جب بیخود ہوتا ہے تو آرام پاتا ہے۔

روح واجل کے دامن

موت و حیات دیکھنے اور لکھنے میں دو اور حقیقت میں ایک ذات ہیں۔ کیونکہ ذات واحد کی فرستادہ ہیں۔ جو لوگ موت سے ڈرتے ہیں۔ اور حیات پر مرتے ہیں

اُن پر جھپٹ مارتی اور حیات اُن سے دامن بچاتی ہے۔ اور جن کو خدا سے سروکار ہے جو خالق لیل و نہار ہے۔ ان کے لئے اجل کے دامنوں میں حیات بستر بچھاتی ہے اور جب وقت موعود آتا ہے روحِ رواں بستر اٹھا کر روانہ ہو جاتی ہے۔ اور اجل اپنے خالی دامن کو جھاڑتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو مرنے میں اذیت نہیں ہوتی۔ اور وہ اجل کے ضرر یورش سے محفوظ منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے ۔ اکبر

برباد کیا اجل نے ہم کو کیا یہ کہئے   روحِ رواں نے اپنے دامن کو جھاڑ ڈالا

موج پر کائی نہیں جمتی

بند پانی اور بہتے دریا کی جنس ایک ہے۔ ظاہر ایک ہے۔ باطن ایک ہے مگر آبِ مسدود پر کائی چھا جاتی ہے۔ اور موجِ رواں ہمیشہ سورج سے آنکھ لڑاتی ہے۔

اسی طرح جو آدمی کچھ کام نہیں کرتے تو اُن کی لیاقتیں دل کے دل ہی میں ارمانوں کو مسوس کر مر جاتی ہیں۔ اور جو دین دنیا کے مشاغل میں رواں دواں رہتے ہیں۔ وہ اوجِ فلک پر سورج بن کر چمکتے ہیں۔

میں نہیں ڈوبا

طوفان کشتیوں اور جہازوں کو ڈبوتا ڈبوتا مجھ تک آیا۔ میں ایک بلبلا تھا اور پانی میں تیر رہا تھا۔ اُس نے چاہا مجھ پر حملہ کرے۔ اور وہ کف منہ میں لیکر میری جانب بڑھا۔ مگر میں اطمینان سے اُس کو دیکھتا رہا۔ وہ مجھ تک پہنچا بھی نہ تھا کہ پانی نے میری خودی کی ہوا کو شکست دی۔ ہوا فرار ہوئی۔ اور میں پانی ہو گیا۔ طوفان سر پر آیا تو مجھ کو نہ پایا۔ بہت گھبرایا۔ آخر کسی نے سنایا۔ خودی کے متوالے ڈوبتے ہیں۔

حباب بے خود ہو گیا۔ اب تو اُس کو کہاں پا سکتا ہے۔ دنیا کے رہنے والے اس مثال کو سنکر اپنے حریفوں سے مطمئن ہوئے۔ اور انہوں نے بھی اپنے اندر کی ہوائے نفسانی کو نکالنا شروع کر دیا۔ اُس وقت میں سمجھا کہ میں اخبار کے دریا میں غرق نہیں ہوا۔ لوگوں کو ڈوبنے سے بچایا۔

کچی نیند کی آنکھیں

ان کی عمر جوانی کی تھی۔ یہ بیداری میں خام تھے۔ نیند کی غفلت میں پختگی کے سوا ان کی ہر ادا کچی تھی۔ سوتے میں انہوں نے کیا پی لیا ہے۔ آنکھیں کھل گئی ہیں مگر نشہ سے بند ہوئی جاتی ہیں۔ دیکھنا ڈیلوں کی سفیدی سرخی کیسی نشیلی ہے۔ اور پلکیں کیسی بے قابو ہو ہو کر لڑکھڑا رہی ہیں۔ پتلی کی بے قراری پردہ کے اندر کی چھپی باتوں کو رُک رُک کہنا چاہتی ہے۔ مگر زبان یاری نہیں دیتی۔

ذرا پوچھنا۔ تم کو عورتوں کی تعلیم و بے پردگی کی بھی کچھ خبر ہے۔ ہندوستان میں عورتوں کو آزاد و بیباک بنانے کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔ لیکن کچی نیند کی آنکھیں خود صورت مثال اور زبان حال ہیں۔ مرد مکمل ہو جاتے ہیں۔ گویا نیند پوری ہو جاتی۔ اُس وقت عورتوں کو جگایا جاتا۔ وہ بے چاریاں پہلے ہی کچی ذات ہیں۔ کچی نیند میں اٹھائی جائیں گی۔ تو خود بھی گریں گی۔ دوسروں کو بھی گرائیں گی۔

عالمِ اسباب

یہ دنیا عالمِ اسباب مشہور ہے۔ اس میں ہر چیز دوسری چیز کی ماتحت و محتاج بنائی گئی ہے۔

صرف انسانوں پر نظر کی جائے تو ہر فرد دوسرے کا دست نگر معلوم ہوگا۔ جس طرح ایک مفلس و غریب آدمی دولت مندوں کا محتاج ہے۔ اسی طرح دولت والے غریبوں کی امداد کے ضرورت مند ہیں۔ خواہ کیسا ہی بڑا فاتح خود مختار شہنشاہ ہو۔ اپنے نوکروں اور ماتحتوں کی مدد بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ اور اس کی عزت اور ناموری گمناموں کے عمل پر منحصر ہے۔

اس سلسلۂ ضروریات کی باہم وابستگی اور ایک دوسرے کی احتیاط قدرت کا بہت بڑا راز ہے۔ یہ نہ ہو تو مخلوق میں خالق کی ہمسری و خودی پیدا ہو جائے جب مغرور ہستیاں عالم اسباب کی مجبوریوں سے کمتر ہستیوں کے آگے ہاتھ پھیلاتی ہیں تو خودی و نخوت کے نشے ہرن ہو جاتے ہیں۔

مذہبی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو شرک ناپسند ہے۔ آثار فطرت میں بھی نظر آتا ہے کہ انسان و حیوان شرکت غیر سے گھبراتے ہیں۔ اس واسطے قدرت نے نہایت لطافت و باریکی سے ہر وجود کا سلسلہ دوسرے وجود کے ساتھ اس ترکیب سے ملایا ہے کہ ضروریات کی تکمیل کے بعد ہر ہستی اپنے کام میں آزاد ہو جائے۔ اور شرکت کی تکلیف میں مبتلا نہ رہے۔ پس اگرچہ کائنات میں اشیاء باہم ایک دوسرے کی محتاج ہیں۔ لیکن ادائے حقوق کے بعد ان کو آزادی بھی ملنی لازمی ہے۔

آخری دستخط

میرے مضامین کا پہلا حصہ پورا ہو گیا۔ اور مجھ سے آخری دستخط مانگے جاتے ہیں۔ اور میں یہ سطریں لکھ کر دستخط کرتا ہوں۔

چار برس سے زیادہ کا ذکر ہے۔ میرے مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ ایک جسم معطل تھا۔ اس کے سر پیر نہ تھے۔ آنکھیں کانوں کی جگہ اور کان ناک کے مقام پر۔ اور ناک زبان کے موقعہ پر چسپاں تھی۔ نہ کوئی ترتیب تھی۔ نہ موزوں قرینہ تھا کیونکہ اس مجموعہ کا مرتب کرنے والا میں خود اور چند احباب تھے۔ کچھ ہماری ناقابلیت کچھ مضامین کا ایک وقت میں نہ ملنا۔ اس خرابی کی وجہ سمجھنی چاہیئے۔ دوستوں کو جہاں کوئی کہیں مضمون ملا انہوں نے کاپی نویس کو دیدیا۔ تقدیم تاخیر۔ موزوں۔ غیر موزوں کا خیال نہ کیا۔ اس پر بھی صدہا مضامین رہ گئے۔ اور وہ اخبار و رسایل نہ مل سکے۔ جن میں یہ مضامین شائع ہوئے تھے۔ خود میرے ہاں ایک بوری ایسے اخبارات و رسایل کی غلطی سے ردی میں چلی گئی۔ جن میں میرے مضامین تھے۔ اور ان کو ترتیب مجموعہ کے خیال سے جمع کیا گیا تھا۔

باوجود ایسی بے ترتیبی و بے سلیقگی کے یہ مجموعہ لوگوں نے پسند کیا۔ اور دو برس کے اندر (غالباً) دو ہزار جلدیں فروخت ہو گئیں۔ اور مانگ باقی رہی لیکن اس طلب کا جواب موجود نہ رہا۔

اب وہ وقت تھا کہ اخبار توحید کی غلطی نے ہندوستان میں میرے مضامین کا شوق بڑھا دیا تھا۔ کیونکہ میں نے اخبارات و رسائل میں لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ خلقت کے مضطربانہ اشتیاق کو دیکھکر اخبار توحید کے مالک شیخ محمد احسان الحق قادری میرٹھی

نے توحید کے پرچوں سے میرے مضامین اخذ کئے اور ان کا ایک مجموعہ چھاپ دیا۔ یہ مجموعہ صرف توحیدی مضامین کا تھا۔ تاہم ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اور اس کی ترتیب پبلک کو بہت پسند آئی۔ حقیقت میں انتخاب توحید کی ترتیب تھی بھی ایسی باقاعدہ کہ خواہ مخواہ اچھی معلوم ہوتی تھی۔ اس تجربہ سے بھیا احسان کو جرأت ہوئی اور انہوں نے اُسی وقت سے تمام اخبارات و رسائل سے میرے مضامین جمع کرنے شروع کئے۔ اور ان کی ترتیب سے ابواب مقرر کردئے۔ اسی اثنا میں ملک دکن کے محکمۂ تعلیم نے اسکول کے بچوں کے واسطے میرا پہلا مجموعہ منظور کیا۔ اور اس کی خریداری کی باضابطہ اطلاع مجھ کو دی۔ لیکن میں اس کی تعمیل کیونکر کرسکتا۔ میرے پاس تو ایک کتاب سے زیادہ دوسری نہ تھی۔

یہ معلوم کرکے بھیا احسان نے جلدی مجموعۂ مضامین کا پہلا حصہ مرتب کرکے محمد انوار ہاشمی کے عصرِ جدید پریس میرٹھ میں چھپوا دیا۔ اور ملا محمد الواحدی کے درویش پریس میں اُس کا ٹائیٹل چھپوا کر کتاب پوری کردی۔

اس مجموعہ میں انتخاب توحید اور سابقہ مجموعہ سے اقتباس کیا گیا۔ جو مضامین موجودہ جنگ کے سبب خلافِ مصلحت تھے۔ ان کو حذف کردیا۔ اس کے بعد اخباروں اور رسالوں کے جدید مضامین بھی لئے۔ برادرم شیخ محمد احسان الحق صاحب نے اور عزیز قلبی محمد انوار ہاشمی نے لکھائی۔ چھپائی اور تصحیح میں بہت محنت کی ہے۔ اور محض اخلاص ومحبت کی بنا پر مہینوں کی دردسری اُٹھائی ہے۔ اس کا میں شکریہ تو کیا ادا کروں محبت کے کوچہ میں یہ رسم منع ہے۔ اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہوں۔ اور خدا تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں جس نے مجھ کو ایسے بے غرض مخلص دئے۔

عزیزم ملا محمد الواحدی اڈیٹر رسالۂ نظام المشائخ واخبار خطیب دہلی نے اس مجموعہ پر جو دیباچہ لکھا ہے وہ نئی طرز کا ریویو ہے۔ امید ہے کہ اس دیباچہ کو

دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ میں واحدی صاحب کا بھی احسانمند نہیں ہوں۔ انہوں نے بھی حق تعلق ادا کیا۔

دوسرا دیباچہ ملک کے شہرۂ آفاق انشا پرداز اور اردو ادب کے عملی خدمتگزار جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقی اردو اور افسر ماتحت محکمۂ تعلیمات دکن کا ہے۔ مولانا نے علم دوستی اور اردو زبان کے ذوق سلیم کی بنا پر ان مضامین کی داد دی ہے۔ خدا ان کو داد دیگا کہ انہوں نے ترقی اردو کے مقاصد کو ملحوظ رکھ کر میری حوصلہ افزائی میں مبالغہ کیا ہے۔

برادر طریقت مولوی سید غلام بھیک صاحب فقیر اللہ شاہ نظامی بی اے۔ وکیل انبالہ جو میر نیرنگ کے تخلص سے ادیبوں میں شہرت عام رکھتے ہیں۔ سابقہ مجموعہ پر انہوں نے ایک دیباچہ لکھا تھا۔ وہ بھی بھیا احسان نے اس مجموعہ میں داخل کردیا ہے۔

اپنی رائے

دیباچہ نویسوں نے تو ان مضامین پر رائے زنی کردی۔ اب میں خود اپنی رائے کے دو لفظ لکھ کر آخری دستخط کرتا ہوں۔

دلی میں رہنے والے کا یہ کچھ کمال نہیں ہے کہ اس نے اردو زبان میں اپنے خیالات کو صفائی سے ادا کردیا۔ اس واسطے میں ان مضامین کی زبان پر تعریفی الفاظ لکھنے نہیں چاہتا۔ البتہ اپنے ذہن اور تصور کی ستائش کرتا کرتا ہوں جس نے میرے قلم سے ان تخیلات کو کاغذ پر نمایاں کرادیا۔ اور یہ ستائش خودی کے ذہن اور تصور کی نہیں ہے۔ بلکہ خالق ذہن وتصور کی تعریف ہے۔ وہ نہ ہوتا تو میں بھی نہ ہوتا۔ اور میرا ذہن وتصور بھی نہ ہوتا۔ وہ تھا۔ ہے رہے گا۔ میرا وجود بھی ہوا۔ اور اس نے جذبات کو مجسم کرکے دکھا دیا۔

میں ذکر کرتا ہوں۔ خدا نے مجھے بڑی نعمت دی ہے۔ اور نعمت کا ظاہر کرنا مجھ پر لازم گردانا ہے۔ ان مضامین میں بعض اشارہ وہ ہیں جن کو نہ خود میں سمجھا نہ امید ہے کہ آج کل کوئی سمجھ سکیگا۔ لیکن قلم نے کسی طاقت سے متاثر ہو کر ان کو لکھا ہے۔ لہٰذا وقت آئے گا کہ ان کے سمجھنے والے پیدا ہوں۔ وہ سمجھ بس گے تو میری اپنی اس رائے کی قدر کریں گے۔ اور ان آخری دستخطوں کا مطلب جان جائیں گے۔ جو میں نے خاص اپنی روش تحریر دکھانے کو اپنے قلم سے لکھے ہیں۔

حسن نظامی

آپ بیتی

یہ حضرت خواجہ حسن نظامی کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔

جس میں آپ نے تمام چھوٹے بڑے ظاہر و پوشیدہ حالات زندگی کمال

جرأت و دلیری سے لکھے ہیں۔ وہ حالات بھی ایسے ہیں جنکو

کوئی شخص اپنی زبان سے ظاہر کر دینے کی ہمت نہیں کرسکتا۔

اس کتاب کو پڑھنے سے زندگی کے ایسے تجربے ہوتے ہیں جن سے

ہر شخص کو فائدہ ہو سکتا ہے۔ جو آدمی معمولی حالت سے ترقی کرکے

کسی اونچی حالت پر پہنچنے کا خواہشمند ہو اس کو یہ کتاب پڑھنی

چاہیئے۔ اس میں خواجہ صاحب کی دو تصویریں بھی ہیں قیمت عہ

کارکن حلقہ مشائخ بکڈپو دہلی